سید سلیمان ندوی

حیات اور ادبی کارنامے

ڈاکٹر سید محمد ہاشم

دبستان شبلی کی ایک ممتاز اور نمایاں ترین شخصیت سید سلیمان ندوی کی ہے، وہ مؤرخ بھی تھے اور ناقد بھی، محقق بھی تھے اور شاعر بھی، صحافی بھی تھے اور ماہرِ لسانیات بھی۔

میرے عزیز ڈاکٹر سید محمد ہاشم نے ان کی حیات اور ادبی کارناموں پر مفصل بحث کا عزم کیا۔ اس موضوع پر انھوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور زندگی کے حالات کو تحقیق و تنقید کے معیار پر پرکھا ہے، اس کے بعد سید صاحب کے ادبی کارناموں کے ایک ایک گوشہ کو موضوعِ بحث بنایا اور ان کا مدلل اور عالمانہ تجزیہ کیا ہے، یہ کام مصنف کی دیدہ ریزی اور دقت نظری، سلجھے ہوئے مرتب ذہن، اصابت رائے اور مضبوط قوتِ فیصلہ کے نتیجہ میں نہایت خوبی سے انجام پذیر ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت وقیع، لائق مطالعہ و توجہ اور قابلِ قدر ہے اور اردو کے ادبی سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب سلیمان شناسی میں رہبر و روشن مینار ثابت ہوگی اور مجموعی طور پر اردو ادب میں بھی قدر و منزلت کی بلندیوں سے ہمکنار ہوگی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

باسمہ تعالیٰ

سید سلیمان ندوی

حیات اور ادبی کارنامے

(ڈاکٹر) سید محمد ہاشم

شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت بار اوّل ——— ۱۹۹۵ء

تعداد ——— چار سو

کتابت ——— (حافظ) عتیق احمد

طباعت ———

قیمت ——— ۱۵۰ روپے

ملنے کے پتے:

○ **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ**
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

○ **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ**
اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

○ **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ**
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

○ **ایجوکیشنل بک ہاؤس**
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

LIBRARY

انتساب

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اور

دار المصنّفین اعظم گڑھ

کے نام

جہاں مولانا سیّد سلیمان ندوی کی پرکشش

شخصیت نے تکمیل کی راہیں

طے کیں۔

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ

کے

مالی تعاون سے شائع ہوئی

فہرست

پیش لفظ — پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ۷
حرف آغاز ۹
پس منظر ۱۳

مولانا سید سلیمان ندوی :

حیات، سیرت، و شخصیت

وطن، خاندان اور ابتدائی حالات ۲۸
ولادت اور ابتدائی تعلیم ۴۰

سید صاحب ندوہ میں :

طالب علمی کا دور ۵۶
تکمیل تعلیم کے بعد ۷۶
دار المصنفین اور سید صاحب ۹۷
ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معتمدی ۱۳۳
سلوک و تصوف ۱۵۸
دار المصنفین سے علیحدگی ۱۷۵
سید صاحب پاکستان میں ۱۹۴
خانگی زندگی۔ ۲۱۷

ادبی کارنامے

سید صاحب کی تحقیقی کاوشیں ۲۲۸
سیّد صاحب بحیثیت سوانح نگار ۲۷۵
وفیات نگاری ۳۱۴
صحافت و ادارت ۳۲۵
تنقید و تبصرہ نگاری ۳۵۲
شاعری ۳۶۲
لسانیات ۳۸۳
مکتوب نگاری ۳۹۷
متفرقات ۴۱۲

پیش لفظ

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
سابق صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی

دبستان سرسیّد نے دو نامور فرزندوں کو پیدا کیا، حالی اور شبلی۔ دونوں کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ہے اور ناقد کی حیثیت سے بھی۔ حالی ایک ادبی نقاد تھے تو شبلی اس کے ساتھ ساتھ ادبی مورخ بھی تھے۔ حالی نے اردو تنقید کی خشت اوّل رکھی اسکے باوجود انکی تنقید کا سلسلہ مولوی عبدالحق پر آکر رُک سا جاتا ہے جبکہ شبلی کی تنقید کا سلسلہ آج بھی اسی طرح جاری ہے دبستان شبلی کی ایک ممتاز اور نمایاں ترین شخصیت سیّد سلیمان ندوی کی ہے۔ تاریخ اسلام پر انکی جتنی گہری نظر تھی وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ وہ مورخ بھی تھے اور ناقد بھی محقق بھی تھے اور شاعر بھی صحافی بھی تھے اور ماہر لسانیات بھی۔ ان کی ذات دبستان شبلی کی کامیاب نمائندہ تھی۔ انہوں نے مشرقی تنقید میں ایک نئی راہ کی نشاندہی کی اور مغربی تنقید سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی۔ ان کی تصانیف اور گرانمایہ علمی و ادبی مقالات کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اس سے تشنگی کا احساس اور زیادہ ہی ہوا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے عزیز ڈاکٹر سیّد محمد ہاشم نے اس میدان میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ ہاشم صاحب کو سیّد صاحب سے جو عقیدت و محبت ہے اس نے ان کو مجبور کیا کہ اس ذمہ داری کو قبول کریں اور سید صاحب کی حیات اور ادبی کارناموں پر مفصل بحث کریں۔ انہوں نے بہت گہرائی سے اس موضوع پر مطالعہ کیا اور زندگی کے حالات کو تحقیق و تنقید کے معیار پر پرکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ روایات سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی میزان پر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ بظاہر یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے مگر جب تحقیق کے اس میدان میں داخل ہوتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ راستہ کس قدر

پُرخار ہے۔ یہاں عقیدت بھی تاریخ کے حوالے سے سند کا مطالبہ کرتی ہے، ڈاکٹر ہاشم اس راستے سے پوری سلامتی سے نکل آئے ہیں اور انہوں نے تاریخ و تحقیق کا سودا عقیدت سے نہیں کیا ہے۔ اسی لئے بعض جگہ استخراج نتائج میں متین و شریفانہ لب و لہجہ اور کمال شائستگی کے باوجود دو ٹوک اور بے خوف انداز اختیار کیا گیا، کہ آبلہ پائی کی داستان تلخ ہی ہوا کرتی ہے۔

حالات و واقعات زندگی کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر ہاشم نے سیّد صاحب کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ حالانکہ سیّد صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کے سرحدوں کو الگ الگ کرنا بجائے خود بہت مشکل کام تھا۔ اس کی نشاندہی میں بہت لیاقت تمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے بعد سیّد صاحب کے ادبی کارناموں کے ایک ایک گوشہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور مصنف نے اپنے تجزیاتی انداز سے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔

یہ پورا کام مصنف کی دیدہ ریزی اور دقت نظری، سلجھے ہوئے مرتب ذہن، اصابت رائے اور مضبوط قوت فیصلہ کے نتیجہ میں نہایت خوبی سے انجام پذیر ہوا ہے۔ تجزیہ کا کام آسان نہیں ہے۔ ہاشم صاحب نے اقتباسات سے دلائل دے کر سیّد صاحب کے کارناموں کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ اسلوب کی روانی، پختگی اور قوت اعتماد بہت سے فیصلہ کن مرحلوں میں بھی مصنف کی ہم نوائی پر مجبور کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کے انکسار کے باوجود یہ کام بہت وقیع، لائق مطالعہ و توجہ اور قابل قدر ہے اور اردو کے ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب سلیمان شناسی میں بھی رہبر روشن مینار ثابت ہوگی اور مجموعی طور پر اردو ادب میں قدر و منزلت کی بلندیوں سے ہمکنار ہوگی۔

(پروفیسر) **ظہیر احمد صدیقی**
بدر باغ —— سول لائنس —— علی گڑھ

حرفِ آغاز

جدید اردو ادب ارتقاد کے جن مدارج سے گزر کر عہد حاضر تک پہنچا ہے ان میں سرسید اور شبلی کے کارنامے سب سے زیادہ وقیع اور لائق تقلید رہے۔ ادبی اعتبار سے دبستان سرسید مولانا حالی کے توسط سے چمکا اور کاروان شبلی کے پیشرو مولانا سیّد سُلیمان ندوی قرار پائے۔ اگرچہ ان دونوں حضرات کا دائرۂ عمل نسبتہً مختلف تھا تاہم ان کارواں سالاروں کی خدمات جلیلہ بے مِثال اور لازوال حیثیت رکھتی ہیں۔

دبستان سرسیّد کے دانشوروں پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھنے کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا اور ذاتی حیثیت میں علامہ شبلی پر بھی کام ہوا لیکن اس دبستان کے دیگر مشاہیر پر بہت دیر میں توجہ کی گئی۔ گزشتہ پندرہ سال میں البتہ اس سے متعلق متعدد موضوعات پر کام شروع اور مکمّل ہوئے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سِلسلہ کی ایک ابتدائی کڑی ہے۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی نے "سیّد سیّد سُلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے راقم الحروف کا انتخاب کیا اور شعبہ کے لائق و فائق استاد ڈاکٹر نادر علی خاں صاحب کی نِگرانی میں ۱۹۸۲ء میں یہ مقالہ مرتب و مکمل ہوا اور اسی سال یونیورسٹی نے اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی کی عِلمی و عَملی شخصیت کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اور ان کے علمی، مذہبی و ادبی کارناموں کا جائزہ لینا آسان کام نہیں تھا، وہ دارالعلوم ندوۃُ العُلماء کے کوہِ نور پیکر کی حیثیت رکھتے ہیں، علامہ شبلی کے ندوہ آنے سے قبل یہاں وہ اپنے عہد کے فقید المثال علماء اور بزرگوں کے زیر تربیت رہ چکے تھے

علامہ موصوف کے لمس اور ندوہ کے پُر بہار ماحول میں اس ہیرے میں تراشِ خراش ہوتی رہی اور دارالمصنّفین کے قیام نے اس پر مہر سند ثبت کردی۔ اس کے بعد کے تمام حالات میں اس عہد تک کی تربیت و شخصیت کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے، سیّد صاحب کی مجتہدانہ صلاحیت اس پر مستزاد ہے، مولانا عبدُ الماجد دریابادی، علاّمہ اقبال، مولانا عبدُ اللہ عمادی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے نہایت قریبی تعلقات سیّد صاحب کی فکری جہتوں کو روشن کرنے میں معاون و مددگار ہوئے ہیں۔ ندوہ میں سیّد صاحب کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت عربی اسکالر کی حیثیت سے بھی ہوئی تھی چنانچہ وہ عربی کے بلند پایہ ادیب، مقرر اور شاعر و صحافی تھے لیکن ان کا اردو پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں اپنا رُخ اردو کی طرف موڑ لیا اور اس زبان کے علمی و ادبی سرمایے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

> " دروس الادب، حیات امام مالکؒ، خواتینِ اسلام کی بہادری، لغات جدیدہ، ارض القرآن، رسالہ اہلِ سُنّت و الجماعۃ، سیرتِ عائشہؓ، برید فرنگ، خلافت اور ہندوستان، خلافت عثمانیہ اور دُنیائے اسلام، سیرۃ النبی جلد اوّل و دوم (بنام شبلی) اور جلد سوم، چہارم، پنجم، ششم اور (نامکمل) ہفتم، خطبات مدارس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیّام، سیر افغانستان، رحمتِ عالمؐ، نقوشِ سُلیمانی اور حیاتِ شبلی۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً تین سو اعلیٰ درجہ کے علمی، تاریخی، تحقیقی و تنقیدی مقالات و خطبات۔ وفیات، معارف کے ۳۵۴ شماروں میں حالاتِ حاضرہ اور ادارتی موضوعات پر شذرات جن کے صفحات کی تعداد ۲۱۴۹ ہے وغیرہ وغیرہ۔"

ظاہر ہے علم کے اس دریائے کبیر کی غواصی نہایت مشکل کام ہے، صرف ادبی پہلوؤں اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ بھی سخت دیدہ ریزی اور دقّت نظری کا متقاضی

تھا اور کسی ایک کتاب میں اس کی سمائی دشوار نظر آرہی تھی، اس لئے کام کو مزید سمیٹا گیا، نتائج مطالعہ کا خاصا بڑا سرمایہ جو مقالہ داخل کرتے وقت اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا، کتاب کی ضخامت کے پیش نظر اور بعض دیگر وجوہ سے بھی اس کو طباعت کے وقت بھی آئندہ کسی موقع کے لئے چھوڑا جا رہا ہے۔

اس کتاب کی طباعت کے لئے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ نے مالی امداد منظور کی ہے اور یہ منظوری مقالہ ہی کے ٹائپ شدہ مسودہ پر غور کرنے کے بعد عطا کی گئی ہے اس لئے یہ مناسب نہیں تھا کہ فکری اعتبار سے اس کتاب میں کوئی اہم تبدیلی کر دی جائے۔ لہٰذا نظر ثانی کے وقت زبان و اسلوب میں محض چند مقامات پر جزوی اصلاح و ترمیم روا رکھی گئی ہے۔

اس دوران علامہ سید سلیمان ندوی پر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کا فاضلانہ تحقیقی مقالہ بھی طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اور انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے زیرِ اہتمام ہونے والے سیمناروں کی روداد اور مقالات کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ "تذکرۂ سلیمان" مرتبہ غلام محمد اور "حیاتِ سلیمان" مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی مذکورہ سبھی کاموں سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، اور بلا استثنا مذکورہ تمام کتابوں میں ان سے استفادہ کیا گیا ہے، اور بعد کی ہر کتاب بھی اپنے طور پر اہم اور وقیع ہے اُمید ہے زیرِ نظر کتاب کی شکل میں یہ ناچیز کوشش بھی علامہ سید سلیمان ندوی کی ہمہ جہت شخصیت اور ادبی کارناموں کے کچھ گوشوں کو منوّر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا مقالہ ہٰذا کا ہر باب اور ہر گوشہ استاد محترم ڈاکٹر نادر علی خاں صاحب کی شفقتوں اور توجہات عالیہ کا مظہر ہے، اور جواں عمری میں تحقیقی مقالہ میں مسلسل تین سال تک محنت شاقہ کے نتیجہ میں فکر کی جو نہج اور تحریر کا جو اسلوب متعین ہوتا ہے، اس سے غالباً تحریری زندگی میں بہت زیادہ دور ہو جانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا استاد مکرم کا احسان دائمی اور لازوال ہے جہاں شکریہ

کے ظاہری الفاظ خلا میں معلق نظر آتے ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میرے ممتحن بھی تھے۔ اس موقع پر ان کے حوصلہ افزا کلمات میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے ہیں اس لئے ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔ استاد محترم پروفیسر نعیم احمد صاحب صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کو جب نظر ثانی اور کتابت کی تصحیح وغیرہ میں میری مصروفیت کا علم ہوا تو موصوف نے مجھ پر سے کاموں کا بوجھ کافی کم کر دیا اور وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے، میں انکا ممنون کرم ہوں۔ برادر معظم پروفیسر سیّد محمد طارق نے بھی وقت ضرورت میری دشواریاں دور کرنے میں مدد فرمائی، ان کے لئے صحت وسلامتی کی دعا کرتا ہوں۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے گراں قدر مالی امداد منظور فرمائی اور طویل عرصے سے تعویق پڑی ہوئی اس کتاب کی طباعت واشاعت کی دشواریوں کو دور کر کے مجھے بہت سہولت عطا کر دی۔ اس کے لئے مذکورہ کمیٹی کا اور بالخصوص اس کے صدر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا علیحدہ سے بھی شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ جن حضرات نے جس جس مرحلہ پر اور جس جس طرح اس کتاب کی تکمیل واشاعت میں مدد کی، میں ان سبھی کا ممنون کرم ہوں۔

سیّد محمّد ہاشم
(ریڈر)
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علی گڑھ
۲؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء

پس منظر

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ عرب اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کا آغاز محمود غزنوی کے زمانے سے نہیں بلکہ طلوعِ اسلام سے بھی ایک صدی قبل ہو چکا تھا۔ سواحلِ ہند پر عرب تاجروں کی مستقل آمد و رفت نے تجارتی سطح پر ان تعلقات کو خاصا مضبوط کر دیا تھا۔ اسلام کے عروج کے وقت سے یہاں مسلمان تاجروں کے علاوہ عام مسلمانوں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی اور کالی کٹ کے نزدیک مسلمانوں کی چند بستیاں آباد ہو گئی تھیں جن کے ساتھ یہاں کے غیر مسلم حکمراں بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے اور اپنی مسلم رعایا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۲ء) سے ان سیاسی و لسانی تعلقات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی رجحانات کو بھی فروغ ہوا۔ سبکتگین (۹۹۰ء) اور محمود غزنوی کے عہد (۱۰۰۱ء - ۱۰۲۷ء) میں مسلمان علماء بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور تبلیغ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء) کے وقت سے انگریزوں کے تسلط تک ہندوستان کے بڑے حصہ پر مسلمان حکمراں رہے۔

اس پورے عرصہ میں مسلمان علماء اور مشائخ ملک کے چپے چپے میں پھیل کر اسلام کی تبلیغ و فروغ میں منہمک رہے۔ بعد میں ہر قصبہ اور ہر شہر میں مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں کے قیام نے اس کو استحکام عطا کیا اور اس طرح رشد و ہدایت کے چراغ سے چراغ جلا کر اس مذہب نے ہندوستان گیر حیثیت حاصل کر لی۔ علماء اور مشائخ کبار وقت کی ضرورتوں سے غافل نہیں رہتے تھے اس لئے وقتاً فوقتاً اجتہادی اور تجدیدی کارنامے بھی

ظہور پذیر ہوتے رہے تاکہ اسلام کسی بھی زمانے اور کسی بھی سرزمین میں زیادہ دنوں تک اجنبی نہ بنا رہے چنانچہ شیخ مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ[1]، شاہ رفیع الدینؒ[2] شاہ اسمٰعیل شہیدؒ[3] اور ان کے اخلاف و تلامذہ نے زمانہ کے چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے اسلامی احکامات و روایات کی موزوں ڈھنگ سے تعبیر و تشریح پیش کی۔ دینی علوم کے فروغ کے لئے دینی مدارس کا قیام، ان کا مخصوص نصاب اور وقتِ ضرورت اس نصاب میں مناسب حال تبدیلی اسلامی نظام کے استحکام میں ہمیشہ معین و مددگار رہی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالعزیزؒ[4]، سید احمد شہیدؒ[5] اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے قرآن کریم کے فارسی اور اردو ترجمہ، صحاح ستہ کی تعلیم، تبلیغ دین اور بعض علوم اسلامی کو اردو زبان میں منتقل کر کے اس کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان حضرات کی جدوجہد کے مراکز دہلی اور لکھنؤ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس شمع کی قندیلیں ملک کے ہر صوبہ اور ہر علاقہ پر ضوفشانی کرتی رہیں۔ ان حضرات کے تلامذہ میں سے ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ[6] کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ عربی مدارس میں جو نصاب "درس نظامی" پڑھایا جاتا ہے وہ انھیں کے نام سے منسوب ہے۔ اس نصاب میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب، کلام، اخلاق و معاملات فقہ اور حدیث و تفسیر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اس نصاب کے اول الذکر حصوں میں بھی وقتاً فوقتاً تغیر و تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے اور اس کے لئے آوازیں بھی بلند ہوتی رہیں لیکن اس کی جامعیت پر اصرار کرتے ہوئے باستثنائے چند، ہندوستان کے تمام عربی مدارس آج تک اس کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اس کی مؤید و مقلد چند درسگاہیں[7] اس نصاب میں تبدیلی کر کے

---

[1] المتوفی ۱۱۷۶ھ

[2] م ۱۲۴۳ھ

[3] م ۱۲۵۵ھ

[4] م ۱۲۴۹ھ

[5] م ۱۲۳۹ھ

[6] م ۱۱۶۱ھ

[7] مدرسہ احمدیہ آرہ بہار، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ اور تاج المساجد بھوپال وغیرہ۔

قدیم منطق وفلسفہ کی جگہ بعض علوم جدیدہ علم کلام اور انگریزی داخل کرنے پر عمل پیرا ہیں اور یہ تبدیلی زمانہ کی ضرورت کے پیش نظر ایک تحریک کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی، اس تحریک کا نام "مجلس ندوۃ العلماء" تھا۔

ہندوستان میں انگریز خالص تجارتی مقصد سے آئے تھے۔ ان سے پہلے یہاں کی درآمدی وبرآمدی تجارت بھی عرب مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، کچھ دن کے بعد تجارت میں سیاست اور بعد میں مذہبی تبلیغ بھی داخل ہوگئی اور بالآخر پرتگالیوں کی مدد سے وہ ہندوستان میں عرب تجارت کی بیخ کنی میں کامیاب ہوگئے۔ اس مسئلہ کا جذباتی علاج انھیں بھی یہ نظر آیا کہ مسلمانوں کے تاریک پہلو دکھا کر اور مسلم حکمرانوں کے افعال کو زیادہ سے زیادہ بدنما اور قبیح بنا کر پیش کیا جائے اور اپنے مشن کی تبلیغ واشاعت کا فرض بھی ادا کیا جائے۔ ان مشنریز نے ابتداءً بنگال میں اپنا سکہ جمایا پھر وہ اپنی حدود کو وسیع تر کرتے چلے گئے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب ایک ایسا وقت آگیا کہ انھیں یہاں حکومت کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے اور اس کے لئے سیاسی، ادبی ولسانی سطح پر انھوں نے جو محنتیں کیں وہ مخفی نہیں لیکن ان کے مذہبی اداروں نے اس سلسلے میں غیر معمولی جدوجہد کی۔ ان مشنریز کا یہ خیال تھا کہ اگر یہاں ان کی حکومت قائم ہوگئی تو وہ پورے ہندوستان کو عیسائی بنا سکیں گے۔[1]

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کے ختم تک خصوصاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں متعدد اعلیٰ درجہ کے مستشرق پیدا ہوئے جن کا خاص مقصد یہ تھا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کر کے اسے ایک مخصوص زاویہ سے دیکھا اور پرکھا جائے اور عقائد سے متعلق مافوق عادت باتوں کو توہم پرستی کا نام دیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرے بظاہر کمزور پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ روشنی میں لاکر اسلام کا بدنما خاکہ پیش کیا جائے جو نہ صرف غیر مسلموں کے لئے ہی پرکشش ہو بلکہ احادیث وروایات کے حوالوں کے اندراج کی وجہ سے ناواقف مسلم عوام

---

[1] انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جان لارنس اور ہربرٹ نے یہ خیال ظاہر بھی کیا تھا کہ قدرت نے انھیں ہندوستان کا حکمراں اس لئے بنایا ہے کہ پورے ہندوستان کو عیسائی بنالیا جائے۔
(بحوالہ سرسید سیاسی وتاریخی آئینہ میں۔ از شان محمد ص ۱۵)

وخواص پر بھی اپنا غیر محسوس مگر بھرپور اثر چھوڑ سکے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام کی شخصیت پر بھی دل آزار حملوں کا سلسلہ جاری تھا، ان مقاصد کے حصول کے لئے مناظرہ کے بجائے علمی انداز اختیار کیا گیا اور انگلستان و فرانس کے متعدد رسائل وجرائد میں مختلف انداز سے مضامین لکھے گئے، باقاعدہ کتابیں تصنیف کی گئیں، کہانیاں اور ڈرامے تخلیق کئے گئے۔ مضمون میں کسی ایک پہلو پر اظہار خیال کیا جاتا، کتاب مستقل موضوع پر ہوتی یا متعدد نکات پیش کرنے کا آلہ تھی اور کہانیوں اور ڈراموں میں مسلم کرداروں سے حسب منشاء کام لے کر اسلامی نظریات کو مضحک انداز میں پیش کیا جاتا۔ چنانچہ یہ حربہ کارگر ہوا اور بتدریج اندر اندر یہ چیز سرایت کرتی گئی، مسلم عوام تو اس سے بے خبر تھے ہی علماء بھی اس منصوبے کو اس وقت پوری طرح نہ سمجھ سکے اور احساس ایسے وقت ہوا جب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان مایوسی اور پریشانی کا شکار ہو چکے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد سرسید اپنے بیٹے سید محمود کا انگلستان میں داخلہ کرانے کے لئے گئے، اس سے فارغ ہو کر وہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور دیگر کتب خانوں میں ضروری کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گئے تاکہ ان کے حملوں کا مناسب جواب دے سکیں۔ مستشرقین کی کتابوں میں موصوف نے ایسا مواد پایا جس سے متضاد اور گمراہ کن نتائج نکالنا آسان تھا، ولیم میور نے اسی بنیاد پر "لائف آف محمد" میں گمراہ کن، ناقص اور تضادات سے معمور جو بیانات دیئے تھے سرسید نے انہی کتابوں سے اصل حقیقت کا پردہ اٹھایا اور ولیم میور کی کتاب کا مدلل جواب لکھ کر اسے انگریزی میں شائع کیا۔ یہی کتاب بعد میں کچھ اضافوں کے ساتھ اردو میں "خطبات احمدیہ" کے نام سے شائع کی۔

سرسید کے اجتہادات میں اس واقعہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہندوستانی مسلمانوں میں مذہب کی طرف سے بیداری کی جدید تحریک[1] (نشاۃ الثانیہ) کا آغاز بھی

---

[1] اس سے پہلے آریہ سماج جیسی تنظیمیں اسلام کے خلاف برسرپیکار تھیں جن کے جواب کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد سے ۱۸۲۰ء تک زبردست قسم کے علماء نظر آتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد آریہ سماجوں کا یہ حربہ بیکار ہو گیا البتہ عیسائی فاضلوں کے اعتراضات کے جواب کے لئے پہلے سے زیادہ مضبوط اور کارگر ہو گئی۔

یہیں سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سر سید نے مسلمانوں کی مذہبی، علمی اور سیاسی اصلاح و ترقی کی غرض سے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ چھ سات اعلیٰ افراد پر مشتمل اپنا ایک حلقہ بنایا جو علمی اعتبار سے بلند پایہ کا حامل تھا، مذہب پر پوری دستگاہ اور اس کا شدید درد رکھتا تھا۔ ہر طرح کے عصری حالات اور اس کے امکانات و نقائص و نتائج سے باخبر تھا اور ان حضرات نے زبان و اسلوب کی پختگی کے ساتھ اپنے مخصوص صنفی میدانوں میں تحریر کی جولانیاں دکھائیں۔

چنانچہ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، نذیر احمد، حالی، شبلی اور ذکاء اللہ وغیرہ نے مذہب، تاریخ، تحقیق، ادب، شاعری، تنقید، ناول، مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری وغیرہ کا ایک بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا جس نے آئندہ نسلوں کی رہنمائی کی۔

مولانا شبلی اسی خرمن کے گلِ سر سبد تھے جنھوں نے عصری فتنوں کے مقابلے کے لئے سینہ سپر ہو کر مذہب کو اولاً اور ادب کو ثانیاً اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا مرکز بنایا۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سفرنامہ مصر و شام، علم الکلام، الکلام اور سیرۃ النبی جیسی تصانیف اسی مقصد کے تحت وجود میں آئیں۔

شبلی نے مستشرقین سے مقابلہ کرنے اور جدید تعلیم کے بادِ سموم سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے اس خیال پر اصرار کیا کہ عربی مدارس کے نصاب میں جدید علوم اور انگریزی زبان کو لازمی حیثیت سے داخل کیا جائے تاکہ علما نئی تحریکات و تصنیفات سے نہ صرف واقف ہو جائیں بلکہ اس طرح تیار رہوں کہ مذہب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ ہر زمانہ میں مستشرقین اور دوسرے نئے فتنوں کا دندان شکن جواب بھی دے سکیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان فتنوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور مستشرقین کے اندازِ تحقیق کو بے نقاب کرتے ہوئے اس باب میں علامہ شبلی کی حقیقت شناسی، غیرت ایمانی اور جراتِ رندانہ کا یوں تذکرہ کیا ہے:

> "(ڈاکٹر اسپرنگر، سر ولیم میور، جے اے مولر، ڈاکٹر ڈوزی، وان کریمر، برتھالمی، نولڈیکی، ولہاوسن، گولڈزیہر، رینان، مارگولیتھ، جرجی زیدان وغیرہ) یہ سبھی لوگ مغربی نہ تھے اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے بلکہ ان کا شمار یورپ کے فضلا میں تھا۔ یہ اپنے اغراض فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھا لیا کرتے تھے اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھود کھود کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے اور اس کے لئے پیچ

> یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش اور جستجو کرتے تھے محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد ڈالتے اور اب بھی وہ اپنے کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں"[1]

ایک طرف تو مخالفینِ اسلام کی یہ کوششیں اور اپنے مقصد کے لئے مذہب اسلام کے مطالعے میں عرق ریزی کی یہ مثالیں موجود ہیں لیکن دوسری طرف سرسید کے مذکورہ حلقہ کے علاوہ بیشتر مدارس دینیہ کے فضلاء بین الاقوامی سطح پر ہونے والے اس منصوبے سے بے خبر و بے نیاز اور وقت کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے محض اسلام کے اندرونی فرقوں کی اصلاح کے لئے مناظرانہ انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔ مختلف فرقوں اور مسلکوں کے درمیان اس باہمی کشمکش کے دو بڑے نقصانات ہو رہے تھے اوّل یہ کہ اپنے مسلک کے تحفظ کے نام پر مسلمان آئے دن متصادم رہتے تھے۔ دوم یہ کہ اندرونی خلفشار کے سبب تعلیم یافتہ طبقہ میں جو دینی بے خبری موجود تھی اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو رہی تھی بلکہ نئی روشنی انھیں مزید اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سرسید کی مذکورہ تحریک اس اندازِ نظر کو بدلنے میں معاون ثابت ہوئی اور تہذیب الاخلاق کے مضامین نے اس جمود و تعطل پر کاری ضرب لگائی، یہی زمانہ تھا جب اسلام پر آریوں اور مشنریوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کے دفاع اور مذہب کی بقاء و تحفظ و اشاعت کی غرض سے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں آریوں کے سلسلے میں بہت مفید کام ہوئے۔ البتہ مشنریوں کا جواب ہنوز تشنہ تھا اس ضرورت نے دفاعی تحریک کو جاری رکھا اور سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ شکنی کی جائے۔ نیز یہ کہ متفق علیہ مسائل پر اور قومی معاملات میں یہ سبھی مختلف لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکیں اور جدید و مغربی علوم سے واقف حضرات سے رابطہ قائم کیا جائے تاکہ مغرب کی باطل قوتیں ان حضرات کی علمی تلواروں کے سامنے سرنگوں ہو سکیں، یہ کوشش کامیاب ہوئی اور ایک موقع ایسا آگیا کہ اس تحریک میں شدید حرارت پیدا ہو گئی۔

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۲۵

مدرسہ فیضِ عام کانپور[1] کے سالانہ جلسۂ دستار بندی و تقسیم اسناد (۱۸۹۲ء) میں اتفاق سے ملک بھر کے چوٹی کے علماء شریک تھے ان کے درمیان موجودہ صورتِ حال پر بڑی سنجیدگی سے گفتگو ہوئی اور یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال مدرسہ فیضِ عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علماء کو اس کے لئے عام دعوت دی جائے، اس مجلس کا نام "مجلس ندوۃ العلماء" قرار پایا مولانا سید محمد علی اس نئی مجلس کے ناظم منتخب و مقرر ہوئے اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعے سے آئندہ جلسہ کا اعلان کردیا گیا۔ یہ اعلان وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھا گیا اور ہر طرف سے اس کا خیر مقدم ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> "عام ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، علماء ہر طرف سے آ آ کر شریک ہونے لگے۔ اس صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں ایک نام اس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم و شام و مصر کے مدرسوں کو ایک اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا

---

[1] کانپور کا مدرسہ فیضِ عام انیسویں صدی کے نصف آخر میں عربی کا سب سے بڑا مدرسہ تھا جو انقلاب کے دو سال بعد ۱۸۵۹ء میں مولوی مفتی عنایت احمد اور مولوی مفتی لطف اللہ علی گڑھی نے قائم کیا تھا۔ بیسویں صدی کے طلوع کے وقت ہندوستان کے مایہ ناز علماء کی سب سے بڑی تعداد اسی مدرسہ کی فیض یافتہ تھی۔ ابتداءً دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مسندِ تدریس پر متمکن ہونے والے بیشتر حضرات اسی دریا کے غواص تھے جن کے ناموں کی طویل فہرست، حیاتِ شبلی میں درج ہے۔ صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ اسی مدرسہ کا فیضِ عام تھا جو بعد میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مدرسہ خود اب صرف ایک انٹر کالج ہے۔

> تھا[1] اور اس کے دل میں رہ رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بے خبری کا درد تھا، جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا،
>
> (حیاتِ شبلی ص ۲۷)

۲۲-۲۳-۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیضِ عام کا مجوزہ اجلاس ہوا اس میں تمام ہندوستان کے علماء شریک تھے اور بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (جو اس بزم میں شریک بھی تھے) "یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا۔ ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علماء شریکِ جلسہ تھے۔ علماءِ حنفی کے علاوہ اہلِ حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علما بلا تخصیص فرقہ صدر نشیں (مولانا لطف اللہ علی گڑھی) کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے۔ کرسئ صدارت حضرت[2] کے جمال و کمال دونوں پر نازاں

---

[1] مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا تھا۔ واپسی میں وہ مصر و شام وغیرہ بھی گئے تھے اور وہاں کے عربی مدارس کا معائنہ کیا تھا۔ مصر کے مدارسِ اسلامیہ خصوصاً جامعہ ازہر کے نصابِ تعلیم کو زمانہ کی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہ پاکر اس پر انھوں نے اظہار افسوس کیا تھا اور جدید نصاب کے متعلق بعض تجاویز پیش کر کے اربابِ ازہر کو اس طرف توجہ دلائی تھی، جو اس وقت تو نہیں لیکن کئی سال کے بعد علامہ رشید رضا مصری ایڈیٹر ماہنامہ المنار کی کوششوں سے عملی شکل اختیار کر سکیں۔

جب ندوہ کا یہ اعلان سنا تو مولانا شبلی کو اس میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی اور موصوف نے اس میں بیش از بیش حصہ لیا۔

[2] مولانا لطف اللہ علی گڑھی فیضِ عام میں حدیث و تفسیر کے استاد تھے، وہاں سات سال رہے۔ پھر علی گڑھ آکر ایک پرانے عربی مدرسہ میں اپنی محنت سے نئی روح پھونکی اور بیسیوں معاصر علماء کو اپنے فیضِ تربیت سے نوازا۔ اپنے زمانے کے اتنے مشہور و مقبول عالم و فاضل تھے کہ ہر فرقہ و مسلک کے لوگ ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

تھی[1]"

اس اجلاس کی دوسری نشست میں مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا جس میں عربی مدارس کی اصلاح کو کلیدی حیثیت دی گئی تھی۔ اصلاحِ نصاب کی تجویز منظور ہونے کے بعد ترتیبِ نصاب کے لئے بارہ علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ سبھی ممبران نے اپنی رائے کے مطابق جدید نصاب کے متعلق کتابچے اور رسالے لکھے مولانا شبلی نے ان سب سے قطع نظر ایک نئے دار العلوم کا خاکہ پیش کیا۔ "دار العلوم ندوہ" اسی دن کے خواب کی تعبیر اور شبلی کے اسی خاکہ کی تکمیل ہے جسے شبلی کے بار بار اصرار پر غور کرنے کے لئے منظور کیا گیا تھا۔

اپریل ۱۸۹۵ء میں مجلس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا جس میں اہم ترین بحث یہ تھی کہ علوم زیرِ درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں، اس ضرورت کو سب نے تسلیم کیا۔ مولانا منصور علی مراد آبادی نے نصاب درس میں علوم جدیدہ کے اضافہ کی تجویز پیش کی تو اس پر سخت اختلافات ہو گئے اس کے باوجود وہ کثرتِ رائے سے پاس ہو گئی۔

دسمبر ۱۸۹۵ء میں کانپور میں مجلس نصاب کا جلسہ ہوا جس میں کئی روز تک بحث و مباحثہ کا سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر مولانا شبلی کا مجوزہ دار العلوم کا خاکہ مرتب و منظور ہوا۔

اپریل ۱۸۹۶ء میں بانس بریلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا جس میں ندوۃ العلماء کے ساتھ دار العلوم کی ضرورت پر بھی گرماگرم اور پُرجوش تقریریں ہوئیں، اس کے بعد مجلس سے زیادہ زور دار العلوم کی ضرورت پر دیا جانے لگا اور جگہ جگہ جلسے کرکے اس کے متعلق رائے ہموار کی گئی چنانچہ مارچ ۱۸۹۷ء کے اجلاس میرٹھ میں شبلی نے پھر دار العلوم کی ضرورت اور مقصد پر تقریر کی اور بقول سید سلیمان ندوی "اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش فی الحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھتا جاتا تھا اور ہر شخص جوش اور فرطِ انبساط سے محوِ حیرت ہو گیا تھا۔" اب ساری توجہ دار العلوم کے قیام پر مرتکز ہو گئی تھی۔ خاکہ اور نصاب بھی مکمل ہو چکا تھا۔ ملک کی فضا بھی موافق

---

[1] مکتوب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بنام شبلی۔

تھی، زمین اب ہموار ہو چکی تھی بس بیج ڈالنا باقی تھا کہ ۸-۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو اس "مجلس" کا پانچواں اجلاس اپنے مقصد کا دائرہ پورا کرتا ہوا پھر سرزمینِ کانپور میں منعقد ہوا۔ اس میں "مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے یہ تحریک کی کہ ندوہ کا ایک وفد لکھنؤ بھیجا جائے جو وہاں جا کر دارالعلوم کے لئے کوئی مناسب زمین حاصل کرلے اور بالفعل کام شروع کرنے کے لئے کوئی مکان پسند کرے نیز یہ کہ مجوزہ دارالعلوم کے ابتدائی درجے کے ایک سال کے مصارف کا اس وقت انتظام ہونا چاہیئے۔ منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی اور مولانا شبلی نے فرمایا کہ علما کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے، اس واسطے میں تحریک کرتا ہوں کہ درجۂ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکان انتظامیہ ہو جائیں[1] یہ تجویز بھی پاس ہوئی اور چندہ جمع کرلیا گیا۔

اسی سال "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کا قیام عمل میں آیا۔ لکھنؤ کے ایک مکان[2] میں تعلیم شروع ہوگئی اور مجلس کے ناظم مولانا سید محمد علی ہی دارالعلوم کے ناظم اول منتخب اور مقرر ہوئے۔ لیکن دارالعلوم میں بیشتر کتابیں قدیم نصاب کے مطابق ہی پڑھائی جانے لگیں اور جدید علوم کے اضافہ کے ساتھ جو نصاب ترتیب دیا گیا تھا اس میں کئی سال تک عمل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ مولانا شبلی اس نصاب جدید کے بنیادی محرک تھے۔ اس لئے انھوں نے قدیم نصاب پڑھانے کی سخت مخالفت کی لیکن ندوہ میں قیام پذیر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی مستقل اور سخت قدم نہیں اٹھا سکے۔ وہ ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے وہیں سے ہدایات یا گذارشات لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔ ان پر عمل نہ ہونے کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ نصاب منظور ہونے کے باوجود اساتذہ کی اکثریت قدیم نصاب کی دلدادہ اور جدیدیت کی طرف سے مشتبہ و متردد تھی، مولانا جب ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے معتمد بن کر آئے اور ندوہ میں مستقل قیام کیا تو اس وقت سے جدید نصاب رائج ہوا اس میں متداولہ کتابوں کے علاوہ تفسیر قرآن، جدید عربی زبان و ادب و انشاء، جدید علم کلام

---

[1] حیات شبلی ص ۲۱۵

[2] یہ مکان خاتون منزل کے نام سے مشہور ہے اور گولہ گنج لکھنؤ میں واقع ہے۔

انگریزی اور سنسکرت وغیرہ کو بطورِ خاص مرکزِ توجہ بنایا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں احساس کمتری پیدا نہ ہو اور ان میں اعلیٰ علمی ذوق و استعداد، ہر فن کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت اور ہر علمی میدان میں سبقت لے جانے کا جذبہ و خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔ یہ نصاب رائج ہونے کے دو سال کی مختصر مدت میں طلبہ کو جو غیر معمولی فائدہ پہنچا اور مقصد برآری ہوئی اس کا اندازہ سید صاحب کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> "بہرحال اتنی ہی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ خاکسار ۱۹۰۶ء کے جلسۂ دستار بندی میں علومِ قدیمہ وجدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کر سکا۔ میں نے الندوہ میں "تکوینِ ارض" اور "مسلمان اور علم ہیئت"[1] پر چند نمبر لکھے۔" (حیاتِ شبلی ص ۴۳۹)

اس نصاب میں اتنی انگریزی کی لازمی تعلیم بھی رکھی گئی تھی کہ ایک محنتی طالب علم کو انگریزی زبان پر دسترس ہو جائے اور وہ ضروری کاموں میں دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ سال بھر کی انگریزی کی تعلیم و تدریس اور تیز رفتاری کا ثبوت بھی سید صاحب ہی کے ایک بیان سے فراہم ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ انگریزی پڑھ کر یہاں کے طلبہ نے کتنے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور عہدے حاصل کئے یہ حقیقت بھی ہے۔ اپنے متعلق سید صاحب نے صرف اتنا لکھا ہے:

> "میری معمولی انگریزی تعلیم ندوہ ہی کی رہینِ منت ہے اس کا فیض ہے کہ میں ۱۹۱۰ء میں انگریزی اسکولوں کی ریڈروں سے صیغۂ اغلاطِ تاریخی کی رپورٹ پیش کر سکا ارض القرآن لکھ سکا اور یوروپین مواد سے اپنی تصنیفات میں فائدہ اٹھا سکا اور ۱۹۲۰ء میں یورپ جا کر کچھ کام کر سکا۔" (حیاتِ شبلی ص ۴۱۹)

مولانا شبلی کے بارے میں یہ حقیقت مشہور ہے کہ وہ اپنی کتابوں اور خصوصاً شعر العجم کے مسودہ کو بار بار کاٹ چھانٹ کر صاف کراتے اور اپنی تحریر کی پانچویں کاپی پریس کو بھیجتے تھے یہی نہیں بلکہ زبان و بیان کو مزید شگفتہ اور فصیح و بلیغ بنانے کے لئے کتابت کی پروف ریڈنگ

---

[1] پہلے مضمون کا نام "طبقات الارض اور مسلمان" تھا یہ دونوں مضامین الندوہ مئی ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۶ء کے شماروں میں شائع ہوئے۔

کے وقت بھی اس میں ہمہ تن متوجہ و منہمک رہتے تھے، ان کے ادبی ذوق کی لطافت و نزاکت و نفاست ان کی تصنیفات کے ایک ایک جملہ سے عیاں ہے۔ فن کا یہ بالغ اور پختہ شعور شاگردوں کی تربیت کے دوران بھی جلوہ افروز رہا ہے۔ طالب علموں کے مضامین کی حک و اصلاح ان کے اس مخصوص ذوق کی ترجمان اور آئینہ دار ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جب دارالعلوم کے علمی ترجمان ماہنامہ ”الندوہ“ کا اجراء عمل میں آیا اور کچھ دن کے بعد معتمد ندوہ مولانا شبلی نے خصوصی طور پر اس کی نگرانی اپنے ذمہ لی تو ذرا بھی کمزور یا لچکدار مضمون رسالہ میں بار نہیں پا سکتا تھا وہ خود ایک ایک لفظ کو پڑھ کر شامل کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ المامون، الغزالی، الفاروق اور سوانح مولانا روم کے مصنف مولانا شبلی کی محققانہ ژرف نگاہی، الکلام اور علم کلام کے مصنف کے استدلال اور صاحب شعرالعجم اور انیس و دبیر کے موازنہ نگار کی تنقیدی نظر نے چند ماہ میں اسے اعلیٰ معیار کے رسالوں کی صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ اس کے ہر ہر اقتباس سے تاریخی بصیرت تراوش کرتی نظر آتی ہے، مذہب اور علم و فن کے ان مرقعوں میں تنقید، ادب و انشاء کے بہترین گوہر بھی بآسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ رسالہ کی اس ہمہ جہتی نے لکھنے والوں کا ایک مزاج، ایک اسلوب اور معیار قائم کردیا اور اس رسالہ کا مضمون نگار ہونا درجۂ استناد کا ضامن قرار پایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں ندوہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ الندوہ کے ابتدائی مضمون نگاروں کی فہرست میں موصوف کا نام شامل ہے، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مفتی عبداللطیف صاحب کے ادبی مذاق نے سید صاحب کی کشتِ ذہن کو تیار کیا ہی تھا کہ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی کے آغوشِ تربیت میں جا پہنچے اپنی مشقت اور غیر معمولی محنت و مطالعہ کے ذریعہ وہ مقام حاصل کرلیا کہ استاذ کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ ۷-۱۹۰۶ء کے فارغ ہونے والے طلباء میں یکتائے روزگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ فراغت کے بعد ”الندوہ“ کے سب ایڈیٹر اور شبلی کے معاون بنالئے گئے اور کچھ ہی دن میں وہ رسوخ و اعتماد حاصل کرلیا کہ ”شبلی“ جیسے ایڈیٹر کی جگہ بیشتر شذرات موصوف ہی لکھتے اور فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔

مذکورہ تمام اولیات پر مستزاد یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسے دقیقہ رس، نکتہ سنج محقق و مؤرخ

اور ادیب و نقاد کے دامنِ تربیت میں اپنی جوانی کا بہترین زمانہ (بیس سے تیس سال کی عمر تک) گزارا اور شبلی جن میدانوں کے علم بردار تھے اس تربیت نے سیّد صاحب کو ان میں سے بیشتر کا شہسوار بنا دیا موصوف کی انفرادی صلاحیتیں اور دلچسپیاں اس تربیت کو مزید شوخ بنانے میں معاون ثابت ہوئیں۔ یوں تو فیضِ شبلی سے محض وابستگی ہی استفادہ کی ضامن تھی مزید برآں کسی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان کی کامل دس سالہ تربیت اور ہر ہر لحظہ رفاقت نے شبلی کی مکمل شخصیت کو اپنے جسم و ذہن کی لوح پر منعکس و محفوظ کر لیا ہو تو حیرت کی بات نہیں۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، انیسویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے غدر کی دہشت عام طور سے کم ہو گئی تھی لیکن انگریزوں کی مخالفت کا تصوّر اس وقت بھی غور طلب ہوتا تھا شبلی نے اپنے سفرِ قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد تُرکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت کا راگ نکالا اور یہ سرسید سے ان کے اختلاف کا سبب بھی بنا۔ ۱۹۰۸ء سے تُرکی سیاست کے نغمے بین الاقوامی سطح پر سُنائی دینے لگے۔ ۱۹۱۰ء میں انور بے کے نام پر ہندوستانی مسلمان بھی وجد میں آنے لگے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں باقاعدہ سیاسی شعور اور حرارت کا آغاز دراصل تقسیمِ بنگال کی تنسیخ ۱۹۱۲ء سے ہوتا ہے، اب تک وہ صرف ترکی کی حمایت میں کچھ دلچسپی لے لیا کرتے تھے لیکن تنسیخ بنگال کے عمل سے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ دہکنی شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی ہی نے سب سے پہلا مضمون "مسلمانوں کی پالیٹکل کروٹ" کے عنوان سے لکھ کر شائع کیا اور پھر اُسی زمانے میں نواب وقار الملک کا مضمون بھی اس تنسیخ کے خلاف غم و غصّہ کے اظہار کے لیے شائع ہوا تھا۔

۱۹۱۲ء میں ہی جنگِ بلقان شروع ہوئی جس نے دُنیائے اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات بھی مشتعل کر دیے اب مسلمان ملکی و بین الاقوامی سیاست میں شعوری طور پر آگے بڑھے، ترکی کی امداد میں اپنی روایتی سخاوت و مرّوت، جوش و حمیّت اور ہمدردی کا ثبوت دیا، عملی طور پر جو کچھ ممکن تھا کر گزرے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مطلعِ صحافت پر مسلمان ایک خاص آن بان اور جلالت و شان کے ساتھ نمودار ہوئے، پرانے اخبارات نے زندگی کرنے کے

نئے پیمان باندھے، کچھ نئے اخبارات بھی جاری ہوئے اس وقت مسلم سیاست و صحافت کے افق پر زمیندار لاہور، الہلال کلکتہ اور مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ روشن منارہ کی حیثیت سے ابھرے اور چمکے۔ الہلال کے مخصوص اسلوب اور رنگ و آہنگ نے مذہب کے راستے سے مسلمانوں کو بے باکی بے خوفی اور یقینِ کامل کا ایسا پُرجوش درس دیا کہ مسجد کانپور کے واقعہ (۲ر اگست ۱۹۱۲ء) کے بعد ۱۲ر اگست اور ۲ر ستمبر کے شماروں میں "مشہدِ اکبر" کے عنوان سے جو دو مضامین شائع ہوئے تھے ان کے نتائج نے مسلمانوں کے سیلِ رواں میں تلاطم پیدا کر دیا، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سلیمان ندوی وغیرہ نے اس دور میں مسلمانوں کی علمی و عملی قیادت کی۔

سید صاحب کا بے باک سیاسی اور صحافتی رجحان اسی پس منظر کا مرہونِ منت ہے۔

سید صاحب ندوہ میں عربی کے استاد اور معتمدِ الہلال کی مجلسِ ادارت کے رکن، دکن کالج پونا کے اسسٹنٹ پروفیسر، دارالمصنفین میں شبلی کے جانشین، وفد خلافت کے رکن و رئیس، موتمرِ عالمِ اسلامی کے صدر، شاہ سعود کے مہمانِ خصوصی، شاہ افغانستان کے مدعو مشیر، مولانا اشرف علی تھانوی کے مُرید و خلیفۂ خاص، ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ، جامعۃ الشرعیہ بھوپال کے امیر اور پاکستان میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے تشکیل کردہ لا کمیشن کے چیرمین، وہ سب کچھ بنے اور ان کے اسباب کچھ کیوں نہ رہے ہوں لیکن اس سب میں علامہ شبلی کی اس تربیت کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے جس نے ہر چیز پر غور کرنے اور ہر ہر مسئلہ کے سلسلہ میں تحقیق و تدقیق اور سلیقہ مندی کا عادی بنا کر شخصیت میں عظمت و جلالت اور کشش و انجذاب پیدا کر دیا تھا۔ مخصوص انفرادی صلاحیتیں اور زمانہ کی رفتار بعض میدانوں میں تو سید صاحب کو شبلی سے بھی کہیں آگے لے گئیں۔ اگر شبلی محقق، مورخ، پروفیسر (علی گڑھ)، ادیب و شاعر و نقاد انشا پرداز اور انیسویں صدی کے رُبع آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دھائی کے فاضلِ اجل تھے تو شبلی کی بعض طبعی خصوصیات سے عاری ہونے کے باوجود سید صاحب، بیسویں صدی کے نصف اول میں شبلی کے ان تمام اوصاف و کمالات پر حاوی بھی تھے اور ان کے مبصر بھی۔ علاوہ ازیں وہ ایک بڑے سیاست داں، بہت بڑے صحافی، ماہر تعلیم، ماہر لسانیات، محقق، اردو کے قابلِ تقلید ہمدرد،

نادر الوجود صوفی، آزاد پاکستان کی دستور ساز کمیٹی کے چیرمین اور غیر معمولی متوازن شخصیت کے مالک بھی تھے، جو شبلی کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ یہ بات سید صاحب کی زندگی کے ورق ورق میں بکھری ہوئی ملتی ہے اِس سے شبلی کی تخفیف نہیں ہوتی بلکہ شخصی انفرادیت آشکارا کئے بغیر کسی شخص کا رتبہ متعین کرنا ممکن نہیں اور یوں بھی شاگرد کا بڑے سے بڑا امتیاز استاد کے لئے موجب افتخار ہی ہوتا ہے۔

سید صاحب بنیادی طور پر ایک مذہبی عالم تھے اور ان کی زندگی کا مقصد علم دین کی خدمت کے علاوہ کچھ اور نہیں رہا۔ تاہم تحقیق سے اپنی غیر معمولی مناسبت، ہمہ جہت مطالعہ، متوازن تنقیدی بصیرت اور مذکورہ بالا سرگرمیوں کے باعث موصوف نے بعض ایسے ادبی کارنامے بھی انجام دیئے ہیں جن کی توقع اعلیٰ درجہ کے ادیبوں سے ہی کی جاسکتی ہے (سید صباح الدین عبدالرحمٰن) نے ایک جگہ لکھا ہے:

> وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے بلکہ سیرت نگار بھی، مفسر بھی، محدث بھی، متکلم بھی، ادیب بھی شاعر بھی، نقاد بھی اور مورخ بھی تھے مگر وہ اپنے استاد علامہ شبلی کے اس قول کو برابر نقل فرماتے رہتے تھے کہ اصل فن تو تفسیر، حدیث اور علم کلام ہے، ادب و تاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے دسترخوان پر ہوتی ہے۔ اس طرح ادبی و تاریخی مضامین محض علمی ذائقہ بدلنے کے لئے لکھے جاتے ہیں ان کا عمل اسی پر رہا۔ ان کی عزیز اور بیش قیمت زندگی سیرۃ النبی لکھنے میں صرف ہوئی جس کا شمار اس وقت اسلامی دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے ....” (مقالات سلیمان حصہ اول ص ۱)

سید صاحب کی تحقیق ہو یا سوانح، شاعری ہو یا تنقید، صحافت ہو یا لسانیات یہ سب ان کی مذکورہ بالا شخصیت سے الگ مجرد طور پر کچھ نہیں ہیں لہٰذا اس مقالہ اور اس کے مشتملات کو اس پس منظر میں دیکھے بغیر چارۂ کار نہیں اور یہ بات اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ایک شخص کی دوسرے اور تیسرے درجہ کی چیزیں اہل ادب کی نظر میں معتبر و مقتدر قرار پائیں۔ یہ بات کم از کم سید صاحب کی تحقیق و صحافت پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ خود سید صاحب کے مذہبی مضامین اور تصانیف میں بھی جا بجا ادبی مواد بکھرا ہوا نظر آتا ہے اور اس بات سے بھی انکار مشکل ہے کہ انھوں نے مذہب کو ادب عالیہ کی چاشنی دے کر زیادہ لذیذ بنادیا ہے اور ادب کو مذہب کا قرآنی، کلامی اور استدلالی مواد و اسلوب عطا کر کے اس کی عام سطح سے کافی بلند کیا ہے۔

وطن، خاندان اور ابتدائی حالات

وطن: سید سلیمان ندوی ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء جمعہ کی صبح کو دسنہ، بہار میں پیدا ہوئے۔ یہ مردم خیز بستی پٹنہ کے مشرق میں سولہ میل اور بہار شریف سے شمال مشرق میں آٹھ میل کے فصل پر واقع ہے۔ اس کی قدامت تاریخی اہمیت اور یہاں کے اہلِ کمال کی علمی فضیلت کا تذکرہ مختلف اہلِ علم نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ سید نجم الہدیٰ دسنوی نے لکھا ہے کہ

> "دسنہ بہار شریف ضلع پٹنہ سے آٹھ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس گاؤں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں سے جین یا بودھ مذہب والوں کا کچھ تعلق رہا ہے چنانچہ اب بھی بعض حصوں کی کھدائی کے وقت عہد عتیق کی اینٹیں اور پتھر نکلتے ہیں۔ ۱۳۰۲ھ سے قبل جب دسنہ کی مسجد کی تعمیر ایک بلند مقام پر شروع کی گئی تو بنیاد کھودتے وقت اندر سے ہزاروں پختہ اینٹیں برآمد ہوئیں جو ڈیڑھ فٹ مربع اور مستطیل اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی تھیں۔ یہی خداداد اینٹیں مسجد کی بنیاد کے کام آئیں۔ قیاس ہے کہ اس جگہ کوئی گڑھ رہا ہوگا جو اس کی تاریخی اہمیت کی دلیل ہے"[1]

عبد القوی دسنوی نے یہاں کی علم پروری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

> "دسنہ صوبہ بہار کا ایک مردم خیز گاؤں ہے جہاں ہر دور اور ہر زمانے میں حکماء

---

[1] معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۵۹ء مضمون "سید صاحب کی یاد میں"

ادبا اور علما پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن عام طور سے وہ اپنی خمول پسند طبیعت کی وجہ سے دنیاوی شہرت کے مالک نہ بن سکے نامی میں وہاں فلسفہ و منطق میں مولوی عبد الحکیم منجم اور ریاضی داں کی حیثیت سے مولوی محمد یعقوب اور قصص و حکایات کے میدان میں مولوی عبد الجلیل نظر پیدا ہوئے۔ حافظ تجمل حسین جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دو اہم مذہبی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

> "سرسید کی علمی، ادبی، معاشرتی اور سماجی تحریک کا جب آغاز ہوا تو یہ گاؤں اس تحریک کا بڑا حامی تھا چنانچہ اسی تحریک کے زیر اثر یہاں بڑے بڑے ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور اہلِ علم حضرات پیدا ہوئے جن کی علم نوازی اور ادب پروری نے یہاں اردو کا ایک بہت ہی عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا۔"[1]

سید صاحب کے وطن و اجداد کے بارے میں ضروری معلومات کا فقدان ہے اس کے علاوہ جو تفصیلات درج کی گئی ہیں وہ تضاد سے پاک نہیں کیونکہ مواد کا مدار ہمعصر شہادت پر نہیں بلکہ یہ معلومات عہدِ حاضر کی سینہ بسینہ روایات پر مبنی ہے۔ چنانچہ تذکرۂ سلیمان میں ہے کہ

> "دو سو برس کی بات ہے کہ حضرت والا کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر آ پہنچے اور یہاں اجمیر شریف کے راستے صوبہ متحدہ (یوپی) سے گزر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا (یہ روایت میں نے خود حضرت والا کی زبان سے سنی ہے) چنانچہ عظیم آباد پٹنہ کے نواح میں آج بھی سادات کی بارہ بستیاں جو عام زبان میں بارہ گاواں کہلاتی ہیں، موجود ہیں۔
>
> حضرت والا کا وطن دیسنہ، بہار شریف (ضلع پٹنہ) سے شمال مشرق میں آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور سادات بہار کی برادری میں بہت ممتاز ہے۔"[2]

سید صاحب کے حوالے اور سند دینے کے باوجود مذکورہ بالا دعوی کی تصدیق دوسرے مستند

---

[1] سات تحریریں مصنفہ عبد القوی دسنوی ص ٦٥

[2] تذکرہ سلیمان مصنفہ غلام محمد ایم اے ص ٢٧

ذرائع سے نہیں ہوتی کیونکہ موصوف کے جد امجد عہدِ اکبری میں دلیسنہ میں مقیم تھے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سید نجم الہدیٰ نے لکھا ہے کہ

> "سادات دلیسنہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت میر حسن شہید کا نسب نامہ حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے ان کے آبا و اجداد مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ میر حسن شہید عہدِ اکبری سے بہت[عہ] پہلے بہار تشریف لائے اور دلیسنہ میں مقیم ہوئے اور عہدِ اکبری میں جب دینِ الٰہی کا فتنہ اٹھا تو اس سیاسی اور مذہبی بحران میں میر حسن نے شہادت پائی اور دلیسنہ ہی میں مدفون ہیں ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے سید عثمان دلیسنہ ہی میں متوطن رہے اور ان کی دوسری اولادیں اور مقامات پر منتقل ہو گئیں۔ سید عثمان کے اکلوتے صاحبزادے میر محمد سید سلیمان تھے ان کے دو لڑکے تھے حضرت صدر الدین اور حافظ میر جان محمد۔ سادات دلیسنہ ان ہی دونوں بھائیوں کی نسل سے ہیں اور جب بہار کے سادات کا عروج ہوا تو حضرت صدر الدین کو ائمہ دلیسنہ کے علاوہ اور بھی جاگیر ملی جن میں سے ایک حصہ ان کے چھوٹے بھائی حافظ جان محمد کے نام پر چک جان محمد کے نام سے اب تک مشہور ہے۔"[1]

خاندان: اگرچہ سید صاحب کے اسلاف کے ورود ہندوستان کے بارے میں کسی قدر اختلاف ہے لیکن موصوف کے نجیب الطرفین سید ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور تمام متعلقہ اہلِ قلم نے بالالتزام اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور صاحب تذکرہ سلیمان نے لکھا ہے کہ "حضرت والا سلسلۂ سادات کی ایک مشہور کڑی سے منسلک تھے۔ آپ کا نانہال زیدی اور ددھیال حسینی تھا۔"[2] اس بیان کی تائید سید صاحب کی قلمی بیاض سے بھی ہوتی ہے جس میں سلسلۂ نسب کی تفصیلات

[عہ] یہ لفظ "بہت" "نہیں" "کچھ" معلوم ہوتا ہے بے احتیاطی کے سبب بہت لکھا گیا ہے۔

[1] بحوالہ معارف نومبر ۵۹ء

[2] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۲۷

محفوظ ہیں۔ مولوی نجم الہدیٰ نے مذکورہ بیاض سے مادری اور پدری دونوں روایتیں نقل کی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

پدری سلسلۂ نسب: سید سلیمان ندوی بن حکیم سید ابوالحسن بن حکیم سید محمد شیر بن میر عظمت علی بن میر وجیہ الدین عرف میر جگن بن رجب علی بن میر محمد شیر بن حضرت میر صدر الدین (مورثِ اعلیٰ)، بن میر سید سلیمان بن میر سید عثمان بن میر سید حسن شہید بن سید شمس الدین بن میر سید خلیل بن میر سید عرب ثانی بن میر سید مالک بن میر سید میر بن میر سیّد محمد بن سید معین محمد بن میر محمد بن سید عرب اول بن میر سید بُرہان بن میر سید میران بن میر سید احمد بن میر سید محمد بن سید یوسف بن سید اسحاق بن سید یعقوب بن سید حسن بن امام علی رضا بن امام موسیٰ بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن حضرت فاطمہ بنت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

نانھالی سلسلۂ نسب: سید سلیمان ندوی بن بی بی قطبن بنت حکیم سید حیدر حسن بن حکیم سید کاظم حسین بن حکیم سید خادم حسین بن حکیم سید رحمت اللہ بن سید امین اللہ بن سید محمد فاضل بن سید غلام حیدر بن سید عبدالہاشم بن سید عبداللہ بن سید علاول بن سید لوک بن سید چاند شہید بن سید یحییٰ بن سید محمد بن سید یحییٰ بن سید محمود بن سید زید بن سید مسعود بن سید محمود بن سید ابوالفرح واسطی بن سید داؤد بن سید حسین بن سید یحییٰ بن زید بن سید عمر بن سید ابابکر علی بن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن سید ابو یحییٰ عیسیٰ بن امام زید شہید بن امام زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت فاطمہ زہرا بنت رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم [1]

اجداد و اسلاف: دیسنہ کا صرف یہی امتیاز و اختصاص نہیں ہے کہ اہلِ کمال کے ورود نے اس کی اہمیت و عظمت میں اضافہ کیا بلکہ اس کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں مختلف علوم و فنون

---

[1] بحوالہ معارف، نومبر ۵۹ء

کے ماہرین اور اہلِ کمال اس دور افتادہ بستی کو منور و ممتاز کرتے رہے ہیں۔ سید صاحب کے آباواجداد نجیب الطرفین سید ہونے کے علاوہ نجیب الطرفین اطبائے حاذق بھی تھے چنانچہ آپ کے نانا حکیم سید حیدر حسن اور دادا حکیم سید محمد شیر عرف حکیم میر محمدی اپنے زمانے کے نامور اطبا میں شمار کئے جاتے تھے۔

حکیم میر محمدی ابتداءً بہار شریف میں مقیم تھے، بعد میں شیخو پورہ (ضلع مونگیر) منتقل ہو گئے۔ علمی حیثیت سے اپنے فن حذاقت اور رسوخ کے باوجود تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا اور اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے چنانچہ موصوف نے اپنے صاحبزادے حکیم سید ابوالحسن کی تعلیم کے سلسلے میں متداولہ کتابوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مولوی نذیر احمد کی طرح فن طب پر "مخزن الحکمۃ العلماءؒ" اور "دستور العلاج" ایسی جامع، مفید اور دلنشین کتابیں مرتب کیں۔

حکیم صاحب کو فن شعر سے بھی مناسبت تھی اور شاعری کا شائستہ اور رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی مخصوص زاہدانہ زندگی اور علمی تبحر کے باعث اصناف سخن میں قصیدہ سے مناسبت تھی لیکن یہ مناسبت اہل دول اور ارباب حکومت کے بجائے بزرگانِ دین کا حصہ تھی یہی سبب ہے کہ موصوف کے سارے قصاید اکابر و اسلاف ہی کی شان میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب کبھی کبھی اکابر خاندان کی تاریخِ وفات بھی نظم کیا کرتے تھے موصوف نے اپنا نسب نامہ بھی نظم کیا تھا[1] جس سے خود موصوف کے بھی پدری سلسلہ میں رضوی اور مادری سلسلے میں زیدی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ان ظاہری کمالات کے حصول کے باوجود اپنی شخصیت کی نشو و نما، بالیدگی اور رعنائی و توانائی کے لئے اصلاحِ باطن پر بھرپور توجہ مبذول کی اور اس اہم مقصد کے حصول کے لئے حضرت شاہ نور محمد کے دامنِ تربیت میں پناہ لی اور موصوف کی شخصیت اور تصرّفِ باطنی سے انسانیت اور شرافت کے بلند مقام پر پہنچے جس کی جھلکیاں اخلاف میں بدرجۂ احسن موجود ہیں چنانچہ سید صاحب کے والد حکیم سید ابوالحسن، مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواروی کے خلفائے مجازین میں تھے۔ بڑے بھائی سید ابو حبیب شاہ نور محمدؐ بھوپالی سے بیعت تھے، خود سید صاحب نے بھی علوم ظاہری و باطنی

---

[1] حکیم صاحب کی یہ بیاض دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے۔

سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے مولانا اشرف علی تھانوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور خلافت و اجازت سے مشرف ہو کر موصوف کے اجل خلفاء میں شمار ہوئے۔ حکیم میر محمدی نے سلوک و معرفت سے وابستگی کے بعد علم و عرفان کے اس دریائے ناپیدا کنار سے چند نایاب اور آبدار موتی نکالے اور انھیں "نور محمدی" کی صورت میں اہل ذوق کی خدمت میں پیش کیا۔ مشائخ سہروردیہ کے مستند احوال کا یہ مجموعہ نہ صرف حقائق و معارف کا لازوال شاہکار ہے بلکہ فن سوانح نگاری میں بھی موصوف کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ قطعہ تاریخ وفات سے بھی موصوف کی ہمہ گیری کی تائید ہوتی ہے۔ سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن نے اس قطعہ کا ایک مصرعہ نقل کیا ہے۔

کیا ہو ثانیٔ بقراط و ارسطا طالیس

سنہ ۱۳۰۳ھ

حکیم میر محمدی کے تین صاجزادے تھے، سید ابوالحسن، سید ابوتراب اور سید ابویوسف۔ اول الذکر سید صاحب کے والد ماجد اور دوسرے بھائیوں سے عمر میں بڑے تھے۔ خاندانی روایات ہی کی مناسبت سے پیشہ اختیار کیا اور فنی رسوخ کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہد کے طبیب حاذق سمجھے جاتے تھے چنانچہ اسی حذاقتِ فن اور کریم النفسی کا ثمرہ تھا کہ قبولِ عام کے زیور سے آراستہ ہوئے بالخصوص طبقہ شرفاء میں آپ کی پذیرائی، مقبولیت اور اکرام بدرجۂ اتم تھا۔ مولوی نجم الہدیٰ نے ریاست اسلام پور میں موصوف کے تقرر اور اعزاز و اکرام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> سید صاحب کے ننہالی رشتہ میں چار پشتوں تک طبیب ہوتے رہے اطراف بہار میں یہی پہلا خاندان ہے جس میں طبابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ سید صاحب کے نانا اور میرے دادا حکیم سید حیدر حسن اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے اور اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہور الحق کے خاندانی معالج تھے۔ ان کے بڑے صاجزادے سید ناظر بھی بہت اچھے طبیب تھے لیکن عین عالم شباب میں لاولد وفات پا گئے تھے۔ اس لئے حکیم سید حیدر حسن کے انتقال کے بعد سید صاحب کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن کا تقرر ہوا اور بڑے اعزاز کے ساتھ رہے ان کی پوری زندگی وہیں گذری۔[1]

---

[1] معارف حوالہ سابقہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ

> "پٹنہ کے مشہور قصبہ اسلام پور کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانے کے بڑے صاحبِ ثروت و وجاہت رئیس تھے، ان کے گھر کے سب افراد حکیم سید ابوالحسن کا بے حد احترام کرتے اور ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے"[1]

غلام محمد صاحب نے بھی خاندانی کمالات میں حکیم صاحب کے امتیازات کا تذکرہ کیا ہے۔

> "حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن اپنے خاندانی کمالات میں اور بھی ممتاز تھے وہ ایک سنجیدہ عالمِ دین، ریاستِ اسلام پور کے شاہی طبیب اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ کامل تھے نفاست و نظافت ان کی طبیعت کا خمیر تھا ان کا ظاہر باوقار اور باطن کمال تقویٰ کا آئینہ دار تھا"[2]

فن طب میں اختصاص کے علاوہ حکیم صاحب کے اعزاز و اکرام میں موصوف کی جامع حیثیات شخصیت کو خاص دخل تھا۔ وہ اپنے والد کی طرح حلم و بردباری متانت و سنجیدگی اور تقویٰ و ورع کے اوصاف سے مالامال تھے اور رفعتِ باطنی کے اعتبار سے خصوصی امتیاز کے حامل تھے۔ چنانچہ باطنی اصلاح و تزکیہ کے سلسلے میں اوّلاً شاہ ولایت علی نقشبندی، اسلام پوری سے رجوع کیا۔ موصوف کے وصال کے بعد حضرت شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواروی سے تجدید کی اور بالآخر نسبتِ احسان سے سرفراز ہوئے اس لئے اپنی فنی مقبولیت کے ماسوا مشائخ طریقت کی مجالس میں زمرۂ خواص میں شمار کئے جاتے تھے۔ شاہ غلام حسین ندوی پھلواروی کا بیان ہے کہ

> "سید مرحوم کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ ابوالحسن اسلام پوری اپنے وقت کے بڑے صوفی بزرگ تھے۔ میرے والد ماجد حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور میرے خالو حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب پھلواروی اور حکیم صاحب قبلہ تینوں مرید و مسترشد اور خلفا تھے میرے نانا حضرت شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواری کے۔ ان تینوں

---

[1] بحوالہ معارف سلیمان نمبر ص ۲

[2] ایضاً 〃 〃 ص ۲

بزرگوں کے درمیان بڑے خصوصی تعلقات اور گہرے برادرانہ روابط تھے۔"

حکیم صاحب دنیاوی وجاہت وثروت، فنی حذاقت ومہارت، خاندانی شرافت ونجابت اور مرجعیت وشہرت کے باوجود شکر وامتنان، تفویض وتوکل، تمکین ووقار اور تسلیم ورضا جیسے انمول جواہر اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ ومزین تھے۔ محبّت الٰہی کی شراب سے خود سرشار اور تصوّر آخرت سے بے قرار رہنے کے باوجود حدود شرعیہ کا بڑا اہتمام تھا۔ حسب ذیل شعر موصوف کی حیاتِ طیبہّ کا بہترین عکّاس وترجمان ہے۔

درکفے جامِ شریعت درکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکی نداند جام وسندان باختن

مشائخ چشت کے یہاں وجد وحال اور رقّت وابتہال کا زبردست غلبہ ہوتا ہے لیکن مشائخ نقشبند شرعی حدود سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مبشرات ومنامات، الہامات ومکشوفات، انوار وخوارق عادات کیفیات وواردات کے اخفا کا غیر معمولی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ موصوف بھی اپنے پیشے کی مصروفیت وانہماک، علما ومشائخ اور رؤسا کی مجالس کے اشتراک، اہل وعیال کی تربیت اور خانگی مصروفیات کے ذریعہ اپنی قلبی کیفیات اور احوال کے اخفا کی بھرپور کوشش کرتے اور بقول علاّمہ اقبال

با چنیں ذوقِ جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

کے بہترین مظہر ومصداق تھے لیکن مذکورہ التزام واہتمام کے باوجود پوری زندگی میں ایک دو واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ دامنِ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا اور اس وارد میں مشائخ چشتیہ کے حریف بن گئے مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے کہ

> "برادری میں شادی تھی، رخصتی کے وقت مشہور وداعی گیت لونڈیاں گا رہی تھیں حکیم صاحب ممدوح مسجد میں تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ سمعِ مبارک میں گیت کے چند الفاظ پہنچ گئے اور ایک ایسا حال ان پر طاری ہوا کہ مسجد کی دیوار پر سر دے مارا جس سے خون جاری ہوگیا"[1]

---

[1] ریاض سلیمان نمبر ص ۲۲

حکیم صاحب کی شخصیت میں ظاہری اور باطنی کمالات کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ موصوف جس طرح فنِ طب میں اختصاص و امتیاز کے باعث حذاقت کے زیور سے آراستہ اور روحانی صلاحیت کے اعتبار سے چیدہ اور منتخب افراد میں شمار کیے جاتے تھے اس طرح اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بے مثال اور یکتائے روزگار تھے۔ عبدیت و تواضع کا یہ حال تھا کہ علم اور اہلِ علم کی عظمت و بزرگی قلب و ذہن میں رچ گئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ موصوف اپنے اساتذہ کرام اور محسنین کے ساتھ انابت اور فروتنی سے پیش آتے بلکہ عام اہلِ علم کا بھی اسی درجہ اکرام کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے اخلاف کے اساتذہ کے ساتھ غیر معمولی اعزاز و اکرام کا معاملہ فرماتے اور انھیں اپنا محسن و خیر خواہ تصوّر کرتے تھے اس احسان کو تمام احسانات سے افضل سمجھ کر ان کی ہر گونہ خدمت کا اہتمام و التزام کرتے تھے۔ اکل و شرب ہی پر کیا موقوف ہے، لباس کے موسمی تغیرات کے علاوہ محبوبات و مرغوبات کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے۔ سیّد صاحب کے ابتدائی اتالیق مولوی مقصود بھی تنخواہ کے علاوہ ہر نوع کی خدمت سے سرفراز ہوتے رہتے تھے۔ مولانا گیلانی کا بیان ہے۔

> "دسنہ ہی کے نواح میں اوکھدی نامی بستی کے ایک معلم جن کا نام مولوی مقصود تھا، ان کا تقرر بچوں کے گھر پر پڑھانے کے لئے سید الملت کے والد ماجد مولوی حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم نے کیا تھا۔ علاوہ کھانے، ناشتہ، پان، حقہ وغیرہ کے سید صاحب کے گھر سے مولوی مقصود کو دو روپیہ ماہوار ملتے تھے اور جاڑوں کے موسم میں سید صاحب کے والد ماجد جب اسلام پور سے وطن دسنہ میں تشریف لاتے تو مولوی مقصود صاحب کے لیے رُوئی کا ایک دگلا، روئی بھرا ہوا پاجامہ اور روئی کا کنٹوپ التزاماً ساتھ لاتے تھے۔"[1]

حکیم صاحب کو فنّی حذاقت اور اہلِ دول سے تعلق کے باوجود دنیوی مال و دولت سے مناسبت نہیں تھی حتیٰ کہ اہلِ ثروت سے ایک گونہ بے گانگی اور اِبا تھا لیکن جبلی انکساری اور جذبۂ خدمت خلق سے مجبور ہو کر ہر کس و ناکس کو دریائے بیکراں کی طرح سیراب کرتے رہتے تھے۔ استغنا

---

[1] ریاض حوالۂ مذکور

کا یہ عالم تھا کہ کسی کی امارت اور تمول ہی قابلِ اعتنا نہیں تھا لیکن اپنے خلق و مروت اور تواضع سے اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتے تھے۔ اس کے برخلاف سخاوت اور دریا دلی، فیاضی اور سیر چشمی کا یہ حال تھا کہ اپنے پاس جو کچھ تھا اسے خدا کی امانت سے زیادہ تصور نہ کرتے تھے۔ اور اسے دوسروں پر لگانے کے لئے ہمہ وقت مضطرب اور بیقرار رہتے تھے۔ چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ موصوف صلہ رحمی میں اپنے اقران و امثال پر سبقت لے گئے تھے اور اس صفتِ خاص میں ایسا ملکہ، دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی تھی کہ اقرب اعزہ کا تو پوچھنا ہی کیا بعید ترین اعزہ بھی حکیم صاحب کے دستِ گوہر بار سے دُرِّ یتیم رولتے تھے۔ چنانچہ خود سید صاحب کا بیان ہے۔

> " میں نے اپنے والد ماجد اور حضرت تھانوی سے زیادہ باہمہ اور بے ہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں۔ بے ہمہ تو ایسے تھے کہ اپنے ذاتی معاملہ میں ان کو کسی سے تعلق نہ تھا اور باہمہ ایسے کہ دور دور کے عزیز و اقارب کے ادنیٰ حق کی ادائیگی پر بھی نظر رہتی تھی اور اس میں تاخیر گوارا نہ فرماتے تھے۔"

سید صاحب کی والدہ ماجدہ بی بی قطبن، حکیم سید حیدر حسن کی صاحبزادی تھیں۔ حکیم صاحب ایک جید عالمِ دین، قرآن مجید کے عاشق اور اتباعِ سنت کے دلدادہ تھے، اس کے علاوہ ان کی نیکی اور خدا ترسی، اخلاص اور ہمدردی، دلسوزی اور دلداری زبان زدِ خاص و عام تھی۔ اہل و عیال کی نگہ داری اور تربیت کا خاص اہتمام کرتے تھے چنانچہ موصوفہ کی ذات ان تمام صفات اور خصائص کی بہترین مظہر اور ترجمان تھی اپنی عصمت و عفت، لینت و شفقت نفاست و نظافت اور حسنِ خلق و ملکۂ تربیت جیسے موروثی اور ذاتی کمالات کے علاوہ سید صاحب کے والد ماجد کی معیت اور صحبت، حسنِ تربیت اور محبت مستزاد تھی۔ اس لئے معرفت کے جوہر سے مالا مال اور صحابیات کی محبت سے سرشار تھیں اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ موصوفہ کو عربی اور عربیت سے گہری مناسبت پیدا ہو گئی تھی اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ زیارت حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد تو خالص عربی لباس اختیار کر لیا تھا۔ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ

> ” نہ صرف ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب مرحوم بلکہ سید صاحب کی والدہ ماجدہ بھی حج و زیارت کے شرف سے فیض یاب تھیں ۔ والدہ ماجدہ پر تو ان کی حجاز سے واپسی کے بعد یہ حال طاری ہوا کہ ساداتِ بہار کی خواتین کا جو عام لباس اس زمانے میں تھا اس کو ترک کر کے قریب قریب وہی لباس اختیار فرما لیا تھا جو اس زمانے میں خواتینِ عرب سے زیادہ مشابہ تھا، گویا ہندیہ مستعرب بن گئی تھیں [1]

حکیم سید ابوالحسن کے ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے تھے ۔ صاحبزادی پر بھی والدین کے بہترین خصائل اور اعلیٰ تربیت کا غیر معمولی اثر مرتب ہوا اور بقول مولوی نجم الہدیٰ گاؤں کی تعلیم یافتہ خواتین میں ان کا پہلا یا دوسرا درجہ تھا ۔ وہ گاؤں ہی میں سید امیر الحسن ابن میر واعظ شیر بن میر صفدر شیر سے بیاہی گئیں لیکن شادی کے فوراً ہی بعد بیوہ ہو گئی تھیں ۔

سید ابوحبیب صاحب سید صاحب سے عمر میں اٹھارہ برس بڑے تھے، اس لئے وہ برادرانہ تعلق سے ماورا استاد ، مربّی اور سرپرست سب کچھ تھے چنانچہ سید صاحب نے موصوف سے تقریباً چالیس سال بھرپور استفادہ کیا ۔

سید ابوحبیب کی ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کے سایہ عاطفت میں ہوئی ۔ مزید تعلیم و تکمیل کے لئے اولاً عظیم آباد اور اس کے بعد پھلواری شریف پہنچے اور اپنے وقت کے منتخب و مستند محدثین حافظ عبداللہ غازی پوری اور مولانا شاہ نعمت علی پھلواروی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان کی نظر کیمیا اثر سے علوم حدیث میں رسوخ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تصحیح عقائد اور اتباعِ سنت کی نعمتِ کبریٰ سے بھی مشرف ہوئے ۔

مدارسِ اسلامیہ کی صحیح تعلیم و تدریس نہایت خلوص اور لگن کی متقاضی رہی ہے ۔ اسلاف نے اپنی شخصیت کی تشکیل و تعمیر، بالیدگی اور نشو و نما کے لئے علومِ دینیہ کی تحصیل کی اور حوائجِ ضروریہ کی تکمیل کے لئے دوسرے فنون کا اکتساب بھی کیا ہے چنانچہ موصوف نے بھی قرآن و حدیث کی تعلیم سے فراغت اور حصولِ سند کے بعد پھلواری شریف ہی میں علمِ طب کی طرف توجہ کی ۔

---

[1] بحوالہ ریاضِ سلیمان نمبر ص ۲۷

مولانا شاہ سید سلیمان اور حکیم وارث حسن سے اکتسابِ فیض کیا پھر مزید مہارت و کمال حاصل کرنے کے لئے پٹنہ جا کر حکیم محمد نصیر کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو گئے اور اس فن شریف میں اپنے آباو اجداد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے ۔

اگرچہ بدو شباب ہی سے علوم ظاہری کے اشتغال اور اساتذہ کرام کی محبت سے اتباعِ سنت کا اہتمام اور بدعات سے شدید اجتناب تھا لیکن باطنی اصلاح و تزکیہ کی مسلسل فکر و ضرورت اور تقاضے کی وجہ سے موصوف کی نظر شیخ کامل کی جستجو میں حیران و سرگرداں رہی بالآخر شاہ ابو احمد بھوپالی نقشبندی مجددی کی مقناطیسی شخصیت نے بیساختہ اپنی طرف کھینچ لیا قلبی اطمینان کے لئے اپنے والد کی طرح سفر اختیار کیا چنانچہ بھوپال میں زرِ خالص پا کر شاہ صاحب کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو گئے اور توحید مطلب میں ایسا رسوخ پیدا کیا کہ سب سے مستغنی ہو گئے ۔ حصولِ مقصد کے لئے پوری توانائی مرکوز کر دی اور ایسے ایسے مجاہدات کئے کہ معاصرین میں ان کا کوئی حریف نہ بن سکا ۔ مکاتیب مجددی[1] کے متبحر عالم اور دقیق النظر محقق و مفسر تھے اس استحضار کی وجہ سے بعض اہلِ علم نے تو حافظ مکتوبات ہی لکھ دیا ہے ۔ ان تمام کمالات اور امتیازات کے باعث شیخ کی اجازت سے مسندِ ارشاد پر بیٹھے[2] اور طبیب حاذق بن کر انسانیت کے ظاہری اور باطنی امراض کا علاج کرتے رہے چنانچہ مولانا گیلانی کا بیان ہے کہ

> "ان کی باطنی نسبت کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے وہ تو ایک مستقل داستان ہے ، بھوپال کے ایک نقشبندی شیخ طریقت شاہ ابو احمد رحمۃ اللہ سے وہ بیعت ہی نہ تھے بلکہ نقشبندی سلسلہ کے مجاہدات و ریاضات میں جو محنتیں انھوں نے برداشت کیں ہم تو شاید ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ان کا یہ ایک معمولی مجاہدہ تھا کہ جہاز سے اترنے کے بعد حج و زیارت کا سارا سفر پیادہ پا پورا فرمایا تھا ۔

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب

[2] تذکرہ سلیمان ص ۴۹

ولادت اور ابتدائی تعلیم

دیسنہ میں سید صاحب کا جدی مکان داؤد مرحوم کے مکان کے نام سے مشہور ہے لیکن حکیم سید ابوالحسن صاحب نے اپنی شادی کے بعد ایک علیحدہ مکان بنوایا تھا جو آج بھی گاؤں کی مسجد کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اس میں ان کے خاندانی ملازمین کے لواحقین آباد ہیں[3]۔ یہیں ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء[1] جمعہ کی صبح کو سید صاحب کی ولادت ہوئی۔ سید صاحب کی بڑی بہن کا کہنا ہے کہ وہ خوبرو اور میانہ جسم پیدا ہوئے تھے، چہرہ پرنور اور آنکھوں میں چمک نے دادا حکیم میر محمدی کو غیر معمولی محبت پر مجبور کیا چنانچہ موصوف نے بھی بچہ کا نام انیس الحسن اور کنیت ابو نجیب رکھی۔ یہی نہیں بلکہ فرطِ خوشی میں دعاؤں سے بھرا ہوا ایک قطعہ بھی موزوں فرمایا۔ یہ قطعہ ایسے وقت مسعود میں کہا گیا کہ دادا کی دعا کے مطابق سید صاحب اپنے وقت کے "نیّرِ تاباں" ثابت ہوئے۔ قطعہ درج ذیل ہے[2]

سعید حسن ہست فرزند من   شدہ بوالحسن نام نیکو خصال
خدا پیشِ عطا کرد نور بصر   کہ یعنی پسر شد بہ حسن و جمال
بشہر صفر چوں شدہ بود سنہ   جواں بخت آمد چو ماہِ ہلال
بروز آدینہ بوقتِ سعید   بیامد مثال گل نو نہال

---

[1] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۸ ـ ۹

[2] بیاض حکیم میر محمدی مملوکہ دار المصنفین اعظم گڑھ

[3] بحوالہ معارف، سلیمان نمبر۔ مضمون سید صباح الدین عبد الرحمٰن

تر آزار و آشوب چشم بدش　　نگہدارش آں ایزد لایزال
بدولت قوی باد و عمرش دراز　　کند شادمانی بہ ہر ماہ و سال
بہ اقبال و دولت کند سروری　　سرِ دشمنانش شود پائمال
نہادیم نامش انیس الحسن　　بود حافظش حضرتِ ذوالجلال
چو جستیم تاریخ او از خرد　　یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعۂ
شدہ مہر تاباں ز برجِ کمال

۱۳۰۲ھ

سید صاحب کے خاندان کے بیشتر افراد کے نام کے ساتھ "ابو" شامل ہوتا تھا، مثال کے طور پر والد ۔ ابوالحسن، چچا ابوتراب اور ابویوسف تھے اور بڑے بھائی کا نام ابوحبیب تھا۔ اسی مناسبت سے ابتداءً سید صاحب کو بھی ابونجیب کہا گیا لیکن تقدیر کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ نہ ابونجیب باقی رہا نہ انیس الحسن، بلکہ سید سلیمان کے نام سے زبان زد خاص و عام ہوئے البتہ موخرالذکر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے سید صاحب کے برادر زادہ مولانا ابوظفر ندوی کا بیان ہے کہ

> "آپ کے منجھلے چچا ابوتراب دہلی لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے اور آج[1] سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متاثر ہو کر سید احمد خاں کے ہم خیال ہو گئے تھے، انہی نے ان کا نام سلیمان رکھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گا تو لوگ اس کو "مسٹر سلومن" کہیں گے چنانچہ اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند فرما کر اپنا نام سید سلیمان قرار دیا۔
>
> لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی میں علامہ لندن گئے جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیش گوئی صحیح نکلی[2]

---

[1] ۱۹۵۵ء

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۷۸

صاحب تذکرہ سلیمان نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے تبدیلیٔ نام کا دوسرا سبب بیان کیا ہے۔ چونکہ اب اس کی تصدیق یا تردید ممکن نہیں اس لئے کسی تبصرہ کے بغیر غلام محمد صاحب کا بیان بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

> "ہوا یہ کہ میں اسی زمانے میں ایک رنگونی تاجر سلیمان ناخدا کا ایک جہاز بیرونی سامانِ تجارت سے لدا ہوا خلیجِ بنگال میں داخل ہوا اور اس کی آمد سے مشرقی ہندوستان میں ایک دھوم مچ گئی۔ گھر گھر میں ہر ایک کی زبان پر سلیمان کا نام آنے لگا۔ حکیم محمدی رحمۃ اللہ کے گھر میں بھی اس کا چرچا ہوا گھر والوں نے محبت سے ابونجیب کو پکارا کہ ہمارا سلیمان تو یہ ہے اور ایک دن اس کا بھی شہرہ گھر گھر ہو جائے گا یہ دراصل اتفاق ہی نہیں بلکہ ایک اتفاقی چیز تھی غیر شعوری طور پر انیس الحسن اور ابونجیب کے الفاظ ذہنوں سے محو ہو گئے اور جو نام اللہ تبارک و تعالیٰ کو پسند تھا وہی باقی رہا، مقبول ہوا، شہرت پا گیا۔ پھر جب سلیمان شعور کو پہنچے تو انھوں نے اپنا نام سید سلیمان لکھا۔[1]

اس کے حاشیہ میں موصوف نے لکھا ہے کہ

> "یہ وجہ تسمیہ میں نے خود حضرت والا سے سنی تھی اور بعد رحلت اس کی مزید توثیق حضرت کے صاحبزادے سید سلیمان سلمہ اور برادر زادہ جناب سید ابوعاصم صاحب سے حاصل کر لی ہے، مولانا ابوظفر ندوی نے جو حضرت والا کے برادر زادہ ہی ہیں جو وجہ تسمیہ بیان کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، موصوف کو تسامح ہو گیا ہے۔"

نام کی یہ تبدیلی سید سلیمان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ لفظ "ندوی" بھی جزو نام بن گیا۔ یہ ایک علمی نسبت ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سند یافتہ حضرات لگاتے ہیں۔ سید صاحب کے نام کے ساتھ اس کا شامل ہونا اس عہد کے ایک اور اہم نکتہ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ سید صاحب کے عہد میں بیک وقت پانچ سلیمان کمال شہرت کو پہنچے ہوئے تھے، مشہور صوفی شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین)، مولانا سلیمان اشرف بہاری (سابق صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، سر شاہ

---

[1] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۲۲

سلیمان (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) اور یہ مولانا سید سلیمان۔ سلیمانوں کے اس اجتماع میں نام کی تخصیص کا مقصد فوت ہی نہ ہوتا تھا بلکہ ایک کا نام سُن کر دوسرے کی شخصیت کے ذہن میں آنے کا احتمال رہتا تھا۔[1] سید صاحب نے اپنے نام کے ساتھ شروع میں وطنی نسبت دیسنوی کو اختیار کیا۔ ابتداء میں جو مضامین الندوہ اور معارف[2] میں شائع ہوئے ان میں سید سلیمان دیسنوی یا بہاری ہی لکھا ہے لیکن یہ نسبت بھی عارضی قرار پائی اور علم کی شمع کے اس پروانے کے ساتھ یہ علمی نسبت "ندوی"، اتنی لازم ہو گئی کہ اگر مولانا سید سلیمان ندوی کے اصل نام کو حذف کر کے صرف مولانا ندوی یا علامہ ندوی ہی کہا جاتا تھا تو بھی اصل مدعا واضح ہو جاتا تھا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ندوہ جس مقصد کے تحت قائم ہوا تھا، سید صاحب اس کے بہترین ترجمان تھے۔ وہ دیوبند اور علی گڑھ کے بین بین علومِ اسلامیہ کے جامع اور جدید علوم کے واقف کار و مزاج شناس تھے۔

سید صاحب کی تعلیم کا آغاز بھی شرفا کے بچوں کی طرح ہوا۔ سب سے پہلے بڑی بہن اردو کی ابتدائی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئیں، مولوی محمد یٰسین جو یٰسین چچا کے نام سے مشہور تھے، گاؤں کے ایک دوسرے لڑکے محمد حنیف کو پڑھاتے تھے، کچھ دن کے لئے سید صاحب کو ان کے پاس بھی بٹھایا گیا اور انھوں نے پارہ عم کی سورتیں یاد کیں، اس کے علاوہ ایک اور معلم خلیفہ انور علی کو بھی سید صاحب سے ابتدائی معلمی کی مناسبت رہی لیکن سید صاحب کے والد نے یہ محسوس کیا کہ ان مختلف اساتذہ کے یہاں بچے کی تعلیم و تربیت

---

[1] چنانچہ ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے۔ علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانے میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہاں موجود تھے انھوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب تشریف لائے ہیں اور فلاں جگہ مقیم ہیں تو شاہ سلیمان پھلواروی کو سمجھ کر ان سے ملنے آئے مگر ان کی جگہ ایک دوسرے سلیمان کو پایا۔

(مضمون مولانا ابو ظفر ندوی، معارف سلیمان نمبر)

[2] معارف اعظم گڑھ نہیں، بلکہ معارف علی گڑھ

حسبِ منشا نہیں ہو رہی ہے اور بچّہ کی استعداد بھی زیادہ بہتر توجہ اور رہنمائی کی طالب و محتاج ہے، چنانچہ موصوف نے سید صاحب کی خصوصی تربیت کے لئے ایک استاد کا باقاعدہ انتظام کیا۔ بقول مولوی نجم الہدیٰ۔

> "جلد ہی مولوی مقصود علی ساکن موضع اوکھدی ضلع پٹنہ خاص طور پر سید صاحب کی تعلیم کے لئے بلائے گئے ان کے آنے کے بعد ایک مکتب قائم ہوا جن میں میرے علاوہ سید مظاہر حسن مرحوم، حافظ عبدالصمد، محمد حنیف، صمد مرحوم، ملک رشید، عبدالقادر اور دو ہندو سنار کے لڑکے شریک ہوئے۔ سید صاحب نے کلام مجید مولوی مقصود علی صاحب سے ہی ختم کیا اور فارسی شروع کی اُن کے ساتھ ہی میں بھی آمد نامہ، کریما، نسخۂ تعلیمیہ، گفتگو نامہ اور گلستاں باب اول و دوم پڑھتا رہا۔ ہم لوگوں کی تعلیم اس مکتب میں ڈھائی سال رہی"[1]

مولوی مقصود علی مرحوم کی اس مکتبی تعلیم کے اختتام تک مختلف میدانوں میں سید صاحب کا ایک مخصوص رنگِ طبیعت ابھر کر سامنے آیا جس سے ان کے مزاج، دلچسپی اور اس وقت تک ان کی ذہنی رسائی اور صلاحیتوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

سید صاحب فطرۃً متین، سنجیدہ اور کم آمیز تھے۔ آخر عمر تک یہ صفات ان کی شخصیت کا جزو لاینفک رہیں۔ کبھی کبھی ان کی خاموش طبعی کی وجہ سے استاد انھیں کند ذہن اور غبی بھی کہہ دیتے تھے لیکن حقیقت اس کے برخلاف تھی، اس کے علاوہ موصوف کے اندر بچپن کے بعض دوسرے امتیازات اور شرارتیں بھی موجود تھیں۔ اگرچہ بچپن کی چند باتیں سید صاحب کی بعد کی زندگی سے مناسبت نہیں رکھتیں لیکن اس عجیب وغریب دور کی زندگی کے تضادات سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا اس سلسلے کی چند معاصرانہ شہادتیں درج ذیل ہیں۔ مولوی نجم الہدیٰ نے لکھا ہے کہ

---

[1] معارف نومبر ۱۹۵۹ء

"سید صاحب اپنے ہم مکتبوں سے نہ بے تکلفی سے ملتے اور نہ ہمارے کھیلوں میں شریک ہوتے۔ ہم لوگ چندہ کر کے کوئی چیز پکاتے تو اس میں شریک ہو جاتے لیکن چیزوں کی فراہمی میں دوڑ دھوپ کرنا پسند نہ کرتے تھے البتہ گاؤں کی ندی میں جب کبڈی ہوتی تو اس میں شریک ہو جاتے اور کبڈی اچھی کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگ کوئی تمثیلی ڈرامہ کرتے تو اس میں وہ بھی شریک ہوتے اور ہم ان کو ہیرو کا پارٹ دیتے"[1]

کبڈی اور ڈرامے سے دلچسپی کی تائید مولوی ابوظفر ندوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ان کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے تو وہ صرف تماشائی ہوتے یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کسی کھیل میں شرکت کی تو وہ کبڈی ہے"!

علامہ صغرسنی میں ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے۔ آپ کے والد، دادا، بھائی بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگوں کا پیشہ طبابت تھا۔ اس لئے گھر میں علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی نقل میں کبھی کبھی مختلف قسم کی شیشیوں میں پانی بھر کر بچوں کا علاج کرتے، ان کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتیں کہ کیا کر رہے ہو تو کہتے کہ بیماروں کا علاج کرتا ہوں لوگ کہتے کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا لیکن باوجود ان کے والد کی دلی تمنا کے یہ پیشن گوئی پوری نہ ہوئی[2]

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولوی محمد حنیف، جو مکتب خانے میں ابجد سے فارسی کی عام درسی کتابوں تک سالہا سال سید صاحب کے ساتھ پڑھتے رہے، بیان کرتے ہیں کہ

"ایام طفلی ہی سے فطرتاً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جبلی طور پر کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی اسی لئے شرارت

---

[1] معارف نومبر ۱۹۵۹ء

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۹۴

46911

وغیرہ کے قصوں میں سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے"۔ [۱]

بین السطور سے یہ بات مترشح ہے کہ اگرچہ شور و ہنگاموں اور شرارتی معاملوں میں سید صاحب پیش پیش نہیں رہتے تھے تاہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان میں شرکت سے گریز بھی نہ کرتے تھے وہ سیدھے سادھے اور بھولے بھالے نہیں تھے بلکہ بہت متحرک اور فعال تھے لیکن اپنی سمجھداری اور حکمتِ عملی کے سبب وہ بیشتر مواقع پر خاموش تماشائی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مولوی محمد حنیف نے ساری مکتبی شرارتوں کا بانی مبانی تو حکیم نجم الہدیٰ کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کبھی مشورہ دیتے کہ آج ندی زوروں پر جا رہی ہے۔ چلو! کرتے پاجامے اتار اتار کر ساحل کے کنارے سے ہم لوگوں کو کود جانے کا حکم دیتے۔ حکیم صاحب تیرنے سے واقف تھے۔ اس لئے تیرتے ہوئے وہ دور تک چلے جاتے اور ہم دونوں (یعنی سید الملت اور مولوی محمد حنیف) اس فن سے ناواقف تھے اس لئے کنارے پر ہی ہاتھ پاؤں مارتے رہتے۔ کبھی حکیم صاحب باغوں کی طرف بچوں کی توجہ منعطف کراتے، ایک دفعہ اس سلسلے میں ایک کافی اہم حادثہ بھی پیش آگیا، بیری کے درختوں پر حملہ کر دیا گیا تھا، ایک چھوکری بیروں کی حفاظت کر رہی تھی اس نے بچوں کو اس ظلم و تعدی سے روکنا چاہا، حکیم صاحب کو غصہ آگیا، جیب میں چاقو تھا غریب چھوکری کے کان پر اسے چلا دیا گیا۔ غالباً کل یا کچھ حصہ کان کا غائب ہو گیا۔ گاؤں میں اس واقعہ کی وجہ سے کافی سنسنی پھیل گئی۔ مقدمہ مولوی مقصود صاحب کے اجلاس میں پیش ہوا اور کھجور کی چھڑی سے ہر ایک پر مولوی صاحب نے حد جاری کی۔ مولوی محمد حنیف کا ہی بیان ہے کہ ایک مرتبہ گاؤں کے ایک بوڑھے کہار پر جب کھیت میں بے چارہ قضائے حاجت کے مشغلہ میں مصروف تھا، بچوں نے اس پر ڈھیلے چلانے شروع کئے جن میں سید الملت بے چارے بھی شریک تھے۔ کہار نے مولوی صاحب سے شکایت کی۔ اس جرائت بیجا پر مولوی حنیف صاحب کہتے ہیں کہ کافی مرمت مولوی صاحب کی چھڑی نے کی۔ [۲]

---

[۱] ریاض سلیمان نمبر ص ۲۲

[۲] ریاض سلیمان نمبر مضمون "سید الملت کی مکتبی زندگی"

ایک اور اہم واقعہ مولوی حنیف صاحب نے بیان کیا ہے جس میں مقلد کے بجائے سید صاحب نے امامت کا فرض ادا کیا تھا یہ واقعہ اس دور میں سید صاحب کے سیاسی مزاج کا بہت اہم ثبوت ہے وہ اس ڈرامہ کے ہیرو ہیں لیکن حسب دستور موقع پاکر صاف بچ نکلتے ہیں۔

مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ سید صاحب کی مکتبی زندگی میں بتیا بحث (بیت بازی) کا کافی رواج تھا۔ دستور کے مطابق سلیمانی مکتب کے بچے بھی اس میں کافی حصہ لیتے تھے۔ مشق کے لئے مکتب خانہ ہی میں بچوں میں دو فریق بن گئے، ایک کے امام سید الملت تھے اور دوسرے فریق کی قیادت حکیم مولوی سید نجم الہدیٰ ندوی کے ہاتھوں میں تھی۔ مولوی سید حنیف، سید صاحب کے زیر امامت کام کرتے تھے اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے سابق استاد مولانا محمد قاسم ندوی حکیم صاحب کے ذریات میں تھے حکیم صاحب نے نوادر اشعار کی ایک بیاض صیغۂ راز میں تیار کی تھی جس کا سید الملت کو کسی طرح سراغ مل گیا انھوں نے مولوی سید محمد حنیف کو آمادہ کیا کہ وہ مصنوعی طور پر ان کی پارٹی سے ٹوٹ کر حکیم نجم الہدیٰ کی پارٹی میں شریک ہوجائیں اور جس طرح بن پڑے نوادر اشعار کی یہ بیاض جس پر ان کو ناز ہے ان کو اڑانے کی کوئی تدبیر اختیار کریں چنانچہ چند روز میں ہی موصوف نے مولوی محمد قاسم صاحب سے یہ بیاض حاصل کر کے اپنے امام کے سامنے لاکر حاضر کردی اور پھر حسب دستور سلیمانی پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کردیا۔۔۔۔ اس پورے اسٹیج پر ہیرو سید صاحب ہی رہے ہیں[1]۔

بچپن کی اس ذکاوت وذہانت اور غیر معمولی فطانت کے ان واقعات نے سید صاحب کی علمی زندگی میں زیادہ پیچیدہ مسائل حل کرنے اور نت نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت وسلیقہ پیدا کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر انھیں صلاحیتوں کی بدولت وہ عیسائی مشنری اور اپنے دوسرے مخالفین کے سخت سے سخت حملہ کا دندان شکن جواب دینے کے قابل بن سکے۔

شعر وشاعری کا ذوق سید صاحب کو بیت بازی کی مذکورہ مجلسوں میں سرگرم شرکت

---

[1] ریاض حوالۂ مذکور

اور حاضری سے پیدا ہوا، اس کے نتیجے میں موصوف کو ہزاروں اردو فارسی کے اشعار یاد ہوگئے جس سے نہ صرف یہ کہ شاعرانہ مزاج بن گیا بلکہ شعر فہمی کے باب کھل گئے اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بیت بازی کے دوران دوسروں کے خود ساختہ اشعار کو وزن کرنے کے لئے تقطیع اور فن عروض سے اتنی دلچسپی ہوگئی کہ اس پر عبور حاصل کرلیا اور یہ چیز بھی ان کو شاعر بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ مولانا ابوظفر ندوی نے ان کی بیت بازی سے دلچسپی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "اسی سلسلے میں علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کردیا تھا اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی۔[1] چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی جس سے ان کو فن عروض پر اس قدر عبور ہوگیا تھا کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہوں گی۔[2]

مولوی مقصود علی کے یہاں تعلیم ختم ہونے کے بعد بڑے بھائی مولوی سید ابو حبیب کی سرپرستی میں جنھوں نے جلد ہی فراغت حاصل کرکے دلیسنہ میں مطب شروع کیا تھا، تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ موصوف سے فارسی میں گلستاں باب ہشتم، بوستاں، رقعات عالمگیری اور یوسف زلیخا وغیرہ پڑھیں اور عربی میں میزان منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور نحو میں شرح ملاجامی تک، منطق میں کبریٰ، میزان منطق اور تہذیب تک تعلیم پائی۔

مولانا سید ابو حبیب مرحوم نہ صرف جید عالم بلکہ اپنے وقت کے روحانی پیشوا اور مصلح بھی تھے، ان سے کسب فیض صرف کتابی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ سید صاحب ان

---

[1] بعد میں یہ بیاض دار المصنفین اعظم گڑھ کی ملکیت ہوگئی تھی۔ راقم الحروف کو وہاں کافی تلاش کرنے کے بعد بتایا گیا کہ افسوس اس کو تو کئی سال پہلے دیمک چاٹ چکی ہے۔

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۹۴

کی مجالس میں بھی شریک ہوتے اور عمر و استعداد کے لحاظ سے جتنا ممکن تھا فیض یاب ہوتے، یہی وہ زمانہ ہے کہ سلوک و احسان سے بھی مناسبت پیدا ہوئی جس کی تکمیل مرشد تھانوی کے ذریعہ ہوئی۔ غلام محمد صاحب نے لکھا ہے کہ

> "خود حضرت فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب کے حسبِ ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے اور ان کے حلقہ توجہ میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور ان کے فیضِ صحبت سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا لیکن باطنی پہلو اس دور میں کچھ اجاگر نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت میں بچہ تھا اور حصولِ علم مقدم تھا۔"[1]

سید صاحب کی تربیت کا جو مخصوص نظام بنایا گیا تھا اس میں مولوی سید ابو حبیب کے ہفتہ واری وعظ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ موصوف نے گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کی غرض سے اپنے گھر میں وعظ کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ اس میں مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان سید صاحب پڑھ کر سناتے اور موصوف اس کی تشریح فرماتے جاتے تھے۔ یہ کتاب تصفیۂ عقائد کے سلسلے کی اہم کتاب ہے، اس کا انتخاب خود بڑے بھائی کے مقصد کی غمازی کر رہا ہے۔ سید صاحب کی زندگی پر اس کا دائمی اثر یہ ہوا کہ ہر قسم کی موافق اور مخالف ہزاروں کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا اور متعدد بار ایمان متزلزل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن ہر جگہ تقویۃ الایمان کی تعلیم نے دفاع کیا اس کے متعلق اپنے مضمون "میری محسن کتابیں" میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "چونکہ میں بچہ تھا، فارسی ختم ہو کر میزان و منشعب شروع کی تھی قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی، میں ان بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویۃ الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

---

[1] معارف ص ۲۸۵ -

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی"

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۸-۹)

اس کے اثر سے ایمان میں پختگی، اتباعِ سنت کا شغف اور بدعات سے نفرت کا یہ حال ہو گیا کہ جب کوئی بدعت ہوتے دیکھتے تلملا اٹھتے لیکن جب بعض اپنے ہی بزرگ ان گناہوں کے مرتکب ہوتے، وہاں لب کشائی بھی ممکن نہیں تھی اس لئے ایسے مواقع پر تحریر کا راستہ اختیار کرنا پڑتا چنانچہ شاہ معین الدین احمد کے بقول سید صاحب کے ایک ساتھی، مولوی نجم الہدیٰ نے اس سلسلے میں ایک واقعہ سنایا۔

"اس زمانہ میں دیسنہ میں محرم کی بہت سی بدعات رائج تھیں، سادات دیسنہ تعزیہ داری کرتے تھے ہم دونوں (یعنی نجم الہدیٰ اور سید صاحب) میں مولوی سید ابو حبیب کی تعلیم و تلقین اور تقویۃ الایمان کے اثر سے اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ دونوں نے محرم کی بدعات کے خلاف ایک تحریر لکھی اور اس کو ایک لڑکے کے ہاتھ ایک خاندان بزرگ کے پاس بھجوا دیا۔ اس سے بڑی برہمی پیدا ہوئی۔ یہ تحریر سید نجم الہدیٰ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس لئے سارا نزلہ انھیں پر گرا اور اس کی یہ سزا ملی کہ ۲۵ مرتبہ کان پکڑ کر اٹھائے بٹھائے گئے اور سید صاحب صاف بچ گئے"[1]

مولوی سید ابو حبیب صاحب کچھ دن کے لئے اپنے مرشد کے یہاں بھوپال گئے تو سید صاحب اور مولوی نجم الہدیٰ نے مولانا بشارت کریم مرحوم سے پڑھنا شروع کیا وہ اس زمانے میں استھواں میں حافظ ملک شرف الدین کو حدیث شریف کا دورہ کرا رہے تھے۔ یہ دونوں روزانہ صبح

---

[1] حیات سلیمان ص ۶

کے وقت دیسنہ سے ایک میل کے فاصلہ پر استھواں جاتے اور سبق لے کر واپس آجاتے تھے۔

بڑے بھائی کی واپسی پر پھر انھیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں امرتسر کا اخبار "وکیل" پڑھا جاتا، جسے گاؤں کے لوگ دلچسپی سے سنتے۔ اس اخبار میں سرسید کی مخالفت میں پرزور مضامین نکل رہے تھے۔ مولوی نجم الہدیٰ لکھتے ہیں کہ "ان مضامین سے مجھے تو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی لیکن سید صاحب غور سے سنتے تھے"[1] اس سے سید صاحب کی ذہنی پرواز اور فکری ارتقاء کا پتہ چلتا ہے کہ اس کم سنی میں ہی سید صاحب کو علمی مباحث اور اختلافی مسائل سے مناسبت اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

۱۸۹۸ء میں حکیم سید ابو حبیب صاحب کے سفر حج پر جانے کی وجہ سے تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور سید صاحب کو ان کے والد ماجد اپنے ساتھ اسلام پور لے گئے اور تقریباً چھ ماہ تک تعلیم دی۔ حکیم صاحب آداب مجالس کی شمع بزم تھے، وضع داری نشست و برخاست رفتار و گفتار اور گفت و شنید میں بڑا وقار ہوتا تھا، موصوف کو بچوں کی اعلیٰ تربیت کا ہر وقت خیال رہتا تھا اسی مقصد سے مولوی مقصود علی کا تقرر کیا گیا تھا اور ان کی ہر طرح کی مدارات ہوتی تھیں اور ان سے سختی سے نمٹنے کی ہدایات دی گئی تھیں۔ مولانا گیلانی نے لکھا ہے۔

> "تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بقول مولوی حنیف صاحب سید الملت کے والد ماجد ہی کی کافی توجہ تھی، نشست برخاست، گفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی نامناسب بات بچوں سے سرزد نہ ہو اس باب میں ان کی نزاکت احساس کا یہ حال تھا کہ دسترخوان پر ایک دن جب سید الملت بھی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے، چلتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی دیکھا گیا کہ بے ساختہ ایک چپت رسید کی گئی۔ سید صاحب کے والد ماجد کہتے جاتے تھے کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہیئے۔ کھاتے ہوئے تو منہ سے آواز کتے نکالتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اخلاق و آداب کے جس شریفانہ معیار کو سید صاحب کی زندگی پیش کرتی رہی، اس معیار کے قائم کرنے میں مکتبی زندگی

---

[1] معارف نومبر ۱۹۵۵ء

کی ان کڑی نگرانیوں کو بھی غالباً دخل تھا۔[1]

سید صاحب کی آواز ہمیشہ سے پست اور دھیمی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ آخر تک یہی حال رہا یہاں تک کہ بیسیوں مذہبی اور سیاسی تقریریں اور خطبے بھی موصوف کو اس جادہ سے نہ ہٹا سکے۔ سید صاحب کے والد ماجد آواز کے بہت دھیمے پن کو پسند نہیں کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ گفتگو صاف ستھری اور واضح ہونی چاہیے۔ ایک بار حکیم صاحب نے سید صاحب سے کچھ پوچھا تو حسب معمول بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا مولوی نجم الہدیٰ لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب نے جھلا کر کہا منہ سے آواز کیوں نہیں نکلتی جی چاہتا ہے کہ تمہارا منہ نوچ لیا جائے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انجمن الاصلاح دیسنہ کا سالانہ جلسہ تھا جس کی صدارت حکیم سید ابوالحسن صاحب ہی فرما رہے تھے، اس موقع پر سید صاحب نے بھی تقریر کی جو سامعین نے پسند کی، اس تقریر کو سن کر حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ابو نجیب کو بولنا بھی آتا ہے۔

سید صاحب کو اسلام پور سے ۱۸۹۸ء میں پھلواری شریف بھیج دیا گیا۔ یہاں کی خانقاہ سلوک و طریقت اور ارشاد و ہدایت کے علاوہ دینی تعلیم کا بھی مرکز تھی۔ حکیم سید ابوالحسن صاحب یہاں کے سجادہ نشین شاہ علی حبیب نصر پھلواروی کے مرید اور خلیفہ تھے ان سے اور خانقاہ سے موصوف کا خصوصی تعلق تھا۔ سید صاحب کی تعلیم مولانا شاہ محی الدین مرحوم کے سپرد کی گئی جو اسی وقت فارغ ہوئے تھے۔ سید صاحب دیسنہ سے قدوری اور شرح تہذیب پڑھ کر آئے تھے۔ مولوی صاحب سے ہدایہ اور مولانا عبدالرحمٰن کاکوی صدر مدرس سے شرح تہذیب مولانا رحیم بخش سے، منطق اور مولانا شاہ معین الدّین سے شرح وقایہ پڑھی۔

درس کے علاوہ فارغ اوقات کو ضائع کرنے کے بجائے سید صاحب مفید کاموں میں صرف کرتے تھے چنانچہ زیادہ وقت اپنے اساتذہ خصوصاً مولانا محی الدّین کی صحبت میں گزارتے اور سب سے زیادہ پسندیدہ صورت یہ تھی کہ شعر و سخن کی مجلسوں میں شرکت کر لیں۔ یا اردو کی کوئی کتاب پڑھتے رہیں۔ بیت بازی کے ذریعہ شعر و شاعری کا جو ذوق دیسنہ میں پیدا ہوا تھا، پھلواری شریف کی علمی و ادبی فضا میں اس میں رسوخ پیدا ہوا اور خود بھی وقتاً فوقتاً شعر کہنے لگے

---

[1] ریاض ص ۲۲

یہاں کی شاعرانہ فضا میں سید صاحب کی مشغولیت کے متعلق مولوی نجم الہدیٰ نے لکھا ہے کہ

> " سید صاحب خانقاہ کی ایک کوٹھری میں مقیم تھے۔ کوٹھری کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبداللہ رہتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد معشوق صاحب شاعر تھے ان کے کمرے میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ سید صاحب اس مجلس میں ضرور شریک ہوتے۔ خانقاہ میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی سید صاحب ان میں بھی شوق سے شرکت کرتے[1]۔ ان کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا مگر اس پر جلا پھلواری شریف کے قیام میں ہوئی "۔ (معارف نومبر ۵۹ء)

مجالسِ شعر و سخن کے علاوہ اس زمانہ میں ہمعصر مصنفین کی تخلیقات کی طرف بھی میلان پیدا ہوا بالخصوص مولوی عبدالعلیم شرر کے ناولوں کو شوق سے پڑھا۔ شیریں بیانی کے علاوہ شرر کے ناولوں کے تاریخی موضوعات خصوصاً اسلام کے عہدِ عروج کی داستانوں کے بیان، مسلمان بادشاہوں کی شان و شوکت اور عظمت و جلالت کے اظہار اور زمانۂ حال میں ان کی پیش کش اور اثر آفرینی نے سید صاحب پر جادو کا اثر کیا اور انھیں اپنا گرویدہ بنالیا، یہی سید صاحب کی زندگی کا وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں انھیں اردو نثر کے ادبِ عالیہ سے دلچسپی اور لگاؤ شروع ہوا۔ شرر کے اس تاریخی

---

[1] پھلواری شریف میں قوالی کی محفلوں میں شرکت کے متعلق غلام محمد صاحب نے لکھا ہے کہ " سید صاحب خانقاہ کے مبتدعانہ رسوم اور ہفتہ وار قوالی وغیرہ سے بالکل مجتنب رہے "۔ راقم سے ایک بار فرمایا کہ جو رنگ بھائی صاحب کی مجالس میں چڑھ چکا تھا اس کا یہ اثر تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہو سکی۔

جب کہ مولوی نجم الہدیٰ کے مذکورہ بالا معاصرانہ بیان سے قوالی میں شرکت ثابت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قوالی میں شرکت بھی سید صاحب کے ذوقِ شعری کی تسکین کے لئے تھی، یہ کسی بھی طرح معتقدانہ یا ابتلائے رسوم کی نوعیت کی نہیں تھی اس لئے اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے سید صاحب کے معتقدات اور زہد و تقویٰ پر حرف نہیں آتا کہ انھوں نے پھلواری شریف کی قوالی میں شرکت کی۔ یوں بھی جوانی کا زمانہ تجربات و مشاہدات کی کثرتِ شوق کا ہوتا ہے۔

طرز اور شگفتہ بیانی نے ان کی ادبی فکر میں تلاطم پیدا کر دیا اور موصوف نے اپنے اس ناقابل فراموش تجربہ کو زندگی کے آخری برسوں میں بھی اس تاثر کے ساتھ بیان کیا ہے۔

> " یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی اس کے اثر سے قصبہ میں شعر و سخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، میں نے بھی اسی فضا میں سانس لی اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔[۱]

پھلواری شریف کی آمد سے پہلے ہی دارالعلوم ندوۃ العلما کا قیام عمل میں آچکا تھا لیکن داخلہ میں ابھی دیر تھی تو سید صاحب کو پھلواری شریف بھیج دیا گیا۔ ایک سال کے قیام کے بعد ۱۸۹۹ء میں دربھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کرا دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مرحوم کے ایک خلیفہ مولانا شاہ منور علی نے مرشد کی ہدایت سے دارالعلوم ندوہ کے خاکہ پر ہی یہ مدرسہ قائم کیا تھا، جس کا معیار اتنا بلند تھا کہ قلیل مدت میں ہی دور دور اس کی شہرت ہوگئی۔[۲] یہاں سے سید صاحب نے مولانا مرتضیٰ حسن دیوبندی سے ہدایہ جلد اول اور مولانا فدا حسین آروی سے شرح تہذیب کی تکمیل کی۔

دربھنگہ کے اس مدرسہ میں کتابوں کے اسباق کے علاوہ طلباء میں علمی ذوق و استعداد اور بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک انجمن بھی قائم کی گئی تھی جس میں ہر ہفتہ مجلس مکالمہ کا انعقاد ہوتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے کوئی عنوان دے دیا جاتا جس پر طلبہ تقریر کرتے یا اپنا مضمون پڑھ کر سناتے۔ سید صاحب کا علمی و ادبی ذوق پھلواری شریف میں کافی پروان چڑھ چکا تھا، اس کو عملی شکل میں لانے کا اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا تھا چنانچہ داخلہ لیتے ہی اس میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔ مولوی نجم الہدیٰ کا بیان ہے کہ

> " داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں ہم لوگوں کو اس میں شرکت کا موقع ملا اور عنوان " وقت کی قدر و قیمت " دیا گیا۔ گھر آکر ہم دونوں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا، مگر میں مشکل

---

[۱] و [۲] معارف جولائی ۱۹۵۰ء مضمون " جن سے میں متاثر ہوا " از سید سلیمان ندوی

سے دو صفحے لکھ سکا اور سید صاحب نے اتنی ہی دیر میں چار پانچ صفحے لکھ ڈالے اور اس کو مجلس مکالمہ میں پڑھا جس کی بڑی تعریف کی گئی اور بعد میں یہ مضمون رسالہ مخزن میں شائع ہوا۔" (معارف دسمبر ۵۹)

خود سید صاحب کا بیان ہے کہ

"یہاں سب سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی اور لوگوں کی تقریریں سنیں اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان سے ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی ۔

(معارف جولائی ۱۹۵۰ء)

کسی دوسرے جلسہ میں "تعلیم نسواں" کے عنوان سے مضمون پڑھا وہ بھی پسند کیا گیا اور اخبار "الپنچ" پٹنہ میں شائع ہوا۔

اگرچہ سید صاحب کی تصنیفی زندگی کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا لیکن پہلے مضمون کی سنہ اشاعت ۱۹۰۲ء (زمانۂ قیام ندوہ) ہے۔ اس لئے مناسب موقع پر ہی اس پر کلام کیا جائے گا۔

*

سید صاحب۔ ندوہ میں

طالب علمی کا دور

سید صاحب کی تعلیم ہنوز نامکمل تھی اور مزید تعلیم کا مسئلہ زیر غور تھا اس وقت ان کا قیام دربھنگہ میں تھا اس سلسلے میں مدرسہ احمدیہ آرہ[1] (بہار) اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخلہ کی تجویزیں سامنے آئیں۔ سید صاحب کے بعض اعزہ[2] ندوہ کی تحریک میں پہلے سے شریک تھے اس لئے ان کی رائے کی تائید کرتے ہوئے موصوف کا ندوہ جانا طے ہوا۔ اس زمانہ میں ندوہ کے سالانہ جلسے مختلف شہروں میں ہوا کرتے تھے، ۱۸۹۹ء کا جلسہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوا۔ جس میں سید صاحب، ان کے والد ماجد اور دوسرے اہم اعزہ بھی شریک ہوئے۔ اسی سے ندوہ میں داخلے کے ارادے کو تقویت ملی۔ اس جلسہ اور اس کے تاثر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا کہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا۔ یہ جلسہ کیا تھا، جوش و خروش کا ایک سمندر تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب

---

[1] مجلس ندوۃ العلماء کے اہم رکن اور مشہور اہل حدیث مولانا ابراہیم صاحب آروی (المتوفی ۱۳۲۲ھ) نے ندوہ سے پہلے اسی خاکہ پر آرہ میں عربی "مدرسہ احمدیہ" کھولا تھا۔ اس میں پہلی بار دارالاقامہ، جلسہ مذاکرۂ علمیہ اور انگریزی کی لازمی تعلیم کا اہتمام و انتظام کیا گیا تھا بعد میں یہ دارالعلوم بن گیا تھا، اب آرہ سے منتقل ہو کر یہ دربھنگہ آگیا اور اس کا نام مدرسہ احمدیہ سلفیہ رکھا گیا ہے۔

[2] سید صاحب کے رشتہ کے چچا حافظ تجمل حسین تحریک ندوۃ العلما کے ابتدائی اور اہم اراکین میں تھے۔ سید صاحب کے ندوہ میں داخلہ پر ان کا بھی بہت اصرار تھا۔

عمامے اور ہیٹ یکجا ہوئے علما اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم و ملت کی چارہ نوازی کی فکریں کیں، میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ جلسے میں شریک تھا۔ میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا میں نے اس جلسے میں یہ پُر اثر منظر دیکھا کہ کوئی پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے کہ جو خود بھی رو رہے تھے اور بڑے بڑے جبہ و دستار والے علماء و مشائخ کو بھی رُلا رہے تھے۔ اس جلسے میں سب سے پہلے میں نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ عبدالقادر (لاہور) کو دیکھا، اس وقت وہ آبزرور کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے بے انتہا پُر اثر تقریر کی اور مختلف مثالیں دے کر ندوۃ العلماء کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی جس نے پورے جلسے کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی جلسے کے اختتام پر میرے شوق نے بر و بال پیدا کئے اور میں اڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا۔[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب محض اپنے اکابر کے فیصلہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہی ندوہ نہیں گئے، بلکہ اس میں خود ان کے ذوق و شوق اور غیر معمولی دلچسپی اور خواہش کو بھی دخل تھا چنانچہ موصوف شوال ۱۳۱۹ھ (فروری ۱۹۰۱ء) میں ندوہ میں داخل ہوئے ان کے ماموں زاد بھائی مولوی سید نجم الہدیٰ کے ساتھ دوسری جماعت میں داخلہ ہوا۔ اس درجہ میں صرف و نحو کی آخری کتابیں، فقہ، فرائض، منطق اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، تیسرے میں فقہ اور منطق کے علاوہ ادب اور فلسفہ بھی تھا، یہ دونوں درجے مفتی عبداللطیف صاحب سے متعلق تھے، چوتھے درجے میں منطق، فلسفہ اور ادب کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے اسباق

---

[1] معارف جولائی ۱۹۵۰ء

شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب کے ذمہ تھے اس وقت تک یہ صرف چار ہی درجے تھے چاروں درجوں کے ادب کی تعلیم اور اس کی نگرانی مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے متعلق تھی۔ کلام تاریخ اور ادب کا بیشتر ذوق علامہ شبلی کا مرہونِ منت ہے جو ۱۹۰۵ء میں ندوہ پہنچے تھے۔

داخلے کے پہلے سال میں سید صاحب کا شمار معمولی طالب علموں میں رہا اور حساب میں کمزوری کی وجہ سے وہ "فرائض" سے گھبراتے تھے، سالِ دوم اوسط نمبروں میں پاس کرکے جب تیسرے سال میں داخل ہوئے تو ان کی بعض پرانی دلچسپی کی چیزیں ادب و عروض وغیرہ نصاب میں شامل تھیں اس سے اُن کے ادبی ذوق و صلاحیت کی تقویت کے سامان پیدا ہو گئے۔ البتہ دوسرے مضامین منطق، فلسفہ، فقہ وغیرہ میں تو ان کی حیثیت عمومی ہی رہی لیکن مولانا فاروق چریا کوٹی کے درس میں نمایاں نظر آنے لگے۔ عام اسباق کے علاوہ فارغ اوقات میں بھی وہ مولانا سے استفادہ کرتے رہتے مختلف مسائل پر بحث و گفتگو کو غور سے سنتے اور اُن کے غامض ادبی نکات کو وہ اپنی لوحِ ذہن پر محفوظ کر لیتے، عربی اخبارات و رسائل پابندی سے پڑھتے۔ غرض اس زمانے میں عربی ادب سے انھیں خاص شغف ہو گیا تھا۔ ان کی اس لگن اور ذوق کو دیکھتے ہوئے مولانا فاروق نے بھی ان کی جانب خصوصی توجہ کی اور اسی بنا پر انھیں "قیس" کا لقب عطا کیا۔ مولانا فاروق کے طریقۂ تعلیم اور سید صاحب کی ان دلچسپیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی نجم الہدیٰ نے لکھا ہے کہ

> " قصیدہ بردہ اور دیوان ابوالعتاہیہ کے اسباق میں جب کوئی نیا محاورہ یا فعل آجاتا جس کے مختلف صلات سے معنی میں تبدیلی ہوتی تو درس کے بعد مولانا ان محاورات اور افعال کی مختلف طریقوں سے مشق کراتے، کبھی اردو فقرے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے دیتے جس میں ان افعال و محاورات کا استعمال ہوتا کبھی اپنی طرف سے عربی جملے اردو میں ترجمہ کرنے کو کہتے اس طرح نئے عربی محاورات اور افعال کی مشق کراتے رہتے۔ میری کاپی بھر جاتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا مگر سید صاحب اس کو ضائع نہ کرتے اور مولانا چریا کوٹی کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھتے۔ مولانا شبلی کے سفرنامہ کے آخر میں جدید عربی الفاظ کا فرہنگ شامل ہے، سید صاحب نے اس کو بھی یاد کر لیا تھا اور لغت کی مدد سے ان کو حل کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی کے مصر سے جو اخبارات ندوہ میں آتے تھے ان کو

آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔

ہم لوگ جب متوسط درجہ میں آئے تو مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم عربی میں شائع ہوئی جس کے بارے میں غیر معمولی فصاحت و بلاغت کا دعویٰ تھا، سید صاحب نے اس نظم کو مولانا فاروق کے سامنے پیش کیا انھوں نے اس کی تمام ادبی خامیوں کو بلکہ معائب کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ موصوف اشعار جاہلیت اور کلام پاک کی آیتوں سے عربی کے طرز بیان، طرز ادا، موقع شناسی اور مخاطب کی صلاحیت کے موافق طرزِ کلام کی نوعیت کو سمجھاتے اور اس کا فرق بتلاتے سید صاحب مولانا چریا کوٹی کے ایک ایک حرف کو لکھ لیتے اور فرصت کے اوقات میں دیکھا کرتے مگر دوسرے طلباء کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔"[1]

غرض سید صاحب کی ذہانت و طباعی محنت اور علمی لگن ہر جگہ سے اکتساب فیض کرا دیتی تھی۔ دیسنہ، پھلواری شریف اور دربھنگہ کے ادبی ماحول و فضا اور تعلیم و تربیت کے بعد ندوہ میں امامِ فن مولانا فاروق چریا کوٹی کی خصوصی توجہات نے سید صاحب کے ادبی جوہر کو خوب پروان چڑھایا۔

یہاں اس بات کا اعتراف ناگزیر ہے کہ آگے چل کر شبلی نے جس پودے کو برگ و بار لانے کے قابل بنایا اصلاً اس کی آبیاری اور پرورش مولانا چریا کوٹی نے ہی کی تھی جس کے بغیر شبلی کے لئے یہ سب کچھ ممکن نہ تھا اس لئے سید صاحب کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں جہاں مولانا شبلی کا بہت بڑا ہاتھ ہے وہاں مولانا چریا کوٹی کا بھی ناقابلِ فراموش کردار رہا ہے اور شبلی کا فیض بھی دراصل بالواسطہ طور پر مولانا موصوف کا ہی فیضان تھا کیونکہ شبلی کو "علامہ شبلی" بنانے والے کا نام بھی مولانا فاروق چریا کوٹی تھا۔ سید صاحب نے مولانا فاروق سے تین سالہ استفادہ کے تاثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "یہاں (ندوہ میں) ہندوستان کی مشہور ہستی صدر مدرس، یعنی مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی تھی۔ یہ اپنے زمانے میں ادب و معقولات کے امام تھے ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ

---

[1] معارف نومبر ۱۹۵۹ء

تھا وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور پر پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے۔ صرف ونحو ادب وعروض، منطق وفلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے۔ یعنی کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پالیتا تھا۔ ان کے طرز تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا بہر حال ان کے طرز تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کردی کہ آنکھوں کے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہ آتے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی جس نے میرے دل ودماغ پر اثر ڈالا[1]
مولانا فاروق کے علاوہ دوسرے استاد جن کو سید صاحب سے خاص مناسبت تھی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول تھے وہ علم حدیث وہیئت میں رہنمائی فرماتے رہے اور ان دونوں علوم کی طرف سید صاحب کو ایسی رغبت وشغف ہوا کہ انھوں نے اپنا سب سے پہلا معیاری مضمون علم حدیث پر لکھا اسی طرح بعد میں ایک مضمون "علم ہیئت اور مسلمان"، لکھا یہ دونوں الندوہ میں شائع ہوئے۔ ناظم ندوہ مولانا سید عبدالغنی صاحب بھی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے مذکورہ مضامین انھیں کی تحریک اور خواہش پر لکھے گئے تھے۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی شفقتیں صرف پھلواری کے زمانۂ قیام تک محدود نہ رہی تھیں بلکہ ندوہ میں سید صاحب کی صلاحیت واستعداد دیکھ کر روز افزوں ہوتی رہیں۔

سید صاحب اپنی عادت کے مطابق شوروغل، ہنگاموں اور کھیل کود میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ پھلواری شریف کی طرح یہاں بھی ان کا تمام وقت مطالعہ، ادبی تفریحات اور سونے میں گزرتا تھا۔ ندوہ میں سید صاحب کی دوستی ان کے ہم مذاق اور عام طلبہ سے الگ تھلگ رہنے والے ایک ساتھی صدیق حسن خاں سے ہوگئی تھی، یہ صاحب مشہور شاعر جلیل مانکپوری

---

[1] معارف جولائی ۱۹۵۰ء

کے فرزند تھے، شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ ان کی خوب نشستیں رہتی ندوہ کی ادبی سرگرمیوں سے سید صاحب کے شعری ذوق کو مزید جلا ملی۔ وہاں شعر و سخن کا خوب چرچا رہتا، آئے دن مشاعرے ہوتے، داغ و امیر کے متبعین اور مقلدین کے درمیان ادبی معرکہ آرائی رہتی بیشتر لوگ داغ کا دم بھرتے تھے۔ سید صاحب کا شعری ذوق بالغ ہو چکا تھا، ماحول کے اثر سے انھوں نے بھی غزلیں اور نظمیں کہنا شروع کیں۔ وہ پابندی سے شعر و سخن کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ موصوف امیر مینائی کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ امیر کا دیوان مراۃ الغیب ہر موقع پر ان کی رہنمائی کرتا تھا۔

> "میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیر و داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلماً مولانا حفیظ اللہ صاحب جنھوں نے رام پور میں منشی امیر احمد مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور ان کے شعر سناتے تھے ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانکپوری کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق صاحب میرے ساتھ دار العلوم ندوہ میں پڑھتے تھے ان کے ذریعے سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گزریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا ان کا دیوان مرأۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا، دار العلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ چند ایک داغ کا روپ بھرتے تھے۔ مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا[1]

چنانچہ جب سید صاحب متانت و تہذیب کے ساتھ معاملہ بندی، رندی و سرمستی کے افسانوں کو رعنائی خیال، رعایت لفظی صحت زبان صفائی بندش، نزاکت تشبیہ اور لطافت استعارات کے اہتمام کے ساتھ مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تو صدائے تحسین بلند ہوتی، دوسری طرف جب رسالوں میں شائع ہوتیں تو اہل ذوق و نظر توصیفی خطوط لکھتے۔ غرض لکھنوی

---

[1] معارف حوالہ مذکور

طرز کی کامیاب پیروی کا یہ حال ہوگیا تھا کہ اگر کبھی صرف ایک ہی شعر سناتے، تو توقع سے زیادہ داد پاتے۔ مولانا ابوظفر ندوی نے، جو سید صاحب کے داخلۂ ندوہ سے صرف دو سال بعد دارالعلوم پہنچے تھے، لکھا ہے کہ

> " وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنی غزل بھی سناتے تھے ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے اور ان کے ساتھ چل پڑے۔ اس زمانے میں وہ ڈاسن کا جوتا، علی گڑھ نما پائجامہ، کرتا یا کف دار قمیص، شیروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی لے کر باہر نکلتے تھے، اس شان سے مشاعرہ میں پہنچ کر یہ بیٹھ گئے۔ اُن کی صورت شکل اور لباس دیکھ کر شمع ان کے سامنے بھی آئی۔ پہلے تو بہت پریشان ہوئے لیکن انتقال ذہن نے پریشانی سے بچالیا انھوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرے کی مطلق خبر نہ تھی ابھی احباب نے اطلاع دی فوراً اٹھا چلا آیا۔ البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے وہ عرض کرتا ہوں ؎
>
> سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی
> حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی
>
> یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی [1]

یہ رنگ مزید گہرا ہوتا رہا اور مولانا عبدالماجد دریابادی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ

> " سید صاحب سے رسم و ربط ایک مدت سے قائم تھا ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا کلام امیر کا حافظ نکلے گا، مراۃ الغیب کا آئینہ بردار اور صنم خانۂ عشق کا پرستار۔ یہ پہلی بار کھلا کہ یہ حضرت بایں زہد و تقویٰ

---

[1] معارف سلیمان نمبر ص ٥٢

اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے۔

> اب آخر زمانہ میں تو ان کا عام مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا لیکن جب شوقِ مطالعہ جوان تھا اور دن سن بھی جوانی کے تھے تو اردو کی غزلیات کیا معنی، ہزلیات کا دفتر بے معنی و با معنی ان کی انگلیوں کی نوک پر تھا۔ دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے کلیات پر کلیات ختم کر دیئے اور گلدستہ کا لفظ تو اب تشریح طلب ہو گیا ہے (اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے)، ایک زمانے میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے اور شہروں بلکہ قصبوں تک میں ان کے ورق ورق گل کی طرح کھلتے ہوئے اور سید صاحب تھے کہ ان کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے۔۔۔
> پٹنہ سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ میں سالہا سال قیام، جو کور کر رہ گئی تھی پوری ہو گئی، سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوشنوا خود بن گئے۔[1]

بقول غلام محمد "سید صاحب رمزی تلخص کرتے تھے"، لیکن اصل یہ ہے کہ یہ تخلص نہیں مصلحتہً ایک امر رمزیہ تھا۔

البتہ "سید" تخلص کے ساتھ ان کا کچھ کلام راقم الحروف کو ملا ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "ارمغانِ سلیمان" میں شامل نہیں ہے۔ بانکی پور پٹنہ کے ایک رسالہ "بہار"[2] کے اگست اور نومبر ۱۹۰۳ء کے شماروں میں سید صاحب کی دو غزلیں شائع ہوتی تھیں جو حسب ذیل ہیں۔

شعلۂ غم سے پسِ مُردن جو بھڑک جلتے ہیں
سنگ ہائے لحد کشتہ چٹک جاتے ہیں

ایسی توبہ سے تو بہتر ہے نہ توبہ کرنا
اور توبہ سے یہ میخوار بہک جاتے ہیں

یوں تو آتے ہی نہیں ہیں، جو وہ آتے بھی ہیں
زخم پر اور نمک میکے چھڑک جاتے ہیں

---

[1] معارف سلیمان نمبر ص ۲۲۰

[2] "بہار" کے یہ شمارے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

کچھ تو ڈریے کہ میرے سینے سے ہردم نالے
داد خواہی کے لئے سوئے فلک جاتے ہیں
کیا کہیں ہم کو مزہ کیا ہے مئے اشک میں بھی
آنسو پی جاتے ہیں جب رونے سے تھک جاتے ہیں
کیا کروں اس میں تو میری کوئی تقصیر نہیں
آپ آنکھوں سے مے کے اشک ٹپک جاتے ہیں
قطرۂ خونِ جگر ہجر میں ان کے سیدؔ
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں

خلق میں بدنام میرا نام ہے
عشق کرنے کا یہی انجام ہے
عاشقِ گیسو و رخ کو کیا خبر
کفر کیا ہے اور کیا اسلام ہے

مجھ سا کوئی بھی نہیں اہلِ وفا
مرتے دم تک لب پہ تیرا نام ہے
خود جفاؤں سے تم اپنی پوچھ لو ،،
کیوں کسی کی لاش پر کہرام ہے
دل ہمارا غم کا عادی ہو گیا
بے قراری جب سے ہے آرام ہے ،،
خود بتاتی ہے لحد کی بے کسی
یہ مزارِ عاشقِ ناکام ہے ،،
لاش پر سیدؔ کی بولی بے کسی
عاشقی کا بس یہی انجام ہے ،،

ندوہ کے دورانِ قیام سید صاحب نے ترکیب بند پر بھی طبع آزمائی کی اور اپنے ایک عزیز سید صغیرالحق کی وفات پر وہیں مرثیہ بھی لکھا تھا۔ یہ دونوں "الپنچ" پٹنہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے[1]۔ بہرحال ندوہ کی تعلیم کا زمانہ شعر و ادب کے شغل کے لحاظ سے سید صاحب کے لئے پوری طرح سازگار رہا اور یوں تو اس کے اثرات زندگی بھر رہے لیکن ۱۹۲۰ء تک یہ رنگ پوری شوخی اور تابانی کے ساتھ ان کے کلام میں موجود رہا۔

سید صاحب کے دوست صدیق حسن خاں اپنے والد کے ساتھ سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے یہاں جاتے رہتے تھے، ان کے ساتھ سید صاحب کی بھی آمد و رفت ہو گئی۔ اودھ پنچ کے صفحۂ آخر پر "آزاد اخبار" کے نام سے ایک ضمیمہ شامل ہوتا تھا جس میں بیرونی ممالک کی خبریں دی جاتی تھیں، سجاد حسین صاحب نے سید صاحب کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور ان سے

---

[1] ترکیب بند ۲۱ نومبر ۱۹۰۴ء، ۲۵ جنوری ۱۹۰۵ء - مرثیہ ۴ فروری ۱۹۰۴ء

کچھ نہ کچھ کام لیتے رہتے تھے۔ خصوصاً عربی اخبارات سے ترجمہ کرکے اس کالم کے لئے خبریں فراہم کرنے کی ذمہ داری کچھ عرصہ تک سید صاحب کے ہی سپرد رہی۔ دربھنگہ کے زمانۂ قیام میں سید صاحب نے جو مضامین لکھے تھے وہ ۱۹۰۲ء میں مخزن لاہور اور الپنچ پٹنہ میں شائع ہوئے تھے سجاد حسین سے وابستگی کے بعد مولانا عبداللہ عمادی مدیر "البیان" (عربی) سے بھی علمی تعلقات ہو گئے تھے اور ان کے رسالے کے لئے بھی سید صاحب مضمون لکھتے جس سے ان کی علمی و ادبی صلاحیتیں عیاں ہونے لگی تھیں۔

سید صاحب کی محنت و مطالعہ زبان زد خلائق ہو گئی تھی اگرچہ ان میں غیر معمولی ذہانت اور چستی نہیں تھی تاہم کسبی کمالات میں ان کا کوئی حریف بھی نہ تھا۔ وہ ہر وقت کتابوں اور اخباروں کے مطالعے میں مصروف و منہمک رہتے۔ عربی کے جو اخبارات آتے ان کا پابندی سے مطالعہ کرتے، مطالعہ میں وسعت اور تنوع پیدا کرنے کے لئے انھوں نے ایک علمی جماعت بنالی تھی جس کے اہم ارکان میں حافظ صدیق حسن خاں اور عثمان پاشا مونگیری شامل تھے۔

> "ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے ہیں، طلسم ہوش ربا تک کو اسی توجہ سے پڑھا تھا۔ چندہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا۔ یاد نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا۔ غالباً کچھ پانی بھی برس رہا تھا اسی عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سناتے جاتے تھے جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں۔ پورا راستہ تفریحی بن گیا۔۔۔۔ جب کبھی حاضر ہوا کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا۔

ان کے گوناگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے کام لینے کو دخل رہا۔ فطری ذہانت وذکاوت، طباعی وجودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے ندوہ میں سید صاحب سے پہلے خود ان کے ساتھ اور ان کے بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین وطباع طلبہ داخل ہوتے رہے لیکن سید سلیمان ندوی بننے میں سب پیچھے رہے۔ ان کے کسب وطلب کا ہی کمال تھا ان کی طالب علمانہ و عالمانہ زندگی و سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے۔ [1]

---

[1] بحوالہ معارف سلیمان نمبر ص ۱۰۸

دربھنگہ کے مدرسہ میں سید صاحب نے عام عربی مدارس کی روایات سے نادر ایک "انجمن مکالمہ"، دیکھی تھی جس میں طلبا مقالے پڑھتے، تقریریں کرتے اور مختلف موضوعات پر مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔ سید صاحب نے بھی اس میں سرگرم حصہ لیا تھا اور وہ اس کے خاطر خواہ فوائد سے متاثر تھے، وہ ایسی ہی ایک انجمن ندوہ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس جذبہ میں بھی شدت آتی رہی اور ۱۹۰۴ء کے شروع میں تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس میں طلبہ کو تقریر و تحریر کی مشق کرائی جاتی تھی۔ جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا تھا۔ کبھی مہتمم صاحب یا کوئی دوسرا مدرس یا کبھی کبھی درجۂ آخر کا کوئی موقر طالب علم اس کی صدارت کرتا۔ نظامت ہمیشہ سید صاحب ہی کرتے۔ وہ خود بھی بہترین مقررین میں سے تھے لیکن آواز دھیمی اور لہجہ میانہ ہونے کی وجہ سے جذباتی اور شعلہ فشاں تقریر نہیں کرتے تھے بلکہ متانت کے ساتھ نفس مضمون کو واضح کرتے چلے جاتے تھے۔

ذوق مطالعہ اور مذکورۂ بالا گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر سید صاحب کو "دار الاخبار" اور "دار المطالعہ" کا ناظم بنا دیا گیا تھا۔ جہاں ان کا عربی مطالعہ مضاعف ہوتا رہا اور وہ موقع بہ موقع مختلف قسم کے امتحانات اور آزمائشوں میں کامیاب بھی ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔

۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک مہدی علی خاں معائنہ کے لئے ندوہ پہنچے، سید صاحب نے ان کی شان میں عربی میں ایک قصیدہ لکھ کر سنایا، نواب خوش تو ہوئے لیکن انھوں نے کہا کہ میں پرانی عربی دانی کا قائل نہیں، عربی کے کسی اخبار کو پڑھ کر اس کا مطلب بتا دیں تو ندوہ کا امتیاز ظاہر ہو۔ اس زمانہ میں مصر سے "المؤید" اور "اللوا" اخبار آتے تھے وہ منگا کر نواب صاحب نے ایک مضمون پڑھنے کو کہا۔ سید صاحب نے اسے پڑھ کر بآسانی اس کا مطلب بیان کر دیا اس سے وہ بہت خوش ہوئے اور جب معائنہ کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں سید صاحب کے لئے توصیفی کلمات لکھے اور مدرسہ کے ناظم شاہ سلیمان پھلواروی نے فرط مسرت میں یہ پیش گوئی کی کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان سرزمین ہند میں علم و

ادب کی خدمت کرتا رہے گا۔ اس امتیازی کامیابی نے سید صاحب کے اندر ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اور وہ جدید عربی پر عبور حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے۔

> "اس کامیابی نے مجھے جدید عربی سیکھنے اور اس کی مشکلات حل کرنے کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ کر دیا۔ پھر جب مولانا (شبلی نعمانی) ۱۹۰۵ء میں ندوہ میں آکر مقیم ہوئے تو ان کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار و رسائل آیا کرتے تھے جن کو میں بالالتزام پڑھتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی ہے"[1]

مولانا شبلی سے وابستگی: مولانا شبلی علی گڑھ کالج سے سبکدوش ہونے (۱۸۹۸ء) کے بعد ریاست حیدرآباد میں سررشتۂ علوم و فنون میں ناظم ہو گئے تھے۔ قیام ندوہ کے سلسلے میں موصوف نے جو کوششیں کیں۔ ان کا سب کو اعتراف تھا اور منتظمین کی یہ خواہش تھی کہ وہ معتمد بن جائیں لیکن شبلی بعض ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے ایک طرف تو اس پیش کش کو ٹالتے رہے مگر دوسری طرف ندوہ کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کی فکر میں لگے رہے۔ ندوہ میں اس وقت تک قدیم نصاب پڑھایا جاتا تھا وہ اس سے اظہار بیزاری کرتے رہے انھیں اس نصاب کی موجودگی میں ندوہ کی کچھ وجہ جواز نظر نہیں آتی تھی انکا خیال تھا کہ یہ نصاب تو عام طور پر مروج ہے۔ جبکہ ندوہ اس مقصد سے قائم ہوا تھا کہ طلباء عربی کی مکمل تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم و ادبیات سے نصابی طور پر استفادہ کر سکیں انھیں اس بات پر حیرت تھی کہ جدید نصاب منظور ہو جانے اور بار بار کے وعدوں کے باوجود اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا۔ انھوں نے اس کی اصلاح و تبدیلی اور نئے نصاب کے نفاذ کی بار بار تاکید کی لیکن بے اثر رہی اساتذہ اور منتظمین انگریزوں کی مسلم مخالف پالیسیوں کی وجہ سے نئے نصاب کو رائج کرنے میں طرح طرح کے خدشات میں مبتلا تھے اور یہی وجہ تھی کہ یہ نیا نصاب نافذ نہیں ہو سکا تھا۔ شبلی ان وجوہات کو معلوم کرنے کی غرض سے

---

[1] حیات شبلی ص ۴۲۲

ستمبر میں خود لکھنؤ آکر قیام پذیر ہوئے اور کئی ہفتہ تک اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے نومبر ۱۹۰۴ء میں وہ واپس چلے گئے۔ مجلس انتظامیہ کے اصرار پر انھوں نے فروری ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ دی اور اپریل ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے معتمد ہوکر مستقل طور پر لکھنؤ آگئے۔

ندوہ میں شبلی کی آمد پر طرح طرح سے خوشیاں منائی گئیں اور مختلف انداز سے ان کا استقبال کیا گیا ان میں جلسوں کا انعقاد، مشاعروں کا اہتمام وغیرہ شامل ہے۔ مختلف لوگوں نے اپنے مخصوص انداز سے اظہارِ تہنیت کیا۔ سید صاحب نے بھی "شبلی نعمانی" کے عنوان سے ایک طویل فارسی قصیدہ لکھ کر انجمن میں پڑھا۔ اس قصیدے کا رنگ فارسی کے کلاسیکی شعرا کا مدمقابل ٹھہرتا ہے اس نوعمری میں سید صاحب کی فارسی شاعری پر مضبوط گرفت کا ثبوت اس قصیدے سے فراہم ہوتا ہے۔ قصیدہ کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے۔

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغ طورِ ایمانی

دلیل فضل ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد
بر پیش مور سر نہی کہ ہمنامِ سلیمانی

مولانا شبلی نے ندوہ آکر اس کی اصلاح و ترقی کے لئے بہت سے عملی اقدام کئے۔ عربی نصاب میں بھی اہم تبدیلیوں کے علاوہ انگریزی کو لازمی قرار دیا۔ آریوں کے حملوں کا جواب دینے کے لئے سنسکرت پڑھانے کا انتظام کیا، علومِ جدیدہ میں فلسفہ، نفسیات وغیرہ کو بقدرِ ضرورت داخل کیا، عربی ادب کی طرف خصوصی توجہ کی، طلبہ میں تحریر و تقریر کا ذوق پیدا کرنے کے لئے مختلف قدم اٹھائے، کتب خانے کو وسیع کیا، رسالہ "الندوہ" کی بطورِ خاص نگرانی کر کے اسے اعلیٰ معیار کا جریدہ بنا دیا وغیرہ وغیرہ۔

ان کی خواہش تھی کہ طلبا میں سے اچھے اور ذی استعداد افراد کا انتخاب کر کے ان کی بہترین تربیت کی جائے، ایسے لوگ پیدا کئے جائیں جو ایک طرف ندوہ کا نام روشن کریں

اور دوسری طرف نئے حالات میں علم دین کی بھرپور خدمت کرسکیں۔

> "میں چاہتا ہوں کہ دو چار طلباء اپنے ساتھ رکھوں، کسی فن کی ان کو تکمیل کرادوں ان میں سے جن میں تصنیف کا مادہ ہو، ان کو تصنیف کے لئے تیار کیا جائے۔
>
> میں صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت و سیرت دونوں عالمانہ ہوں"[1]

اس کے لئے انھوں نے طلبہ میں غیر معمولی دلچسپی لینی شروع کی، اچھے اور ہونہار طلباء کا انتخاب کیا۔ مولوی ضیاء الحسن علوی (سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)، سید سلیمان ندوی اور بعد میں مولوی عبدالسلام اس زمرہ میں داخل ہوئے۔ سید صاحب کی مشہور عام محنت اور تعلیمی ریکارڈ کے علاوہ ایک اور جاذب نظر بات یہ سمجھی گئی کہ ماضی کی روایات کے برخلاف انجمن مکالمہ کے اعلانات سید صاحب عربی میں لکھ کر لگاتے، شبلی نے دیکھا تو ان کی نظر وہیں رک گئی، سید صاحب کو طلب کیا گیا اور وہ حلقۂ توجہ میں شامل ہو گئے۔

یوں تو شبلی کا خصوصی درس بلاغت قرآن سبھی ذی استعداد اور دلچسپی رکھنے والے طلباء کے لئے عام تھا لیکن شبلی اس میں جس قدر محنت کراتے تھے اور اصول بلاغت پر جو نوٹس دیتے تھے ان پر عبور حاصل کرنے میں دوسرے لوگوں کے علاوہ سید صاحب اور مولوی ضیاء الحسن علوی پر محنت و ذمہ داری کا بار کچھ زیادہ ہی تھا دوسرے سب ساتھی تو رفتہ رفتہ تھک کر ساتھ چھوڑتے گئے، اور آخر میں صرف علوی صاحب اور سید صاحب باقی رہے۔ ان دونوں سے مولانا شبلی جدید عربی کا بھی زیادہ سے زیادہ کام لیتے تھے جس نے انھیں عربی ادب میں یکتائے روزگار کی حیثیت عطا کی، سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "مولانا نے دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی چند ہونہار طالب علموں کو اپنے گرد جمع کرلیا ان میں سب سے پہلا نام ہمارے مخلص دوست ضیاء الحسن علوی کاکوروی کا ہے مولانا کے پاس مصر و شام کے عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی رہتی تھیں وہ سرمایہ انھوں نے ہم لوگوں کے حوالے کیا اور ان میں بعض بعض مضامین کی

---

[1] مکاتیب شبلی جلد اول ص ۵

تلخیص اور ترجمہ کی ہدایت کی۔ چنانچہ ضیاء الحسن صاحب کو مصر کا فلسفیانہ رسالہ المقتطف دیا جس میں انھوں نے عمر اور صحت کی تدابیر کے مضمون کا ترجمہ کیا جو دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں چھپا۔ مجھے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ حوالہ کی اور اس کی تلخیص کی ہدایت فرمائی جس کی تعمیل ہوئی۔ یہ مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں نکلا اور پسند خاطر ہوا۔"[1]

ندوہ میں سید صاحب کے ساتھی اور بعد میں شاگرد مولانا عبدالباری ندوی کا بیان ہے کہ

کسبی کمالات اور صلاحیتوں میں سید صاحب کا کوئی حریف نہیں تھا۔ چنانچہ وہ تمام تر فارغ اوقات شبلی کی صحبت و استفادہ میں گزارتے، عربی کے جو اخبارات و رسائل آتے ان کا پابندی سے مطالعہ کرتے۔ اس وابستگی کے بعد سید صاحب مختلف انجمنوں کی نظامت سے بھی سبکدوش ہو گئے اور استاد کا دامن مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے علاوہ مضمون نویسی کے اسلوب میں شبلی کے اثر سے نمایاں تبدیلی آئی، مولانا فاروق چریاکوٹی کی شاگردی کے نتیجہ میں وہ عربی ادب کے علمائے متاخرین کے طرز کو پسند کرتے تھے، شبلی نے دلائل الاعجاز، نقد الشعر اور حماسہ کو نصاب میں داخل کیا تو متقدمین کا صحیح مذاق پیدا ہوا اور ان کی معصومیت کا رعب دل سے نکل گیا اس کے بعد کئی کتابوں پر تنقید لکھی جس میں ہندوستان کے قدیم مشاہیر کے تسامحات کی بھی نشاندہی کی۔

جدید عربی کی استعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا لکھنؤ کے عربی رسالہ "البیان" اور مصر کے "المنار" میں مضامین کی اشاعت کے ساتھ ہی عربی کی علمی و ادبی دنیا میں شہرت کا آغاز ہوا اور موصوف کی طرف اہل نظر کی توجہ بھی منعطف ہوئی۔ ادبی علوم کے پہلو بہ پہلو سید صاحب درسی اور معاون کتابوں کے مطالعہ سے بھی غافل نہیں رہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں وہ مولانا حفیظ اللہ صاحب سے موطا امام مالک اور بخاری شریف پڑھ رہے تھے تو اسی وقت انکی شرحیں اور حواشی خصوصاً حافظ ابن حجر کی فتح الباری بھی اپنے مطالعہ میں رکھتے فتح الباری نے فن حدیث میں خاص ذوق پیدا کر دیا جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر دوسری کتابیں مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی کا رسالہ عجالۂ نافعہ حافظ ذہبی کا تذکرۃ الحافظ اور بستان المحدثین وغیرہ کتابیں پڑھیں اور حدیث

---

[1] حیات شبلی ص ۴۲۳

رجال پر اتنی گہری نظر ہو گئی کہ الندوہ کے لئے "علم حدیث" پر ایک مضمون بھی شائع ہو گیا۔ امام مالک کے گرویدہ اور معتقد بن گئے یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد ۱۹۱۷ء میں "حیات امام مالک" وجود میں آئی۔

"تذکرۃ الحفاظ سے طبقات وتراجم اور تاریخ کا ذوق پیدا ہوا اس کے بعد انھوں نے ابن ندیم کی الکتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی "وفیات الاعیان"[1] کا مطالعہ کیا موخر الذکر تو اتنی مرتبہ پڑھی کہ بقول خود "اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اول وآخر کے صفحے بھر گئے"۔"

شبلی سے وابستگی کے بعد علم کلام سے متعلق ان کی کتابیں پڑھیں اور مطالعہ کے اس جانباز سپاہی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں جن دوسری تصانیف کے حوالے دیئے گئے تھے وہ سب بھی پڑھ ڈالیں۔ مثال کے طور پر عبدالکریم شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ۔

اس زمانہ میں اردو ادب کا شوق سرد پڑ گیا تھا۔ زیادہ تر عربی کی کتابیں زیر مطالعہ رہیں ان میں بھی غالب حصہ تاریخ وادب سے متعلق تھا چنانچہ اس کے بعد لکھے ہوئے مضامین کا رنگ بھی تاریخی اور علمی ہے، تلاش وتحقیق کے جراثیم نمایاں نظر آنے لگے، فکر ونظر میں گہرائی اور گیرائی آنے کے سبب معیاری مضامین کی تصنیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور تحقیق وتدقیق کا یہ حال ہو گیا کہ معمولی جزئیات پر بھی گہری نظر رہتی تھی۔

سید صاحب کے اس غور وفکر اور دقت نظری نے انھیں شبلی کا محب بنا دیا اور ان کے ذوق مطالعہ پر شبلی کو اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ درجہ سے غیر حاضری پر بھی خوش ہوتے تھے

"ایک مرتبہ سید سلیمان کے خلاف کچھ طلبا نے شبلی سے شکایت کی کہ وہ درجہ سے غیر حاضر ہیں۔ اس پر علامہ نے خفا ہو کر کہا جاؤ کتب خانے میں دیکھو جب کلاس سے غیر حاضر پاؤ تو یقین رکھو

---

[1] ابن خلکان کی کتاب وفیات کا یہ نسخہ دار المصنفین میں برسوں رہا۔ سید صاحب نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کراچی منگا لیا تھا۔ حیات سلیمان ص ۲۲

کہ وہ کتب خانے میں مطالعہ کر رہا ہوگا، سلیمان درس و تدریس سے اتنا بلند ہو گیا ہے کہ علم کی تشنگی صرف کتب خانے سے ہی بجھ سکتی ہے۔

علمی و ادبی مطالعہ نے جہاں سید صاحب کو ایک متبحر عالم اور دقیقہ رس مصنف بنایا وہیں شبلی کے اثر سے تقریری صلاحیتوں میں بھی چار چاند لگ گئے۔ اردو عربی میں شبلی کی نگرانی میں تقریریں ہوتیں، بالخصوص عربی تقریر کی مہارت میں شبلی کا ناقابل فراموش حصّہ ہے۔ انھوں نے اس میں اتنی محنت کی کہ تھوڑے ہی دنوں میں برجستہ عربی تقریر پر عبور حاصل کر لیا اور ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی سید صاحب کو زبردست امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔

مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں ندوہ کا سالانہ جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا۔ اس میں ندوہ کے موافقین و مخالفین اور علمائے قدیم و جدید ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ انھیں میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو مختلف مواقع پر ندوہ کو مختلف طریقوں سے آزماتے رہے تھے۔ اس سلسلے کا ایک سنہرا موقع یہ بھی تھا۔ مولانا شبلی نے اس جلسے میں تقریر کرنے کے لئے اپنے سالِ آخر کے اور سند پانے والے دو طلبہ ضیاء الحسن علوی اور سید سلیمان کو منتخب کیا تھا اور تقریر کا موضوع بھی بتا دیا تھا۔ پروگرام اور استاد کی ہدایات کے مطابق یہ لوگ اردو میں تقریر تیار کر کے لائے تھے۔ ضیاء الحسن علوی تقریر کر چکے تو مقرر دوم سید سلیمان نے تقریر شروع کی۔

> ” عین راقم کی تقریر کے اثناء میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ تقریر عربی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں۔ مولانا (شبلی) حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا۔ مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو۔ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کی تقریر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانے میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے انھوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی" میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کئے، ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، استاد مرحوم نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا"۔[1]

مولانا شبلی نے اس کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھا کہ

> "جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت عربی زبان میں اس پر لکچر دوں گا۔ غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل، فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محو حیرت تھا اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی"۔[2]

اسی تاثر کو اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ شبلی نے مارچ ۱۹۰۷ء کے الندوہ کے شذرات میں بھی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد متعدد مواقع پر سید صاحب نے برجستہ تقریریں کر کے ندوہ کا نام روشن کیا اور موصوف کی ان ہی عربی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ایک صاحب نے شبلی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ عربی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم و تکمیل کے لئے ندوہ کی جانب سے مولوی سید سلیمان ندوی کو مصر بھیجا جائے جیسے گورنمنٹ ہندوستان سے وظیفہ دے کر اسکالرس کو انگلینڈ وغیرہ بھیجتی ہے، لیکن مصری سیاست اس وقت ہندوستان کے موافق نہ تھی اس لئے انگریز گورنمنٹ نے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی۔[3]

---

[1] حیات شبلی ص ۵۰۴

[2] مکاتیب شبلی شیروانی، نمبر ۹

[3] الندوہ دسمبر ۱۹۰۷ء

۱۹۰۷ء میں سید صاحب ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے مطالعہ و تحقیق اور تقریر و تحریر کے مذکورہ تمام خصائص سے قطع نظر اس عمر تک سید صاحب کی شخصیت جن عناصر سے مرکب کہلانے کی مستحق تھی ان میں اساتذہ کی صحبت، مجلس شعر و سخن اور دوسری ادبی مجلسوں میں شرکت اور موصوف کا غلبۂ نیند بھی شامل ہیں۔ موخر الذکر کے علاوہ تمام عنوانات پر گذشتہ صفحات میں گفتگو ہو چکی ہے لیکن ان کی نیند سے متعلق بعض بڑی دلچسپ حکایتیں بھی ملتی ہیں جن سے موصوف کا ایک اور رنگ طبیعت سامنے آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی عادت کی پسندیدگی کی خاطر وہ ہر چیز سے مستغنی ہو جاتے تھے۔ سید صاحب کی آواز تو ابتدا سے ہی دھیمی تھی۔ طبیعت میں بھی کچھ سستی تھی مزید برآں رات کو دیر تک مطالعہ کرنے کی وجہ سے صبح کو ناشتہ کے لئے صحیح وقت پر نہیں پہنچ پاتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کا "پیالہ"[1] عموماً بند رہتا تھا۔ مزاج میں غیر معمولی چستی رہتی، میانہ روی، اور توازن کے ساتھ محنت و مشقت تو انھیں گوارا تھی لیکن جذباتیت، جوش اور بے اعتدالی ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ مزاج کی اس سستی اور مستی سے سوتے رہنے کی عادت نے سید صاحب کو کاہل مشہور کر دیا تھا۔ اس کے لئے "پوستین" (افیونی) کی اصطلاح ان پر چست کی جاتی تھی اور ان کے "پیالہ" کی قربانی کا ذمہ دار بھی اسی کو قرار دیا جاتا تھا لیکن سید صاحب لوگوں کے طعن و تعریض سے بے نیاز اپنے معمولات میں مگن رہتے تھے۔

ندوہ میں سید صاحب کے معاصر اور ہمیشہ کے بہت قریبی دوست مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے مضمون "سیرۃ السید" میں جن باتوں پر زور دیا ہے ان میں درج ذیل امور خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں جو سید صاحب کی شخصیت کو بنانے میں ہر ہر قدم پر معاون ثابت ہوئے۔

---

[1] "پیالہ" سے مراد بکرے کا گوشت اور گھی کے تار والا پیالہ ہے جو اس زمانے میں پانچ روپیہ ماہوار میں مستطیع و غیر مستطیع سب ہی طالب علموں کو دو وقت ملتا تھا، کسی کے پیالے میں تار نہ ہوتا تو دسترخوان پر ہی صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب سے کارگزار سزا اس عزیز پیالہ کا بند کر دینا ہی قرار دی تھی اور مسجد بہتوں کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی"۔

معارف سلیمان نمبر ص ۴۲

۱۔ جب حاضر ہوتا کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا۔ آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ معمولی اخبار یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آ گئی تو اسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے۔ ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ خالی وقت گزاری کے طور پر نہیں توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔

طبیعت بہت اخاذ تھی ہر ادنیٰ اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہ و مہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے اور حسب موقع کام لیتے، فوراً قابل قبول نظر نہ آتی تو غور فرمانے پر جب جتنا بھی کسی کی بات ان کا دل و دماغ قبول کرتا تو قبول ہی نہیں اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے۔

۲۔ عربی طالب علمی سے لے کر علمی شہرت و عظمت کے اوج کمال تک اشخاص اور کتابوں دونوں سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ اخذ و استفادہ نے ان کو زندگی بھر لفظاً معناً سچا طالب علم بنائے رکھا، یکسوئی ان کا امر طبعی تھا جو علم و عمل کی ہر راہ میں کسب کمال کی شرط ہے۔

۳۔ ذہن و ذہانت میں ان کی طالب علمی کے متعدد رفیق و معاصر متوقد الذہن ان سے بڑھ چڑھ کر تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل تھا، سید صاحب کے گوناگوں کمالات میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے کام لینے کو دخل رہا۔ فطری ذہانت و ذکاوت، طباعی و جودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحب سے پہلے، ان کے ساتھ اور بعد بھی ایک سے ایک بڑھ کر ذہین و طباع طالب علم داخل و فارغ ہوتے رہے لیکن سید سلیمان ندوی بننے میں سب پیچھے رہے۔ بڑا راز اس کا ان کے کسب و طلب کا کمال ہی تھا، ان کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی و سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے۔

اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب و لہجہ زور دار البتہ ہوتا اور بیان کی قوت و روانی سے شرکاء کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا۔ متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے۔ بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر قابو رہتا۔

(سیرۃ السید۔ معارف سلیمان نمبر ص ۱۰۸ - ۱۰۹)

تکمیل تعلیم کے بعد

ندوہ سے فراغت کے بعد سید صاحب کے مستقبل اور مشغلہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ والد اور دیگر قریبی اعزّہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنا آبائی پیشہ طب اختیار کریں مگر شاگرد کی بے پناہ صلاحیتوں کے رازدار اور نگہدار شفیق استاد مولانا شبلی، سید صاحب کو طبابت کے محدود کوچہ میں بھیجنے کے بجائے علم، دین اور تاریخ و تحقیق کے میدان کا شہسوار بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ سید صاحب کے بزرگ بار بار شبلی کو لکھتے تھے کہ وہ انھیں پیشۂ طبابت کی طرف راغب و آمادہ کریں اور شبلی ٹال دیا کرتے تھے۔

زیادہ اصرار پر شبلی نے انھیں لکھ بھیجا کہ "آپ لوگ ان کی زندگی خراب نہ کریں، انھیں خدا نے دوسرے کاموں کے لئے بنایا ہے ان کو میرے حوالے کیجئے اور علمی تحقیقات میں مصروف رہنے دیجئے۔" پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاد محترم کسی ضرورت سے پٹنہ گئے تھے۔ سید صاحب کے چچا اور خسر مولوی ابو یوسف بھی ان سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی، آخر میں مولانا شبلی نے کہا کہ ان کے والد سے کہدو کہ سید سلیمان کو ہمیں دے دیں۔ والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی یہ شفقت دیکھ کر خاموش ہو گئے، لیکن خاندانی روایات کے برخلاف طب اور تصوف[1] دونوں لائنوں سے صاحبزادے کی علیحدگی انھیں پسند نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی محنت اور قوتِ حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ ان کو کوئی نہ جانتا اور عالمِ اسلامی ان کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا۔[2]

---

[1] اس وقت تو سید صاحب تصوف کی لائن سے واقعی علیحدہ ہو گئے تھے بلکہ اس سے ذہنی طور پر خاصا بعد بھی ہو گیا تھا لیکن پچیس سال کے بعد یہی سید صاحب ایک نادر الوجود صوفی تھے۔

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۵۶

شبلی نے رسالہ الندوہ کے بعض کام ۱۹۰۵ء میں ہی سید صاحب کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے اور اپریل ۱۹۰۶ء سے یہ ذمہ داری عارضی طور پر سید صاحب کو سونپ دی گئی، جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئے تو اپریل ۱۹۰۷ء سے انھیں باضابطہ طور پر سب ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ چونکہ الندوہ کا ایک مقصد طلبہ کی علمی تربیت اور رسالہ میں جدت و تنوع پیدا کرنا تھا اس لئے اس معاون ایڈیٹر وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے اسی وجہ سے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک مختلف اوقات میں سید صاحب، مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی اس عہدہ پر مامور ہوتے رہے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> "۱۹۰۶ء میں میری تعلیم کا آخری سال ہے مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا شبلی نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا اس کے بعد یہ عزت ہمارے دوست مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کو حاصل ہوئی جس کو انھوں نے ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بخوبی انجام دیا..... اس کے بعد یہ خدمت اگست ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی جس کو میں نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اسی پر اس الندوہ کا خاتمہ ہوا جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے۔"[1]

الندوہ کے مدیر طلبہ ہی ہوتے تھے جو اس وقت شبلی کی خصوصی نگرانی میں کام کرتے تھے اسی لئے محمد اکرام نے لکھا ہے کہ قوم کی علمی خدمت کے علاوہ الندوہ نے ہونہار طلبہ کو موقع دیا کہ وہ تحریر و تصنیف کی ابتدائی منزلیں ایک کہنہ مشق اور کامل الفن استاد کی نگرانی میں دارالعلوم کے قیام ہی میں طے کریں۔ سید سلیمان ندوی مولوی عبدالسلام ندوی اور ندوہ کے دوسرے مشہور اہل قلم حضرات

---

[1] حیات شبلی ص ۶۴۴

کی بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی تھی۔ اور جب الندوہ بند ہوا[1] تو سید صاحب نے اس کے نتائج و فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ الندوہ نے

۱۔ اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔

۲۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

۳۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴۔ عربی خواں طبقہ میں پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

۵۔ اسلام اور تاریخِ اسلام پر بہت سے تاریخی اعتراضوں کو دفع کیا۔

۶۔ قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی اصلاحِ نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان تقریباً ہر شمارہ میں سید صاحب کا مضمون شائع ہوتا تھا اور بعض مضامین اپنی طوالت کی وجہ سے کئی قسطوں میں بھی شائع ہوئے اور یہ مثال بھی موجود ہے کہ پورے

---

[1] جیسا کہ اداروں کا مقدر ہے، ۱۹۱۰ء کے بعد دارالعلوم ندوہ میں بھی اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی تھی، انتظامیہ کا ایک طبقہ شبلی کا مخالف ہو گیا تھا، یہ اختلافات اتنے بڑھے کہ ۱۹۱۲ء میں سید صاحب کے ہاتھ سے الندوہ چھین لیا گیا اور ۱۹۱۳ء میں شبلی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ انکے ساتھ ہی شبلی کا گروپ بھی ندوہ سے سبکدوش ہو گیا جس میں سید صاحب بھی شامل تھے۔ الندوہ بند تو نہیں ہوا لیکن دوسرے فریق کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ ۱۹۱۲ء کا شمارہ کسی بھی ایڈیٹر کی تصریح کے بغیر نکلا۔ جولائی کے شمارے میں صفحہ اول کی پشت پر شبلی کے الندوہ سے استعفیٰ اور انتظامیہ کی تبدیلی کا اعلان درج تھا اور مولوی عبدالکریم صاحب کا نام بحیثیت ایڈیٹر رکھا گیا تھا۔ کچھ دنوں الندوہ مولوی اکرام اللہ صاحب کی ادارت میں نکلا لیکن ظاہر ہے کہ علمی حلقہ جا چکا تھا، علمی تعاون ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ۱۹۱۶ء میں یہ مکمل طور پر بند ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ کی ادارت میں اپنی معتمدی کے زمانے میں سید صاحب نے اسے دوبارہ جاری کیا تھا۔

شمارے میں صرف سید صاحب کا ہی ایک مضمون[1] شامل تھا اور بس۔ یہ پورا دور وہ ہے جب شبلی کی حکیمانہ اصلاح کے زیر سایہ سید صاحب کی مضمون نگاری کو مسلسل دو سال گزر چکے تھے اور ان کا اپنا ایک رنگ نکل آیا تھا اسی لئے اس دور کے مضامین میں علمی، تحقیقی اور ادبی رنگ پوری طرح جھلکیاں دکھلا رہا ہے اور اس کے بعد سے یہ رنگ ہر دن تیز تر ہوتا گیا اس چھ سالہ عرصہ میں الندوہ میں سید صاحب نے جو مضامین لکھے ان کی فہرست یہ ہے۔

۱۹۰۷ء۔ علم ہیئت اور مسلمان، عربی زبان کی وسعت، برنا باکی انجیل، بحر العلوم۔

۱۹۰۸ء۔ مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید، ابن خلکان، ایمان بالغیب، جرجی زیدان کی تمدنِ اسلامی پر تنقید۔

۱۹۰۹ء مکررات القرآن، اسلامی رصد خانے، سود اور صحف انبیاء، تحریم شراب، علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق۔

۱۹۱۰ء۔ ندوہ کے لئے ایک کتب خانہ کی ضرورت، کتب خانہ اسکندریہ۔

۱۹۱۱ء۔ اشتراکیت اور اسلام، مذہب اسلام اور عقل، اسماء القرآن، الاحتساب فی الاسلام۔

۱۹۱۲ء۔ فرقہ حنفیہ عقاید میں کس کا مقلد ہے، عذاب وغیرہ۔

ندوہ میں سید صاحب بحیثیت استاد

الندوہ کی ذمہ داری کے دوران سید صاحب نے جہاں علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں مہارت حاصل کر لی تھی وہیں ان کے اندر ادبی افہام و تفہیم، تنقید و تشریح اور نکتہ رسی کا خاص ملکہ پیدا ہو گیا تھا اور ان سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ معلمی کے پیشہ اور ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکیں گے، علامہ شبلی نے موقع ملتے ہی اس ترشے ترشائے لعل گراں مایہ کو دار العلوم میں عربی کے ادبی تاج کی زینت بنا دیا۔ ستمبر ۱۹۰۸ء سے مارچ ۱۹۰۹ء تک وہ عربی انشاء کے معلّم اور

---

[1] "اشتراکیت اور اسلام" شائع شدہ اگست ۱۹۱۱ء۔ سید صاحب نے ناساعد حالات میں اس بار الندوہ کی ذمہ داری قبول کی تھی، یہاں کی آزمائش کا وقت تھا انھیں ضرورت زمانہ کا احساس اور اپنے معیار پر اعتماد تھا اس لئے اس شمارہ میں کسی دوسرے کا مضمون شامل نہ کر کے تیس صفحات پر مشتمل اپنا مربوط و مبسوط مضمون پیش کیا۔

اپریل ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک نائب ادیب کی حیثیت سے ندوہ میں معلمی کی خدمات انجام دیتے رہے۔

عربی کے معلّم و ادیب کی حیثیت سے سید صاحب کو طلبہ کی ابتدائی کتابوں کا فقدان محسوس ہوا تو شبلی کے مشورہ سے "دروس الادب" کے نام سے موصوف نے دو آسان اور دلنشین ریڈریں تیار کیں۔ سید صاحب کی یہ پہلی تصنیف اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ندوہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے بہت سے مدارس اور اسکولوں کے عربی آموز طلبہ کے نصاب میں داخل کی گئی اور ایک طویل عرصہ سے مسلسل اشاعت کے باوجود آج بھی اس کی ضرورت اور اہمیت ختم نہیں ہوئی ہے۔

عربی کی معلمی سید صاحب کا اول و آخر ہی ثابت نہیں ہوئی بلکہ عربی زبان کے مطالعہ میں مزید اضافہ کا موجب بنی۔ عربی ادب کے ساتھ ساتھ اس کی لغت اور محاوروں سے شغف سید صاحب کی غیر معمولی خود اعتمادی کا سبب بنا، علامہ شبلی نے اپنے سفرنامۂ مصر و شام کے آخر میں جدید عربی الفاظ کی جو فہرست دی ہے۔ سید صاحب نے زمانۂ طالب علمی میں اسے بھی یاد کر لیا تھا۔ عربی کے جو اخبارات شبلی کے پاس آتے ان سے تمام نئے اور اہم الفاظ چن چن کر یاد کر لئے اور انھیں تحریری طور پر محفوظ بھی کر لیا تھا۔ ندوہ کی تعلیم اور دروس الادب کی اشاعت نے عربی زبان و ادب سے عام طلبہ کی دلچسپی میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر ایک جدید عربی اردو لغت کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کام کے لئے سید صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ سید صاحب کے لئے کام انتہائی آسان ہو چکا تھا۔ چنانچہ موصوف نے اپنی پرانی یادداشتوں میں کچھ نئے اضافوں کے ساتھ "اللغۃ العربیہ" کے عنوان سے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں اسے پیش کر دیا۔ اس جلسہ کی صدارت اس زمانہ کے مشہور ترین عربی رسالہ "المنار" مصر کے مدیر علامہ رشید رضا مصری کر رہے تھے، انھوں نے اس ڈکشنری کو بہت پسند کیا اپریل ۱۹۱۲ء کے رسالہ تمدن لکھنؤ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> "مولوی سید سلیمان صاحب ماڈرن عربک پروفیسر دارالعلوم نے اس کتاب میں تقریبًا ان چار ہزار الفاظ کی تشریح فرمائی ہے جو آجکل عربی میں مستعمل ہیں۔ علاوہ عربی خواں طلبہ کے استفادہ کے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے واسطے مفید ہو گی جو عربی جرائد کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں"۔

اردو میں جدید الفاظ کی یہ پہلی لغت ہے، موجودہ دور میں اس طرح کی متعدد لغتیں مدون ہو چکی

ہیں لیکن اس کی اہمیت و افادیت آج بھی مُسلّم ہے ۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور حکومت کے لئے تگ و دو کی ایک پوری تاریخ ہے ۔ انھوں نے عرصہ تک جدوجہد کے بعد مسلمانوں کی صدیوں پرانی مضبوط ، مستحکم اور عظیم الشان حکومتوں سے اقتدار چھینا تھا ، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ان کو یہی خدشہ تھا کہ مسلمان دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں ، ظاہر ہے انھیں یہ خطرہ غیر مسلموں سے نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس لئے مسلمانوں سے منافرت ان کی حکومت کا اصل اصول بن گیا ، زیادہ عتاب کا شکار بھی وہی ہوئے ۔ انھیں عبرت ناک سزائیں دی گئیں اور ان کے پورے شہر کے شہر تباہ کر دیئے گئے اگر کہیں مسلمان باقی رہ گئے تو ان کی جائیداد قرق کر لی گئی ۔ ہندوؤں کو اجازت تھی کہ وہ دہلی واپس آسکتے ہیں مگر مسلمانوں کو ۱۸۵۹ء تک دہلی کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی ۔ غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا کہ " مہاجن دہلی میں آگئے ہیں مگر مسلمانوں میں کوئی نظر نہیں آتا ، اتنے زیادہ رشتہ داروں کا قتل ہوا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو شاید میرے واسطے کوئی رونے والا نہ ہوگا ۔ مسلمانوں کی آمدنی کے تمام ذرائع ختم کر دیئے گئے تھے مسلمانوں کو نہ تو سرکاری نوکری مل سکتی تھی اور نہ وہ فوج میں داخل ہو سکتے تھے ۔ مالی حالت کی خرابی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ نقاب ڈال کر رات کو بھیک مانگتے تھے ، اس کے باوجود انھیں پورے ملک سے تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے انگریزوں نے دوسرے کارگر حربہ کے طور پر مسلمانوں اور ہندوستان کی تمام غیر مسلم قوموں کے درمیان دائمی تصادم کے لئے راہ ہموار کی ۔ اس مقصد کے تحت اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کی نصابی کتابیں از سر نو لکھوائی گئیں ، ان کتابوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے پورے عہد حکومت کو غیر مسلموں کے لئے مظالم ، مصائب اور شدائد کا دور بنا کر پیش کیا گیا مسلم فرمانرواؤں کی ایسی نفرت انگیز تصویر پیش کی جسے پڑھ کر اور دیکھ کر صرف یہی نہیں کہ غیر مسلم طلباء مسلمانوں سے نفرت کرنے لگے بلکہ مسلمان طلبہ بھی ان " دستاویزوں " کو پڑھ کر شرم سے سر جھکا لیتے تھے اور اس طرح انگریز اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ۔

انگریزوں کی اس گہری سازش کا احساس ہونے کے بعد سب سے پہلے دارالعلوم ندوہ نے ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں یہ تجویز منظور کی کہ انگریز مورخوں نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے ان تمام تاریخی اغلاط کی نشاندہی اور تصحیح کے لئے ایک شعبہ قائم کیا جائے ۔ سید سلیمان ندوی کو اس شعبہ

تصحیح اغلاط تاریخی (صیغۂ تصحیح تاریخ اسلام) کا سکریٹری بنایا گیا۔ چنانچہ سید صاحب نے مختلف اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان اساتذہ سے خط و کتابت کر کے اس بارے میں مشورے کئے اور عام اطلاع کے لئے ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء کو اخباروں میں ایک مضمون شائع کر کے اہلِ نظر حضرات سے اس قسم کی تصانیف کے نام معلوم کئے۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا عام طور سے اس پر توجہ دی گئی اور اس کے جواب میں متعدد لوگوں نے مختلف کتابوں کے نام بھیجے۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ

> "سب سے زیادہ قابلِ اعتراض کتاب سابق ڈائریکٹر تعلیم مارسڈن صاحب کی تاریخ ہندوستان تھی جو بیشتر جگہ جونیر ہائی اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ دوسری کتاب ویلا فورس کی تاریخ ہند تھی۔ ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر ان کے قابلِ اعتراض عبارتوں کو نقل کر کے جولائی ۱۹۱۰ء میں اسلامی اخبارات سے خواہش کی گئی کہ وہ ان کتابوں کے نکلنے کی تحریک کی پوری تائید کریں۔ چنانچہ نہ صرف اردو بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے بھی اس طرف توجہ کی۔"[1]

یہ زمانہ ندوہ اور علی گڑھ باالفاظِ دیگر شبلی اور سرسید کے متعلقین کی ذہنی معرکہ آرائی کا بھی تھا جس کا آغاز ۱۸۹۲ء میں ہو چکا تھا۔ سرسید اور شبلی کے درمیان کچھ نظریاتی، کچھ ذاتی اور کچھ سیاسی اختلافات تھے۔ سرسید کی حیات تک تو دونوں میں نباہ ہوتا رہا لیکن ان کی وفات کے بعد وہ وضع داری بھی ختم ہو گئی اور شبلی نے علی گڑھ کالج سے استعفیٰ[2] دے دیا تھا اور بظاہر اختلافات بھی ختم ہو گئے

---

[1] حیات شبلی ص ۵۲۴

[2] مولانا شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک عرصہ تک سرسید کے انتہائی قرب رہا لیکن شبلی کی "الفاروق" کی تالیف پر دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ سرسید صلح کل کے قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ اس کالج سے کوئی بھی ایسی چیز باہر نہ نکلے جو کسی بھی طبقہ کی دل آزاری کا سبب ہو اور نتیجتاً کالج کو نقصان پہنچے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح لکھنے میں اس بات کا امکان تھا کہ اہلِ تشیع حضرات کے لئے یہ بات ناپسندِ خاطر ہوگی اس لئے سرسید نے شبلی کو الفاروق لکھنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، نظریاتی اختلافات کا یہ آغاز ہے جس میں ہر دن اضافہ ہوتا رہا۔ سیاسی مسلک کے اعتبار سے سرسید انگریزوں کی نکتہ چینی ناپسند کرتے تھے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھے لیکن دراصل یہ اختلافات سرد پڑ گئے تھے اور موقع ملتے ہی حرارت آجاتی تھی۔ پھر دونوں کی ہرادا دوسرے کو تڑپا دیتی تھی۔ چنانچہ ۲۵ مئی کو مذکورہ بالا اخباری اعلان کی اطلاع کے کچھ عرصہ بعد اخبار البشیر (اٹاوہ) میں ایک خاکہ کے ساتھ یہ خبر شایع ہوئی کہ یہ کام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر رہی ہے۔ شبلی بھی حساس اور زود رنج تھے، یہ خبر پڑھ کر انھوں نے کچھ غصہ میں مگر شاگرد کی دلجوئی کا لحاظ رکھتے ہوئے سید صاحب کو لکھا کہ

> "تمہارے مضمون تصحیح اغلاط پر ارباب علی گڑھ کس قدر چونکے، فوراً ایک کمیٹی قائم کی اور مختلف کورسوں کی جانچ کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم ہو گئیں، لیکن ندوہ کا ذکر نہیں آیا بلکہ بیان کیا گیا کہ یہ کام پہلے سے کر رہے ہیں۔ خیر کام ہونا چاہیے، کہیں ہو تاہم تمہارا دائرہ الگ ہے وہ صرف گورنمنٹ کو مطلع کریں گے اور تم کو تصحیح سے تعلق ہے۔"[1]

چونکہ سید صاحب کو اس کام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور فطری طور پر بھی سید صاحب سلیم الطبع اور حلیم المزاج واقع ہوئے تھے اس لئے انھوں نے مسئلہ کے تعمیری پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کو درج ذیل خط لکھا:

> "جناب مکرم، دام لطفکم، السلام علیکم
>
> ندوۃ العلماء کے اعلان شعبۂ تصحیح کے بعد البشیر میں یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ پڑھی کہ جناب نے اس امر کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر البشیر میں پڑھا کہ جناب نے معلمین و افاضل مدرسۃ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیح اغلاط مرتب فرمائی ہے۔ چونکہ یہ قومی کام دو منتشر مقاموں میں انجام پانا خلاف مصلحت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اور شبلی انگریزوں کی سازشوں سے باخبر رہ کر خاموشی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ انگریزوں کی غلطیوں کی مخالفت کرتے تھے، یہ سیاسی اختلاف دونوں کے درمیان ذاتی اختلافات کا سبب بن گیا تاہم شبلی نے کالج نہیں چھوڑا لیکن سر سید کی وفات کے بعد انھوں نے یہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور ۱۸۹۸ء میں استعفیٰ دے کر ریاست حیدرآباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان اختلافات کے باعث سر سید اور شبلی کے دو الگ الگ دبستان قائم ہو چکے تھے جن میں شکر رنجی رہنا ایک عام بات ہو گئی تھی۔ اس اختصار کی تفصیل بہت طویل ہے اس لئے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

[1] مکاتیب شبلی بنام سلیمان نمبر ۲۴

ہے اس لئے چند امور عرض ہیں (۱) اس کام کو متحد قوت سے کیونکر عمل میں لایا جائے (۲) اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدبیر اختیار کی جائے (۳) انگریزی کورس کی جو تاریخ از سرتا پا لغو ہے اس کو خارج از کورس کرنے کی کیا تدبیر ہے۔

امید ہے کہ قومی کاموں میں یکجہتی کو پیشِ نظر رکھ کر جواب سے مستفیض فرمائیں گے۔"

والسلام[1]

یہ خط بے نتیجہ رہا، دونوں جگہ کام شروع ہوا لیکن کہیں بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ سید صاحب نے ۲۶ اپریل ۱۹۱۲ء کے اجلاس ندوہ لکھنؤ میں اس صیغہ سے متعلق اپنی دو سالہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

"تیسرے جلسہ میں خاکسار نے صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی کی رپورٹ سنائی اور انگریزی کورس کی ان غلطیوں کے اقتباسات پیش کئے جن میں اسلام پیغمبر اسلام علیہ السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزام لگائے گئے تھے مسلمان ان غلط بیانیوں کو سن کر تڑپ اٹھے۔ پھر یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے اس باب میں جو مراسلت ہوئی تھی وہ پیش کی اور آئندہ طریقۂ کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا۔"[2]

سیرۃ النبی کے اسٹاف میں شمولیت:

عیسائی مشنریاں اپنی عادت کے مطابق اسلام اور پیغمبر اسلام پر مختلف قسم کی الزام تراشیاں کرتی رہتی تھیں، پیغمبر اسلام کی شخصیت و سیرت پر حملے کر کے ان کے ارشادات اور اسلامی احکامات کو خلافِ فطرت ٹھہراتی تھیں تاکہ اس گمراہ کن لٹریچر سے اسلام کے خلاف عام پروپیگنڈہ کیا جا سکے۔ شبلی کچھ عرصہ تک تو ان اعتراضات کے جوابات دیتے رہے لیکن پھر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ مسموم تحریریں

---

[1] مکاتیب سلیمان جلد اول مکتوب نمبر ۵۳

[2] حیات شبلی ص ۵۰۲

مسلم تعلیم یافتہ طبقہ پر بھی اپنا زہر چھوڑ سکتی ہیں اس لئے رسول اکرمؐ کی سیرت پر ایسی مستقل کتاب تیار کی جائے جن میں علمی لیکن سہل انداز سے ان نقطوں اور مرکزوں پر واضح روشنی پڑ سکے اور سیرت کی صحیح تصویر ان کے ذہنوں میں بیٹھ جائے تاکہ وہ دوسروں کی تحریروں سے گمراہ نہ ہو سکیں۔ اس کے لئے محض مناظرانہ رسم کافی نہیں تھی بلکہ ایک علمی و سائنٹیفک انداز، ادبی اسلوب اور دلنشین طرزِ بیان کی ضرورت تھی۔ شبلی نے "سیرۃ النبی" لکھنے کا یہ ارادہ تو ۱۹۰۳ء میں کر لیا تھا اور کام کا آغاز بھی کر دیا تھا لیکن بعض دیگر حالات[1] اس میں مانع رہے اور کام آگے نہ بڑھ سکا۔ بالآخر ان کی یہ دیرینہ خواہش ۱۹۱۲ء میں پوری ہوئی اور اسی سال انھوں نے سیرت کا شعبہ قائم کر کے اس کا اسٹاف مقرر کیا جن میں انگریزی کتابوں سے ترجمہ کرنے کے لئے مترجم رکھے اور سید صاحب کو عربی کا معاون (لٹریری اسسٹنٹ) مقرر کیا۔ سید صاحب کچھ دن تک تو معلمی اور الندوہ کی ادارت کے ساتھ ہی یہ خدمت انجام دیتے رہے لیکن مئی ۱۹۱۲ء میں کچھ عرصے کے لئے معلمی سے ہٹا کر شبلی نے انھیں سیرت کے اسٹاف میں شامل کر لیا اور عربی کے بنیادی مآخذ سے سیرت پر مواد فراہم کرنے کا کام موصوف کے سپرد ہوا۔ مئی ۱۹۱۲ء کے بعد سید صاحب الندوہ سے بھی سبکدوش ہو گئے۔ ندوہ کی ہماہمی میں یہ کام مشکل تھا اس لئے یکسوئی کی خاطر اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ شبلی بمبئی چلے گئے اور وہیں جولائی ۱۹۱۲ء میں کام شروع ہوا۔ چنانچہ شبلی نے ایک خط میں لکھا کہ

> "کام ہو رہا ہے، سیرۃ کے اصل مآخذ صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری ان کے تمام رواۃ کا استقصا کر کے ان کا اسماء الرجال تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا

---

[1] ندوہ کی ذمہ داریاں، مصروفیات اور اصلاح کی فکر میں ہمہ تن انہماک، بعض قومی کاموں کی مشغولیت، والد کے چھوڑے ہوئے قرض کے بقیہ کی ادائیگی کی فکر اور سیرت کے لئے بھی روپے کی ضرورت وغیرہ اہم مسائل تھے ۱۹۱۲ء میں سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے دو سو روپیہ ماہانہ کی امداد منظور کی تب مصارف کی طرف سے مطمئن اور ندوہ کے ناسازگار حالات سے بددل ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے اور سیرت کے کام کا آغاز کیا۔

ہوں کہ رواۃ کے انتقاد میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں اور یہیں ہیں خود سیرت مشغول ہوں انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔"

(مکاتیب شبلی بنام شروانی، نمبر ۲۴)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے ذمہ سیرت کا سب سے مشکل اور اہم ترین کام تھا وہ اس میں، مستقل لگے رہے یہاں تک کہ سیرت ان کو ازبر ہو گئی۔ اگر مقدمہ کے لئے مواد تلاش کرتے تو اپنی دیدہ ریزی سے دریائے تحقیق کے غواص بن جاتے اور شبلی کو تنبیہ کرنی پڑتی کہ کام کو محدود کیا جائے، روایات کے استقصا و استخراج پر آتے تو سخت تنقیدی نظر سے کام لیتے، غرض اس عرصہ میں سید صاحب نے رسول اکرم کی حیاتِ طیبہ اور سیرت مبارکہ پر ہی مواد اکٹھا نہیں کیا بلکہ اسلام کے پورے نظام زندگی کو حضورؐ کی سیرت کے جلو میں پیش کرنے کا تہیہ کر لیا اور یہی وجہ ہے کہ شبلی تو سیرت کی صرف دو جلدیں ہی نامکمل چھوڑ کر وفات پا گئے جنھیں مکمل کر کے سید صاحب نے شائع کیا، یہ کام جاری رہا اور سید صاحب نے مزید پانچ جلدیں لکھیں، زندگی کے آخری لمحہ تک یہ کام کرتے رہے اور ساتویں جلد[1] نامکمل چھوڑ کر خود بھی اپنے آقا کے دربار میں پہنچ گئے۔

سید صاحب کی اعلیٰ استعداد، سخت محنت اور تحقیق سیرت سے غیر معمولی دلچسپی پر شبلی کو نہ صرف اعتماد تھا بلکہ وہ انھیں اپنا سہارا بھی تصوّر کرتے تھے وہ جب ۱۹۱۲ء میں کچھ عرصہ کے لئے لکھنؤ آئے تو یہاں خود بھی سیرت کے کام میں مشغول رہے اور سید صاحب کو بھی خطوط کے ذریعہ بار بار مختلف قسم کے مشورے دیتے رہے۔ بین السطور سے یہ بات بھی مترشح ہے کہ یہ اس شخص کی تکمیل تربیت ہو رہی تھی جس کو اصلاً سیرت نگار رسول بننا تھا اور بلاشبہ جب شبلی کے خاکہ میں رنگ بھرے، سیرت کی پہلی دو جلدیں جس میں بیشتر کام خود کیا اور استاد نے جب اسے اپنے طور پر ترتیب دے لیا تو اسے کلیتہً استاد شبلی کے نام سے ہی شایع کیا۔ بعد کی جلدوں کے آغاز و انجام میں استاد

---

[1] سیرت کی اس ساتویں جلد کا مسودہ ایک عرصہ تک اسی خام حالت میں پڑا رہا۔ چند سال قبل اسے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے معارف میں بالاقساط خارج کر دیا ہے۔

کی یہ سرپرستی بھی انتقال کے سبب باقی نہ رہی تھی اور الف تا ی سب کام سید صاحب کو ہی کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں سید صاحب کو لکھے ہوئے شبلی کے بعض خطوط[1] کے چند اقتباسات ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

"تم کیا کر رہے ہو، اگر کوئی کام نہ ہو تو اب دوسرے حصہ کے اجزاء کو لے لو"۔

(مکتوب نمبر ۴۱)

"تم عرب بائدہ یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو جو یمن شام وغیرہ میں قائم تھیں ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہو گی، تمام کوششیں نجد و حجاز و یثرب کے متعلق معلومات کے جمع کرنے میں صرف کرنی چاہیئں، تم انھیں مقامات کے متعلق معلومات بہم پہنچاؤ، آبادیٔ کعبہ اور حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کے واقعات میں جس قدر تفصیلات مل سکیں، محققانہ تلاش کرو[2]

"سیرت کے متعلق جو عام امور ذہن میں آئیں یعنی کن کن امور پر زیادہ توجہ کی جائے وغیرہ وغیرہ ان کو وقتاً فوقتاً جب جو بات ذہن میں آئے لکھ بھیجا کرو۔ (مکتوب نمبر ۴۹)

"علالت کی وجہ سے دو گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، تمہارے چلے جانے[3] کا افسوس ہے۔ تم ہوتے تو لالف کے علاوہ کتاب کے اور حصے ساتھ ساتھ ہوتے جاتے ان حصوں کو تم اچھی طرح لکھ سکتے ہو"۔ (مکتوب نمبر ۵۲)

---

[1] مکاتیب شبلی بنام سلیمان۔

[2] سیرت کے مقدمہ کے لئے عرب قدیم کی تاریخ و جغرافیہ کی تحقیق کے سلسلے میں سید صاحب کو خوب مواد مل رہا تھا اور اس میں وہ اتنے منہمک تھے کہ کام زیادہ پھیل جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ شبلی نے جب سید صاحب کو تنبیہ کی تو تعمیلِ حکم میں کام تو محدود کر کے شبلی کو بھیج دیا مگر ان کی تلاش و تحقیق جاری رہی جو ایک کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔

[3] اس وقت سید صاحب مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ "الہلال" کلکتہ کی مجلسِ ادارت میں شامل ہو گئے تھے۔ تفصیل آئندہ ملاحظہ ہو۔

بحث واستدلال اور تنقیح واستخراج کا کام مکمل کرنے کے بعد سید صاحب نے جو مواد مرتب کر کے شبلی کو دیا تھا، شبلی نے انگریزی تراجم سے حسب ضرورت استفادہ کر کے اسے ترتیب دیا اور آخری شکل دینے کے لئے وہ پھر سید صاحب سے ہی مدد لینا چاہتے تھے اسی لئے بار بار انھیں بلانے کے لئے لکھتے رہے۔

> "تمہاری ضرورت اس لئے ہے کہ مبیضہ پر نظر ثانی کرو، کوئی بات غلط درج ہو گئی ہو یا فروگذاشت ہو گئی ہو ان کو نوٹ کرتے جاؤ، بعض امور میں مشورہ کی بھی حاجت ہے، چند مہینے میں تم بالکل آزاد ہو، جو تمہاری اسکیم ہو اس کے موافق کام کرو، میں ہر کام میں مدد دینے کو تیار ہوں۔" (مکتوب نمبر ۲۲)

> "حاشا یہ مقصود نہیں کہ تم کو اسی دائرہ میں پابند رکھوں میری ہمیشہ خواہش رہتی ہے کہ اعزہ واحباب درسگاہ سے نکل کر ملک میں پھیلیں اور الگ الگ نظام شمسی قائم کرو لیکن جب تک موقع نہ نکل آئے اور ایک محدود مدت تک جو چار پانچ مہینے سے متجاوز نہ ہو گی، سیرت کے کام میں رہنا چاہیئے کہ پہلی جلد تیار ہو جائے، ضعفِ حافظ و دماغ کی وجہ سے اپنی نظر ثانی پر اطمینان نہیں مسائل ذیل میں تحقیقی نظر ڈالو۔
>
> کعب اشرف یہودی اور ابو رافع کا قتل باذن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح بخاری میں منقول ہے، اس کو کیونکر اخلاق کے موافق تسلیم کیا جائے راوی اول جابر بن عبداللہ ہیں۔ کیا وہ اس واقعہ میں شریک تھے یا شرکا سے سنا تھا آیتِ تخییر سے کیا مراد ہے، کیا آنحضرت پر عدل بین الازدواج باقی نہیں رہا حضرت عائشہ کی حدیثیں ترجی من تشاء کے متعلق کہاں تک صحیح ہیں۔" (مکتوب نمبر ۶۲)

ان بیانات سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیرۃ النبی کی اولین دو جلدیں بھی علامہ شبلی کے منصوبہ وتدبیر اور سید سلیمان ندوی کی علمی استعداد اور اعلیٰ درجہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ شبلی کا خاکہ اور ہدایتیں شمع ہیں تو سید صاحب کی کوششیں اس شمع کی روشنی۔ سید صاحب نے علامہ شبلی کی وفات (۱۹۱۴ء) کے چار سال بعد ۱۹۱۸ء میں ان دونوں جلدوں کو استاد ہی کے نام سے شائع کیا یہ ان کی سعادت مندی اور استاد کا حق تھا۔

الہلال کی ادارت :

ندوہ میں انتظامیہ اور شبلی کے اختلافات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ جولائی ۱۹۱۲ء میں شبلی کو استعفیٰ دینا پڑا اور وہ منظور ہو گیا۔ ساتھ ہی سید صاحب بھی ندوہ کی خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔ شبلی کی حمایت میں طلباء نے اسٹرائک کر دی جو مسلسل کئی ماہ جاری رہی اور حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے ختم ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کے احسان مند تھے[1]۔ الندوہ کی ادارت کے زمانہ میں شبلی ہی کی تربیت میں ان کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور الندوہ کی ادارت نے انھیں بہت جلد شہرتِ عام کے دربار سے وابستہ کر دیا، ہر جگہ سے ان کی مانگ آنے لگی اور ۱۹۰۶ء میں وہ الندوہ چھوڑ کر امرتسر کے مشہور اخبار ”وکیل“ میں چلے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے کلکتہ سے اپنا ہفتہ وار اخبار ”الہلال“ نکالا جس کا انداز و اسلوب منفرد اور قرآنی اسلوب کی تقلیدی کوشش تھا، اپنے مواد اور زمانے کی سیاسی ضروریات سے قطع نظر آزاد کی عالمانہ، شاعرانہ اور ساحرانہ نثر اور اس پر جذباتی مضامین نے اسے ملک کا ایک اہم اخبار بنا دیا تھا۔ یہ ایک سیاسی ضرورت[2] کے تحت وجود میں آیا تھا۔

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد بمبئی میں اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد روزگار کی تلاش میں تھے کہ جنوری ۱۹۰۵ء میں وہیں شبلی سے ملاقات ہو گئی۔ شبلی نے ان کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور جب ندوہ آئے تو انھیں الندوہ کا سب ایڈیٹر بنا دیا۔ ان کی فطری صلاحیتوں اور الندوہ کے بلند معیار کی وجہ سے بہت جلد چاروں طرف ان کی شہرت ہو گئی۔

[2] ”الہلال“ دراصل ایک مخصوص عہد کی پیداوار اور اپنے وقت کی سیاست کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی اور طرابلس میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں طرابلس کے ساتھ تھیں وہ وہاں کے واقعات سن سن کر لرز اٹھتے تھے اور ان کا جوش اور غم و غصہ اپنی بلندیوں کو چھونے لگتا۔ اسی میں بلقان نے ترکوں پر حملہ کر دیا تھا اور برطانیہ سمیت یورپ کی بیشتر طاقتیں بلقان کا ساتھ دے رہی تھیں جب کہ ہندوستانی مسلمان ترکوں کی حمایت میں ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ انگریزوں کی اس مسلم مخالف پالیسی نے مسلمانوں کے جذبات کو مزید بھڑکا دیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوتا ہے۔ کم و بیش سبھی مسلم طبقات نے مختلف انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مولانا آزاد نے اس مقصد سے الہلال جاری کیا اور اپنی توانائی اسی پر صرف کرتے رہے۔ سید صاحب نے الہلال میں شامل ہو کر مولانا کی آواز کو مزید تقویت پہنچائی۔

آزاد کا سیاسی مسلک وہی تھا جو شبلی کا تھا۔ سید صاحب شبلی کے اخص الخواص تھے۔

سیاسی مسلک کی ہم آہنگی کے علاوہ دونوں کے درمیان ایک تعلق یہ بھی تھا کہ سید صاحب اور مولانا آزاد ایک ہی زمانہ میں ندوہ میں رہ چکے تھے اس لئے دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ ندوہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد نے یہ اصرار کیا کہ سید صاحب الہلال میں آجائیں۔ جب کئی مہینے تک انتظار کیا اور ندوہ کے حالات میں بہتری کا امکان نظر نہیں آیا تو مجبوراً سید صاحب نے الہلال کی پیشکش کو قبول کرلیا۔ الہلال میں شمولیت کے بعد اپنے چچا کو سید صاحب نے لکھا کہ "میں کلکتہ میں ہوں اور دیسنہ کا حال نہیں معلوم اب آپ کہاں ہیں اور کیسے ہیں الہلال کا تعلق مولانا آزاد کے اصرار سے قبول کیا۔ بالفعل اسّی دیں گے، آئندہ ترقی [1]

الہلال کی مجلس ادارت میں سید صاحب کی شرکت کے دو اسباب تھے اول معاشی فکر دوم اپنے ذہن و مزاج کے مطابق الہلال کا علمی و تحقیقی رنگ۔ لیکن الہلال کا اسلوب بیان مروجہ اسالیب سے قطعاً مختلف جس کی تقلید ہر کس و ناکس کے لئے ممکن نہیں تھی۔ جب کہ رکن الہلال کو اس کے معیاری اسلوب سے ہم آہنگ ہونا بھی لازمی شرط تھی۔ سید صاحب مختلف ادوار میں مختلف اسالیب اختیار کر چکے تھے اور ہر رنگ و اسلوب پر قادر تھے چنانچہ اسلوب میں الہلالیت پیدا کرنے میں بھی موصوف کو کوئی خاص دشواری نہیں آئی۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خود سید صاحب لکھا ہے کہ

> "جب ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے اپنا اخبار الہلال نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہوگیا۔ اخبار کا لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی طرز میں لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ الہلال میں اسی زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں ان میں ابو الکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابو الکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں

---

[1] مکتوبات سلیمان، مکتوب بنام سید عبد الحکیم نمبر ۴۴

بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے۔"[1]

بہر حال الہلال میں پہنچ کر سید صاحب نے آزاد کا اسلوب اختیار کر لیا اس دور کے بیشتر مضامین کا یہی رنگ ہے اور کہیں کہیں تو آزاد کے مخصوص رنگ سے متمائز کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میں وہ مشہور زمانہ مضمون پیش کیا جا سکتا ہے جو مسجد کانپور کے حادثہ کے بعد سید صاحب نے "مشہد اکبر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا زور بیان، پرشکوہ اسلوب، تلاطم خیزی اور سحر انگیزی آزاد سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ مثال کے لئے اس مضمون کے دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

> "زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، خاک ایران پر کس کی لاش تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاس تھی، خون چاہتی تھی، کس کا؟ مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور میں خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔
>
> ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں ہے، اپنی قربان گاہ کے لئے نذر مانگتی ہے۔ کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے، صوبۂ متحدہ کا بادشاہ (سر جیمس مسٹن) بالآخر آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا، جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔ ۳/اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے، بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف وناتواں وغیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ کر برطانوی عدل وانصاف کو زخمی کر رہی ہیں انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے"[2]

---

[1] معارف جولائی ۱۹۵۰ء

[2] الہلال جلد ۳، شمارہ ۶

الہلال کا یہ شمارہ غیر معمولی اثر آفرینی بالفاظ دیگر شعلہ فشانی اور نتیجتاً نقضِ امن کا خطرہ لاحق ہونے کے سبب ضبط کر لیا گیا تھا۔ یہ پورا شمارہ سید صاحب نے ہی ترتیب دیا تھا۔ الہلال کا عمومی قاعدہ یہ تھا کہ مضمون نگاروں کے نام ظاہر نہیں کیے جاتے تھے اس لئے اسلوبِ بیان کی یکسانیت کے سبب دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ اس مضمون کو بھی مولانا آزاد کا مضمون تصور کیا گیا جس کی طرف منقولہ اقتباس میں سید صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے عجیب بات یہ ہے کہ مولانا آزاد اس کے بعد برسوں حیات رہے لیکن انھوں نے اپنے نام سے موسوم و مرتب کردہ ان تحریروں اور مضامین سے اپنی عدم تخلیق و عدم ملکیت کا کبھی اظہار نہیں کیا۔

پونہ کالج کی ملازمت:

سید صاحب اور مولانا آزاد چونکہ ایک زمانہ (۱۹۰۵ء، ۱۹۰۶ء) میں ندوہ میں ساتھ رہ چکے تھے اس لئے دونوں کی معاصرانہ چشمک کبھی کبھی باہمی ذہنی تصادم کا سبب بھی بن جاتی تھی، خصوصاً آزاد میں غیر معمولی احساسِ انا[1] تھا جس کی زد سے سید صاحب جیسا آزاد کا نوعمری کا واقف کار بھی محفوظ نہیں رہتا تھا۔ اگرچہ سید صاحب کے اندر خاکساری اور منکسر المزاجی بڑی حد تک موجود تھی، لیکن آزاد کی عسکریت انھیں پسند نہ تھی اور سید صاحب منقبض رہنے لگے، قوتِ برداشت سے جواب ملنے کے بعد وہ الہلال چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ انھیں پونہ کالج میں فارسی کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔ سید صاحب نے الہلال کا معیار کافی بلند کیا تھا جس کا اعتراف مولانا آزاد نے اس وقت کیا جب سید صاحب کے چلے جانے کے بعد اپنی کمزوری اور الہلال کی بے رنگی کا شدت سے احساس ہوا، اب آزاد کے احساسِ ندامت اور احساسِ انا کے درمیان تصادم شروع ہوا، اول الذکر غالب آیا اور مولانا نے سید صاحب کو ایک

---

[1] آزاد کی سوانح اور خود نوشت اور خطبات میں بھی ہر جگہ یہ بات نمایاں نظر آتی ہے اس کی ذمہ داری ان کے ذاتی اور معاشرتی حالات پر ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

طویل خط لکھا جس کے انداز اور تیور سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد جیسے امام فن اور بے مثال ادیب وقت کی نظر میں سید صاحب کی شخصیت و شہرت کی کس قدر اہمیت تھی خط کا کچھ حصّہ درج ذیل ہے۔

> "آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کرلی حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سُنئے اور مجھے اپنا مخلص بھائی تصور کیجئے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں خود غرض ہوں اور میری غرض میری خواہش میں اصلی عنصر ہے تاہم میری خود غرضی آپ کے لئے مضر نہیں بلکہ بہتر ہے۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھا دی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھا سکتے ہیں۔
>
> آپ آجایئے اور الہلال کو بالکل لے لیجئے جیسا چاہیے چلایئے مجھے بجز اس کے کوئی تعلق نہ ہوگا کہ اس کے لئے اپنا مضمون دے دیا کروں۔ "البلاغ" آپ کے ذوق کا ہے وہ بھی آپ لے لیں۔ یہاں کے تمام لوگ آپ کے استقبال کے لئے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا ساتھ دیں گے جس طرح میرا دے رہے ہیں اور اس طرح حکم مانیں گے اور ماتحت رہیں گے جیسے میکر رہتے ہیں"[1]

سید صاحب دوبارہ وہاں نہیں گئے لیکن اس کے بعد آپسی اختلافات بھی بتدریج کم ہو گئے۔ اس خط کے بعد سید صاحب نے آزاد کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں آزاد کے اصرار پر وہ تمام شکایتیں لکھ بھیجیں جو ان کے لئے تکدر خاطر کا موجب بنی تھیں۔ مولانا آزاد کی یہ عالی ظرفی بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اس کا فوری طور پر جواب دیا جس میں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا اور بعض بے اعتدالیوں کی سچے دل سے معذرت چاہی اور آخر میں لکھا کہ "اچھا اب تو آپ آجایئے اور اگر اب بھی منظور نہیں تو میں اسے مشیتِ ایزدی تصور

---

[1] مکتوبات سلیمان جلد اول، مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۔۲، (ضمیمہ)

کروں گا[لہ]۔ اس کے بعد سے آخر وقت تک دونوں کے درمیان اچھے تعلقات رہے اور جہاں سید صاحب مولانا کی خدمات کو بلیغ الفاظ میں معارف کے کالموں میں سراہتے رہے وہیں آزاد بھی "جانشینِ شبلی" کی قدر شناسی میں ہمیشہ پیش پیش رہے، دار المصنفین کے زمانے سے قیامِ پاکستان تک دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے متعلق محبت واکرام کے جذبات قابلِ تقلید حد تک پائے جاتے ہیں۔

الہلال سے رُخصت ہونے کے بعد سید صاحب سیرت کے دفتر لکھنؤ آئے، یہاں دو ہفتے رہے اور دسمبر ۱۹۱۲ء کے آخر میں دکن کالج پونہ میں فارسی کے استاد ہو کر چلے گئے اور ۱۹۱۴ء کے آغاز کے ساتھ ہی اس عہدہ پر اپنی خدمات شروع کر دیں۔ یہ ملازمت محض شبلی کی کوششوں کا نتیجہ تھی جس کا سبب یہ ہے کہ سید صاحب کے لئے الہلال جیسی اخباری نوکری شبلی کو پسند نہیں تھی اور انھوں نے طرح طرح سے سید صاحب کے لئے بہترین ملازمتوں کی کوششیں شروع کر دیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ کالج مذکور میں فارسی کی جگہ خالی ہوئی ہے تو انھوں نے فوراً وہاں کے پرانے استاد شیخ عبد القادر کو اس کے لئے پُرزور سفارشی خط لکھ کر سید صاحب کے لئے یہ جگہ طلب کی اور بالآخر دس روپیہ سالانہ ترقی کے ساتھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر تقرر ہو گیا۔

پونہ پہنچ کر سید صاحب نے ایک یہودی سے عبرانی زبان سیکھنا شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی استعداد میں اضافہ کی مسلسل فکر بھی جاری رہی۔ عبرانی سیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام پر جو الزامات یہودیوں نے تراشے ہیں ان کا براہِ راست مطالعہ کر کے سیرت کے کام میں خاطر خواہ مدد لی جا سکے اور یہ کام کسی بھی گوشہ سے تشنہ نہ رہے۔ اس کے علاوہ کالج کی ملازمت سے یہ فائدہ بھی پہنچا کہ عربی مدارس اور یونیورسٹی کے طبقہ کے درمیان جو فاصلہ رہتا ہے وہ بھی دور ہونے کا راستہ نکل آیا یہی نہیں بلکہ عربی دار العلوم (ندوہ) کے ایک طالب علم ومعلم کو کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے دیکھنے اور سمجھنے کا اچھا موقع فراہم ہوا اور پروفیسری کے زمانے میں سید صاحب بڑے اعزاز کے ساتھ رہے۔ یہاں کی معمولی اور ضابطہ کی کارروائی تو صرف ذریعہ معاش کے طور پر تھی ورنہ

[لہ] مکاتیب سلیمانی بحوالۂ سابق

یہاں رہ کر بھی وہ اپنے اصلی علمی و تحقیقی کاموں میں اسی توجہ اور انہماک کے ساتھ مصروف رہے۔

اپریل ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں سید صاحب کا ایک مقالہ حضرت عائشہ پر شائع ہوا تھا یہ اتنا مقبول ہوا کہ لوگوں میں سیرت عائشہ پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت کا احساس و اشتیاق پیدا ہو گیا اور اس کے لئے نگاہِ انتخاب سید صاحب پر ہی پڑی۔ لوگوں کے اصرار پر شبلی نے بھی اس کے لئے تقاضے شروع کر دیئے، ضروری مشورے اور جو مواد فراہم ہوتا وہ بھی موصوف کو لکھتے اور دیتے رہے۔ قیام پونہ کے دوران بھی شبلی نے ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

> "آج بھوپال سے خط آیا ہے[1]، حضرت عائشہ کی سوانح کا بڑا تقاضا ہے۔ یعنی جلدی تیار کردو تم ایک مدت سے اس میں مصروف ہو "استدراک علی الصحابہ" کا انتظار تھا وہ میں نے تم کو دے دی ہے۔ ہاں اس کو مولوی شیر علی کے پاس فوراً بھیج دو، اب کیا انتظار ہے مفصل جواب لکھو، کس قدر ضخامت ہوگی، مجتہدات لکھ لیے یا نہیں بیگم صاحبہ معقول معاوضہ دیں گی۔"[2]

اس طرح کے متعدد خطوط شبلی نے لکھے اور جب اس قسم کے تقاضے بار بار پہنچتے رہے تو سید صاحب نے یکسو ہو کر اسے مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی موصوف وہ مفصل مقدمہ بھی تکمیل کو پہنچا رہے تھے جو زمانۂ جاہلیت کی تاریخ سے متعلق سیرت کے لئے لکھا تھا۔ اس میں پورے عہدِ جاہلیت کی معلوم اور ممکنہ تاریخ و جغرافیہ، عرب کی تحقیق و تفتیش اور اس کے ابواب کی ترتیب و تنظیم کا کام کرتے رہے جو بعد میں "ارض القرآن" کے نام سے شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق پونہ سے سید عبد الحکیم صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ

> "سیرۃ عائشہ لکھ رہا ہوں، اس کے لئے مواد بہت نہیں ہے، لیکن ایک ضروری کام ہے اس لئے مختصر ہوگی، شاید سو صفحے۔ ایک دوسری کتاب ختم کے قریب ہے، "تاریخ عرب قدیم (بعد میں ارض القرآن) اس میں بہت سے نادر مباحث ہیں، عنقریب پریس جائے گی۔ جو کتاب[3]

---

[1] یہ خط والیہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے بھیجا تھا۔

[2] مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ۲

[3] استدراک علی الصحابہ، جس کا ذکر شبلی کے منقولہ خط میں آچکا ہے۔ یہ نادر قلمی رسالہ تھا جس کی نقل شبلی نے سید صاحب کو دی تھی۔ اس کے مؤلف امام سیوطی ہیں۔ اس کا پورا نام "عین الاصابہ فیما استدرکہ السیدہ عائشہ علی الصحابہ" ہے۔

مولانا میرے لئے لائے تھے، سیرت عائشہ کے لئے مفید ہوگی۔ وہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ایک شخص نے حضرت عائشہ کی ان تمام حدیثوں کو جمع کردیا ہے جس میں انھوں نے دوسرے صحابیوں کی غلطیاں دکھائی ہیں۔"[1]

پونہ میں سید سلیمان صاحب اپنے علمی و تحقیقی مشاغل میں منہمک تھے اور وہاں انھیں گیارہ مہینے بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ قضا و قدر نے شبلی کی تکمیلِ زندگی کا فیصلہ سنا دیا، وہ مرض الموت میں گرفتار ہو چکے تھے اس وقت بھی ان کو سب سے بڑی فکر تکمیل سیرت کی تھی جس کا ایک حصہ بھی اب تک مکمل ہو کر شائع نہیں ہو سکا تھا۔ اپنی زندگی میں اس کی طباعت و اشاعت سے مایوس ہو کر وفات سے چند دن قبل وہ مسودے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس ہدایت کے ساتھ الماری میں بند کرا دیئے تھے کہ "یہ مسودے مولانا حمید الدین فراہی اور سید سلیمان ندوی کے علاوہ ہرگز کسی کے حوالے نہ کئے جائیں۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۴ء کو سید صاحب کو پونہ سے اعظم گڑھ بلانے کے لئے تار دیا گیا۔ اتفاق سے سید صاحب بغیر کسی اطلاع کے اس روز وہاں سے روانہ ہو کر از خود ہی ۱۵ر نومبر کو اعظم گڑھ آپہنچے۔ لیکن یہاں شبلی کی زبان بند ہو چکی تھی، حیران رہ گئے، شبلی نے صرف اتنا کہا "اب کیا اب کیا"، "پھر انھیں جواہر مہرہ گھول کر دیا گیا تو شاگرد رشید کا ہاتھ میں ہاتھ لے کر ایک معاہدہ کے طور پر فرمایا" سیرت میری ساری عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر اسے پورا کرو" سید صاحب نے بھرائی آواز میں کہا "ضرور ضرور" دوسرے دن مولانا حمید الدین فراہی بھی حیدر آباد سے اعظم گڑھ پہنچ گئے۔ ان سے بھی شبلی نے صرف یہی کہا کہ سیرت، سیرت، سیرت۔ سب کام چھوڑ کر۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو شبلی کا انتقال ہو گیا۔ اور سلیمان و شبلی کی پوری دس سال کی رفاقت جسمانی طور پر مفارقت میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد سید صاحب کی آمد و رفت برابر اعظم گڑھ رہی اور محبانِ شبلی اور اپنے احباب کے اصرار پر بالآخر نومبر ۱۹۱۵ء میں پونہ سے استعفیٰ دے کر سید صاحب آستانۂ استاد پر مستقل طور پر متمکن ہو گئے۔

×

---

[1] مکتوبات سلیمان مکتوب نمبر ۶۳

دارالمصنفین اور سید صاحب

یوں تو قیام ندوہ کے بعد سے ہی علامہ شبلی نے اپنی پوری توجہ اور تمام صلاحیتیں ندوہ کے لئے وقف کر دی تھیں اور کوئی تقریر، کوئی جلسہ اور کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں شبلی ندوہ یاد نہ رکھتے ہوں۔ لیکن معتمدی قبول کرنے کے بعد ندوہ کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں انھوں نے جو اہم اقدامات کیے، ندوہ کے لئے ان کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ شبلی ندوہ کے لئے وہی تھے جو سرسید علی گڑھ کے لئے۔ دونوں نے اپنے اداروں کے لئے تکلیفیں اٹھائیں، اذیتیں برداشت کیں اور قربانیاں دیں۔ وہ ندوہ میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک معتمد رہے اور ڈیڑھ سال کے قریب اس سے علیحدہ رہ کر زندگی کے آخری دن گزارے اور یہ آخری زمانہ ندوہ میں کافی تلخ یادوں سے معمور تھا اور علیحدہ رہنے کے باوجود ادارہ سے عشق بدستور رہا۔

جب شبلی معتمد ہو کر آئے تھے اس وقت ندوہ میں صرف چار درجے تھے، موصوف نے ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت ہر سال ایک نئے درجہ کا اضافہ کیا اور گریجویشن (فضیلت) کے لئے آٹھ سالہ نصاب کا انصرام کیا۔ ندوہ چونکہ ایک تحریک تھی جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اچھے اور ہونہار طلبہ کا انتخاب کر کے ان میں سے ہر ایک کو اعلیٰ درجہ کا صاحب علم و قلم بنادیا جائے جس سے ندوہ کا فیض عام ہو سکے۔ یہ بات محض فاضل کے لئے آسان نہیں تھی اس لئے شبلی یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اس آٹھ سالہ نصاب کے بعد کچھ عرصہ تک کسی مخصوص

فن یا مضمون کی تخصیصی تعلیم دی جائے تاکہ اس میں مہارت حاصل ہوسکے اور وہ اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں علم دین کی قابلِ ذکر خدمت کرسکیں۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے فضیلت کے بعد تکمیل و تخصص (specialization) کا دوسالہ کورس شروع کر دیا۔ لیکن اس کے لیے جن صلاحیتوں کے اساتذہ درکار تھے وہ دستیاب نہیں ہوسکے۔ شبلی اور سید صاحب کے علاوہ دوسرے بعض اہم اساتذہ نے تو ندوہ کو خیرباد کہا یا راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے اس لئے شبلی کی ندوہ سے علیحدگی کے اگلے ہی برس ١٩١٣ء میں یہ آخری درجہ بھی ختم ہوگیا۔ لیکن شبلی پھر بھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہے۔

کسی دارالعلوم کی تکمیل اچھے کتب خانے کے بغیر ممکن نہیں۔ اعلیٰ درجہ کے کتب خانے کی سہولت ہو تو باصلاحیت اور ذی استعداد لوگ زیادہ انہماک اور یکسوئی سے کام کرسکتے ہیں۔ آخر میں شبلی کے پیشِ نظر یہی دو کام تھے، اول ندوہ میں ایک بڑے کتب خانہ کا قیام دوم وہاں علمی و تحقیقی کاموں کے لئے باصلاحیت افراد کی تربیت کرنا۔ الندوہ کے وسیلے سے وہ پہلے ہی کئی اہلِ قلم پیدا کرچکے تھے اور یہ کام جاری تھا۔

> " ہاں یہ دونوں (سید صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب) اچھے بن گئے۔ کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی بہرحال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں۔ انشاء اللہ سیرت ہی کا دفتر اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے۔ ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے۔ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں پر حکومت کرتا ہے "[1]

کتب خانے کے لئے ان کی کوششیں برابر جاری تھیں۔ ١٩١٠ء کے اجلاس دہلی میں انھوں نے اس کی ضرورت پر بہت زور دیا تھا اور اسی موضوع پر سید صاحب کو تقریر کی ہدایت

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ١٨

کی تھی۔ چنانچہ اس اجلاس میں سید صاحب نے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت" کے عنوان سے ایک تقریر پڑھ کر سنائی اور اس میں کتب خانے کے ساتھ ساتھ ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔ اس مفصل تقریر میں انھوں نے علمی اداروں کی اہمیت، ان کے آغاز اور عروج و زوال پر روشنی ڈالی اور ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ اور ندوہ کے اغراض و مقاصد کے پس منظر میں مذکورہ تجویز پیش کرتے ہوئے تقریر کے آخر میں کہا تھا کہ

> "ممتاز طلبائے دارالعلوم کا ایک حصہ صیغۂ تالیف و تصنیف کے لئے وقف کر دیا جائے جس کی اس وقت قوم کو نہایت سخت ضرورت ہے۔
>
> دارالعلوم کی جدید عمارت میں ایک کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تعمیر کی جائے جس میں کتب خانے کے سوا ایک وسیع کمرہ اربابِ قلم و مصنفین کے لئے بنایا جائے جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو۔ مادری زبان کو جس کا گہوارہ یہی دہلی ہے، ان تصانیف کے ذریعے ترقی دی جائے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے اربابِ قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے، اس کے مصارف اپنے جیب سے پورے کریں اور اس عمارت کا نام "دارالمصنفین" ہو۔ بظاہر یہ تجویز یں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے جہاں آج بظاہر بہت سے مشکل بلکہ بظاہر محال کام انجام پا رہے ہیں اس کتب خانہ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں جس کے لئے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔"[۱]

ندوہ کے حالات کی تبدیلی اور شبلی کے استعفیٰ کے بعد بھی ان کا یہ جذبہ سرد نہیں پڑا اور یہ پروگرام اسی زور و شور سے جاری رہا۔ مزید برآں "الہلال" کے ذریعہ مولانا ابوالکلام سے بھی ان کی عام تشہیر کرا دی گئی اور دارالمصنفین کا ایک خاکہ بھی ساتھ ساتھ شائع ہوا لیکن استعفے کے بعد

---

[۱] بحوالہ حیات شبلی ص ۶۸۹

شبلی کے لئے جگہہ کا مسئلہ اہم بن گیا تھا، وہ اب بھی اسے ندوہ میں ہی قائم کرنا چاہتے تھے لیکن وہاں کے سیاسی حالات میں خوشگواری اور سکون کے ساتھ یہ کام ممکن نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ شبلی کو بھی اس بات کا احساس تھا اسی لئے مولوی مسعود علی کے ایک خط کے جواب میں شبلی نے لکھا تھا کہ "بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں ورنہ میری اصل خواہش یہی ہے، لیکن کیا کیا جائے حالانکہ اس میں ان ہی کا فائدہ ہے"۔[1]

جگہ کے تعین کی اس کشمکش، غور و فکر اور رد و قبول میں وقت گزرتا رہا۔ مختلف مشاہیر سے مشورے بھی کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً اپنے عزم صمیم کا اظہار بھی کرتے رہے۔ ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھا کہ "ہاں دارالمصنفین پر آپ نے کیوں سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے اس عمارت کو انشاءاللہ پورا کر کے رہوں گا۔ اور شاید میرا مدفن بھی وہی ہو۔"[2]

(مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ۱۱۳)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ حبیب گنج اس کے لئے زیادہ موزوں رہے گا اس پر شبلی کی رگِ ایثار بھڑک اٹھی اور انھوں نے محبت بھرے لہجہ میں لیکن اپنی موروثی راجپوتانہ بے باکی کے ساتھ شروانی صاحب کو لکھا کہ "آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں"۔[3] یہ خیال شبلی کے دل و دماغ میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے باوجود مزید غور و فکر برابر جاری تھا۔ وہ اپنے شاگرد مولوی مسعود علی ندوی کی انتظامی صلاحیتوں سے بخوبی واقف اور ان کے معترف تھے، ان کے ذریعہ بھی محمود آباد میں ایک جگہ کی کوشش کرنے کے لئے انھیں لکھا تھا۔[4]

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ۱۳

[2] مولانا شبلی دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مسجد کے مشرق میں مدفون ہیں

[3] مکاتیب شبلی نمبر ۱۱۵

[4] مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ۱۵

مولانا شبلی جگہ کے تعین کے لئے ابھی مذبذب ہی تھے کہ ان کے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب کے انتقال (اگست ۱۹۱۴ء) نے انھیں اعظم گڑھ کے مستقل قیام پر مجبور کر دیا اور ان کی تمام تر توجہات اعظم گڑھ کو اپنے خواب کی تعبیر بنانے پر مرتکز ہو گئیں اور بالآخر اپنا باغ اور دو بنگلے دار المصنفین کے نام وقف کر کے آن کی آن میں تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ کام کے آغاز کے بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں سید صاحب کو لکھا کہ

> "تمہارا بہت انتظار رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ وہ تو اس ویرانے کو علمی کوششوں کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہو گئیں ہیں۔ چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلے کے بغل میں مختصر سا دار الضیوف بن گیا ہے۔"[1]

اس پورے مہینہ بھی تعمیر دار المصنفین کا کام جاری رہا اور جیسے ہی موقع ملتا، سیرت لے کر بیٹھ جاتے لیکن اکتوبر کے آخر میں شبلی مرض الموت میں گرفتار ہو گئے اور اپنی بیماری کی اصلیت سے واقف ہو جانے کی وجہ سے سیرت کی تکمیل کی طرف سے مایوس رہنے لگے اور جب نومبر میں اپنی زندگی سے بالکل ہی مایوس ہو گئے تو وفات سے چند روز قبل سیرت کا مسودہ ایک کپڑے میں بندھوا کر الماری میں منتقل کرا دیا اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، انھوں نے اپنے تیمار دار اعزّہ کو یہ وصیت کر دی کہ یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں۔ ان کے سوا کسی کو ہرگز نہ دیئے جائیں، یہ جملہ سید صاحب کی علمی استعداد، اور شبلی کے قلبی تعلق و اعتبار کا بہترین مظہر ہے۔ شبلی کی یہ بیماری صرف ایک ماہ رہی اور تعمیر کا کام ان کی علالت کی وجہ سے پندرہ بیس روز پہلے ہی بند ہو گیا تھا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو دار المصنفین اور درجۂ تکمیل کی حسرت لئے ہوئے قوم اور ندوہ کا یہ نیّر تاباں غروب ہو گیا۔

ہر انسان اپنے عزیز کی دائمی جدائی پر حسب تعلق رنجیدہ ہوتا ہے، شبلی کی وفات سید صاحب کے لئے ایک شخص کی وفات نہیں تھی بلکہ "موت العالم موت العالَم" کے مصداق

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم نمبر ۱۸

ایک جہاں کی موت تھی، ہر لمحہ کے نگراں، رہبر اور سرپرست کی وفات تھی، انتہائی قریبی عزیز اور سید صاحب کے دس سالہ رفیق محبوب استاد کی وفات تھی۔ اس لئے جیسا اثر ہونا چاہیئے وہ سید صاحب پر ہو کر رہا۔ وہ ہر وقت خاموش خاموش اور مایوس سے رہتے۔ کبھی رقّت و ابتہال کا غلبہ ہو جاتا۔ کبھی گوشہ گزیں ہو جاتے۔ غرض وہ سراپا غم بنے ہوئے تھے اور جب اس غم کی ضرب نے شعری حس کے مضرات تک رسائی حاصل کر لی تو "نوحۂ استاد"، کے نام سے کچھ نغمے پھوٹ نکلے جو ظاہر ہے، وقتی نظم یا رسمی اظہارِ عقیدت نہیں بلکہ مسلم الثبوت اور کامل فن استاد کے غم میں معنوی فرزند سعید کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز تھی۔ اس کا ایک ایک مصرعہ غم کی بھٹی میں تپ کر نکلا تھا جو اپنے خالق کے بڑا شاعر نہ ہونے کے باوجود بڑا ہے۔ اس کا مطلع ہے

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

"فرماتے تھے کہ مجھ پر اتنا شدید غم کبھی طاری نہیں ہوا، مجھے وفورِ غم سے اپنی زندگی کی کوئی توقع باقی نہیں تھی اور دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ میرا خون جل گیا ہے اور چہرہ زرد پڑ گیا ہے، مولانا کی رحلت کے بعد عرصہ تک ان کا خیال ذہن و قلب پر اس درجہ چھایا ہوا تھا کہ جب میں مطالعہ میں غرق ہوتا اور کوئی مشکل مقام آجاتا تو بے خیالی میں کتاب لے کر مولانا کے کمرے کی طرف نکل پڑتا کہ یہ مقام حل کرا لوں لیکن دو تین قدم چل کر ان کی جدائی یاد آتی تو حسرت کے ساتھ لوٹ آتا[1] یہی بات مولانا مسعود عالم ندوی کو ایک خط میں اس طرح لکھی کہ باوجود اس کے میں مولانا مرحوم کی وفات و تجہیز و تکفین میں شریک تھا مگر بار بار بھول جاتا تھا کہ وفات پا گئے اور ان کی وہی ہیبت مجھ پر بعد وفات بھی تھی جو زندگی میں تھی"[2]

یہ تاثرات و احساسات آخر عمر تک ان کے ساتھ رہے، زندگی کے آخری برسوں

---

[1] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۴۳

[2] مکتوبات سلیمان مرتبہ مسعود عالم ندوی ص ۱۳۰

میں بھی ایک مرتبہ ان کا تذکرہ آیا تو موصوف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مولانا کے احسانات کا شمار ہی کیا ہو سکتا ہے، میرے پاس جو کچھ ہے وہ انھیں کا رہینِ منت ہے۔ یہ دو جملے ابھی سید صاحب کی زبان سے ادا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں نے سبقت کی اور ہدیۂ اشک محسن کی یاد پر نچھاور کر دیے۔[1] شبلی کے وفات کے تقریباً تیس سال بعد حیاتِ شبلی لکھی گئی اس وقت بھی ان پر شدید اثر موجود تھا۔ اس کے دیباچہ میں استاد کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے محسن کی شکرگزاری کے عنوان سے اسی قسم کے والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔

غرض شبلی کی وفات نے سید صاحب پر گہرے نقوش اور دوررس اثرات چھوڑے ساتھ ہی ان پر بہت سی ذمہ داریاں بھی ڈال دیں۔ بالخصوص شبلی کی وصیت کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی اسی کے ساتھ دوسرے نامکمل کاموں کی تکمیل بھی اہم مسئلہ تھا، شبلی نے سید صاحب کی تربیت اس انداز سے کی تھی کہ شبلی کے انتقال سے پہلے ہی سید صاحب طبقۂ خواص میں ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جا چکے تھے۔ اُن کی رفتار و گفتار، افکار و کردار، اندازِ فکر و نظر، تحقیقی تاریخی مزاج سب کچھ شبلی کا نقشِ ثانی معلوم ہوتا تھا اور شبلی کا عکس اُن کے قلب و ذہن میں بس گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد پونا کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری کے عہدہ کو (جو اس وقت ایک عالی منصب تھا اور آئندہ ترقی کے روشن امکانات کا حامل تھا) خیرباد کہدیا۔

> "سلیمان اس وقت نوجوان تھے، کوئی ۲۹۔۳۰ سال کی عمر کے، اور کس نوجوان کے دل میں دنیوی ترقیوں کے ارمان اور مالی خوشحالی کے حوصلے نہیں ہوتے، مرنے والے کی وصیت (سلیمان.... سیرت.... سب کام چھوڑ کر سیرت....) کو سنا، ظاہری کانوں سے نہیں گوشۂ دل سے سنا اور تعمیل اس طرح کی کہ شاید استاد مرحوم خود بھی اس طرح تکمیل نہ کر پاتے۔ رفیقوں جلیسوں نے سید الطائفہ کہہ کر پکارا اور خانقاہ شبلی کے اس جنید پر لقب پوری طرح چھا کر رہ گیا۔"[2]

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۴۴

[2] مولانا عبدالماجد دریابادی صدقِ جدید ۴ر دسمبر ۱۹۵۵ء ص ۳

چنانچہ شبلی نے دارالمصنفین کا جو خاکہ[1] تیار کیا تھا سید صاحب نے اس کی تعمیر اور استاد کے شروع کئے ہوئے سبھی کاموں کی تکمیل کا تہیہ کر لیا، اس لئے کچھ دن تو وہ کالج سے چھٹی لیتے رہے اور ملازمت سے سبکدوشی کے مناسب حیلے تلاش کرتے رہے۔ جب جب ضرورت ہوتی پونہ سے آکر کام دیکھ جاتے لیکن بالآخر اپنے احباب اور شبلی کے عقیدت مندوں کے اصرار پر نومبر ۱۹۱۵ء میں پونہ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دے کر آستانۂ استاد پر آکر جم گئے۔[2]

ظاہر ہے دارالمصنفین کا اتنا بڑا منصوبہ کسی فرد واحد کے ذریعہ عمل میں لانا ممکن نہیں تھا دوسری طرف شبلی کے چاہنے والے تربیت یافتہ منتخب افراد کی ایک پوری جماعت موجود تھی جو اس مشن کی تکمیل کا سلیقہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس میں پوری دلچسپی بھی رکھتی تھی۔ چنانچہ یہ سب حاشیہ نشینانِ شبلی سر جوڑ کر بیٹھے اور وفات کے تیسرے روز ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر "اخوان الصفا" کے نام سے پانچ افراد پر مشتمل ایک مجلس تاسیس قائم ہوئی جس کے ارکان یہ تھے۔ مولانا حمید الدین فراہی، رئیس مجلس، سید سلیمان ندوی ناظم، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم۔

شبلی کے باغ و بنگلے کے وقف کی تکمیل کا جو کام باقی تھا، اعیان شہر اور شبلی کے اعزہ کے اشتراک سے مکمل کرایا گیا اور آمدنی کی ابتدائی صورت پیدا کرنے کے لئے سید صاحب اور مولانا حمید الدین ۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو بھوپال جاکر والیٔ ریاست سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے صورت حال عرض کی، موصوفہ نے سیرت کی امداد (دو سو روپیہ) جاری رکھنا منظور کر لیا، اس کے علاوہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے شبلی کے لئے جو تین سو روپیہ وظیفہ آتا تھا مولانا حمید الدین اور نواب عماد الملک کی کوششوں سے وہ بھی دارالمصنفین کے نام منتقل کر دیا گیا۔ ۲۵ مئی کو ۱۹۱۵ء دارالمصنفین

---

[1] شبلی، تعمیر کا کام شروع ہونے سے صرف دو ماہ بعد ہی اپنا پورا خاکہ چھوڑ کر وفات پا گئے تھے جس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔

[2] انہی اسباب کی بنا پر ضلع پٹنہ کے باشندے (سید صاحب) نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر اعظم گڑھ میں رہائش اختیار کر لی اور زندگی کے ۳۵ سال وہاں بسر کئے۔

کا پہلا جلسہ ہوا جس میں حسب ذیل افراد کو دار المصنفین کا رکن اساسی منتخب کیا۔

مولانا حمید الدین صدر، مولانا سید سلیمان ناظم، مولانا مسعود علی منیجر، حامد نعمانی ابن شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نواب سید علی حسن خاں لکھنؤ، پروفیسر شیخ عبد القادر پونہ، مولانا عبداللہ عمادی، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی حیدر آباد اور مولانا عبد الماجد دریابادی ارکان۔

مولانا عبد السلام ندوی جو شبلی کے تصنیفی تربیت یافتگان میں اہم مقام رکھتے تھے اس وقت الہلال کلکتہ میں تھے اور اب تک دار المصنفین میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔ سید صاحب کے اصرار پر مئی ۱۹۱۵ء میں ہی ان کو بھی بلا لیا گیا اور ۴ر جولائی کو مجلس دار المصنفین کا رجسٹریشن کرا لیا گیا اس وقت کا دار المصنفین کچھ اس طرح کا تھا۔

اس کے پاس پندرہ بیگھ پختہ کے دو باغ تھے جس میں دو وسیع بنگلے تھے ایک میں دار المصنفین کا دفتر اور کتب خانہ تھا دوسرے میں دار المصنفین کے کارکن رہتے تھے، یہی مہمان خانے کا بھی کام دیتا تھا۔ کتب خانہ میں پندرہ سو کتابیں تھیں جو زیادہ تر سیرت کے متعلق تھیں۔ دار المصنفین کی مستقل آمدنی ساڑھے پانچ سو روپیہ ماہوار تھی، اسٹاف میں پانچ آدمی تھے سید صاحب، مولانا عبد السلام صاحب، مولانا مسعود علی صاحب، حاجی معین الدین صاحب ندوی ایک مسودہ نویس، ان کی تنخواہ بالترتیب سو، سو، پچاس، تیس، بیس ماہوار تھی، دار المصنفین کے مجوزہ نقشے میں دار التصنیف، دار الاشاعت، دار الکتابت، پریس کا قیام اور ایک علمی رسالہ کا اجراء تھا مگر ابتدا دار التصنیف اور دار الاشاعت سے ہوئی۔ شعبۂ تصنیف میں شروع میں صرف دو آدمی تھے سید صاحب اور مولانا عبد السلام ندوی، دار الاشاعت کا آغاز مولانا شبلی کی تصانیف کی اشاعت سے ہوا پھر جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی رفتہ رفتہ دوسرے شعبے قائم ہوتے گئے۔[1]

اس کے بعد عمارت بننی شروع ہو گئی، کتب خانے کا باقاعدہ سنگِ بنیاد رکھا گیا اور بڑی تیزی سے کام شروع ہو کر مکمل ہوتا گیا۔ مولانا مسعود علی صاحب علمی آدمی تو نہیں تھے لیکن ان کے اندر غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں تھیں اور ایسے کاموں کے لئے شبلی کی نگاہ انتخاب بھی ان ہی پر پڑتی

---

[1] بحوالہ حیات سلیمان ص ۱۰۰-۱۰۱

تھی اس لئے تعمیرات کا کام از اول تا آخر موصوف کی خصوصی نگرانی کا رہینِ منت ہے۔ انھوں نے تعمیرات کی تمام تر ذمہ داری اپنے پاس رکھی اور اس سے بہت عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے، ساتھ ہی دارالمصنفین کے پورے انتظام پر ہر وقت گہری نظر رکھتے تھے اور ادائیگی فرض کی، بلا استثناً سب کو تنبیہ کرتے رہتے تھے۔ سید صاحب علمی آدمی تھے اس لئے مسعود صاحب انھیں ادارے کے دوسرے کاموں میں مشغول نہ ہونے دیتے تھے اور کسی بھی شخص کو کام کے دوران سید صاحب سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی اگر سید صاحب سے ملنا چاہتا تو یہ بات صرف کھانے پر ہی ممکن تھی۔ مولانا ابو علی اثری[1] کا بیان ہے کہ کتنی ہی مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے سید صاحب سے ملاقات کی کوشش کی اور وہ از خود کتب خانے کے اندر بھی آجاتے لیکن مسعود صاحب ان کے ساتھ ہو جاتے اور پھر کسی کی ہمت نہیں تھی جو سید صاحب کے انہماک پر ضرب لگا سکے۔ ایک مرتبہ دارالمصنفین میں کمشنر آ رہا تھا اس کے ماتحت افسروں کی پوری کوشش یہ تھی کہ سید صاحب اس کے استقبال کے لئے کتب خانے کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں، اجازت نہ ملی بڑی مشکل سے مسعود صاحب اس بات پر آمادہ ہوئے کہ اچھا تو جب وہ اندر آجائیں گے تو سید صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کر صرف ایک منٹ کے لئے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ سید صاحب کے مستقل ساتھی بھی اس بات کو مسعود صاحب کی غلطی نہیں بلکہ اصول بتلاتے تھے۔ مسعود صاحب کا کہنا تھا کہ “بھاگ دوڑ اور انتظامی کاموں کے لئے تو میں ہوں” دوسرے آدمی کے کام میں کیوں خلل پڑے اور اس پر وہ سختی سے کاربند رہے۔ آخر میں سید صاحب اور مسعود صاحب کے درمیان جو اختلافات ہو گئے تھے ان کے اسباب میں مسعود صاحب کے مزاج کی یہ سختی بھی شامل تھی۔

سید صاحب کی توجہات کا مرکز و منبع دارالمصنفین کے بنیادی مقاصد کی تکمیل تھی ان میں سیرت کی تکمیل، کتب خانہ کا فروغ، کتابوں کی تصنیف اور مصنفین کی تربیت وغیرہ شامل تھیں۔ موصوف نے جلد ہی اس کام کا آغاز کر دیا اور ۱۹۱۶ء میں “ارض القرآن” کے نام سے ان کی وہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی جو سیرت کے مقدمہ کے طور پر تیار کی تھی اور ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرنا ضروری ہو گیا تھا

---

[1] مولانا عبدالباری

چوں کہ اس وقت دار المصنفین کا پریس قائم نہیں ہوا تھا اس لئے ارض القرآن اور "مکاتیب شبلی" جلد اول مطبع شاہی لکھنؤ میں طبع ہو کر شائع ہوئیں۔ ان دونوں کتابوں کی تقدیم و تاخیر کا تعین اس لئے ممکن نہیں ہو سکا کہ ۱۶؍مئی ۱۹۱۶ء کو سید صاحب نے سید عبد الحکیم صاحب کو یہ اطلاع دی تھی کہ

> "مکاتیب جلد اول چھپ کر تمام ہوئی۔ الندوہ کی درمیانی جلدوں میں مکاتیب شبلی پر ایک مختصر مضمون ہے جس قدر جلد ہو سکے اس کی نقل بھیج دیجئے، تمہید لکھنی ہے "ارض القرآن" نصف چھپی ہے، اور سنئے "سیرت عائشہ" نصف مرتب ہو گئی"۔

اور معارف جولائی ۱۹۱۶ء میں مطبوعات کی فہرست میں بھی مکاتیب شبلی کا اشتہار موجود ہے۔ لیکن دار المصنفین کی تصنیفات میں "ارض القرآن" پر نمبر ا پڑا ہوا ہے اور مکاتیب پر نمبر ۲۔ اس سے مکاتیب شبلی کی اشاعت "ارض القرآن" کے بعد قرار پاتی ہے۔ اس تضاد و تصادم کے سلسلے میں تمام قسم کی قیاس آرائیوں سے گریز کرتے ہوئے یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "ارض القرآن" کی طباعت کا آغاز نمبر ا پر ہوا ہو گا اور کچھ حصہ طبع ہو کر کسی وجہ سے کام رک گیا ہو گا، پھر مکاتیب شروع ہو کر اس کی طباعت مسلسل و مکمل ہو گئی اور بعد میں "ارض القرآن" پایۂ تکمیل کو پہنچی ہو گی۔ بہر حال دار المصنفین کی اول و دوم مطبوعات یہی ہیں۔

سید صاحب خود بڑے مصنف بن چکے تھے اور ان کے ساتھ اہل علم و اہل قلم کی ایک جماعت موجود تھی اس لئے دار المصنفین کا مقصد صرف سیرت کی تکمیل تک محدود نہ تھا بلکہ یہاں سے دوسرے موضوعات پر کتابوں کی تصنیف و اشاعت اور ایک علمی جریدہ کا اجراء بھی اس کے بنیادی پروگرام میں شامل تھے۔ اس رسالے کے لئے دار المصنفین کے ذاتی چھاپے خانے کا قیام بہت ضروری ہو گیا تھا چنانچہ ارکان کی مسلسل جد و جہد کے بعد جون ۱۹۱۶ء میں پریس قائم ہو گیا اور اس کے اگلے ہی ماہ یعنی جولائی ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ "معارف" منظر عام پر آیا۔ یہ وہ دور تھا جب علمی رسالوں کے لئے فضا ناموافق تھی رسالے نکلتے اور چند روز میں بند ہو جاتے تھے۔ اس کے اسباب اقتصادی کے

کے ساتھ ساتھ علمی بھی تھے، صاحب فکر و تدبر اہل قلم کے قحط الرجال کی وجہ سے علمی تعاون ملنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی جب کہ دبستانِ شبلی میں مولانا شبلی نے الندوہ کے ذریعہ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والے بہت سے حضرات کی قابلِ رشک تربیت کی تھی جس کے طفیل مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ عمادی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبدالباری اور مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے باکمال اور اہل قلم اپنے اپنے میدانوں کے شہسوار بن کر نکلے اور جب دارالمصنفین سے معارف کا اجراء عمل میں آیا تو اس کے لیے لکھنے والوں کی تلاش باہر سے نہیں کرنا پڑی اور حسب ضرورت مضامین تیار ہو کر شائع ہوتے رہے۔ عام موضوعات سے قطع نظر تاریخی و تحقیقی مضامین پر جن کی حالت اس زمانے میں پست تر تھی، مولانا شبلی اور معارف کے اجراء کے بعد مولانا سلیمان ندوی نے خصوصی توجہ کی اور نئے لوگوں کی رہنمائی کی، ہر موضوع پر لکھنے والے تیار ہوتے گئے اور اقتصادی مشکلات کے باوجود محض قلمی تعاون کے سبب یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا اور یہی وہ واحد رسالہ ہے جو روز اول سے ان سطور کے قلم بند کرتے وقت تک کسی ایک ماہ بھی بند یا موخر نہیں ہوا، اس رسالہ سے قدیم جدید دونوں طبقے متاثر ہوئے، طبقۂ قدیم کو اس نے مذہب اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کیلئے نئے وسائل اور علمی مسائل کی تحقیق و تنقید اور انشا و تحریر کے نئے طریقوں سے آشنا کیا، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے مذہبی علوم اور ان کی تاریخ کی طرف متوجہ کیا نتیجتاً ان دونوں میں سنجیدہ و متوازن اہل قلم کی ایک جماعت بھی وجود میں آگئی اور دونوں طبقوں کے درمیان باہمی بُعد بھی کم سے کمتر ہوتا چلا گیا۔ یہ تمام اثرات اسی پہلے منشور کے نتیجہ اور کوششوں سے مرتب ہوئے جس کو سید صاحب نے معارف کے شمارۂ اوّل کے اداریے میں پیش کیا تھا، اس اداریے میں قحط الرجال اور قحط الرسائل کی تفصیلات اور وقت کی اہم ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے سید صاحب نے معارف کے مقاصد اور اس سے وابستہ توقعات کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"الندوہ سے رخصت ہو کر پانچ چھ مہینے[1] کے بعد آج ہم پھر پبلک میں آتے ہیں

---

[1] سید صاحب وغیرہ تو الندوہ سے ۱۹۱۲ء میں علیحدہ ہو گئے تھے لیکن یہ رسالہ دوسرے حضرات کی ادارت میں
(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور معارف کے نام سے ایک دوسرا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند"

> "فلسفۂ حال کے اصول کا ایک معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے، علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی، اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں۔ اگر صرف انھیں مضامین پر قناعت کر لی جائے تو بھی ہمارے نزدیک ایک بڑا کام ہے لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لئے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوان سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی"۔[1]

دارالمصنفین سے ارض القرآن اور مکاتیب شبلی کی اشاعت اور اس کے ماہنامہ کی علمی آب و تاب دیکھ کر ملک کے سنجیدہ اور اہل نظر حضرات نے دارالمصنفین کی اہمیت و عظمت

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) جاری رہا، اوائل ۱۹۱۶ء میں وہ مستقل طور پر بند ہو گیا تھا اور چند ماہ بعد معارف جاری ہوا۔ سید صاحب ندوہ، اور الندوہ سے علیحدہ ہونے کے باوجود بھی ہمیشہ ہمارا ندوہ اور ہمارا الندوہ ہی کہتے رہے اسی لئے یہ جملہ لکھا ہے۔

[1] معارف اعظم گڑھ شذرات، جولائی ۱۹۱۶ء

کا اعتراف کر کے اس کا خیر مقدم کیا اور معارف کی توقع سے زیادہ پذیرائی کی۔ اس کا شمار ملک کے بلند پایہ رسالوں میں ہوا، اس کی تقلید میں دائرۂ معارف مشرقیہ لاہور وجود میں آیا ۱۹۲۱ء میں انجمن ترقی اردو نے اپنا ماہنامہ "اردو" جاری کیا۔ اور بھی دوسرے رسالے جلدی جلدی شائع ہونے شروع ہو گئے جس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ غیر سنجیدگی کے خرمن میں وافر تعداد میں سنجیدہ مصنفین و اہلِ قلم اردو کے افق پر نمودار ہوئے اور معارف کے مدیر سید سلیمان ندوی اس نئی بیداری کے کاروانِ سالار کی حیثیت سے سامنے آئے۔

سید صاحب کے علمی انہماک، مشاغل اور مصروفیتیں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں ایک طرف اس کام کا آغاز ہو چکا تھا جس کی استاد نے وصیت کی تھی دوسری طرف معارف کی ادارت کی ذمہ داری اور اس کے لئے خود بھی مضامین لکھنا، تیسرے دار المصنفین کے حلقۂ احباب وسخا کو بڑھانے کی کوشش اور دار المصنفین کے دوسرے سبھی کاموں کی تکمیل جس کے لئے اکثر سفر بھی ضروری ہو جاتا وہ معارف کے شذرات میں اس طرف توجہ دلاتے، کتب خانہ دار الاشاعت اور مصنفین کے لئے اقامت گاہ کی ضرورت کو دلنشین انداز میں سمجھاتے مولانا عبد الماجد دریابادی کے توجہ دلانے سے راجہ محمود آباد (محمد علی خاں) نے اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کے لئے ایک لاکھ روپیہ دینا منظور کیا تو سید صاحب نے ایک ماہ کے اندر اندر اس کی پوری اسکیم تیار کر کے معارف میں شائع کی۔ فیاضانِ علم و ادب کی مناسب الفاظ میں ثنا گستری کی لیکن راجہ صاحب نے چند ماہ بعد اپنی منظوری کو خود ہی مسترد کر دیا اور یہ اسکیم[1] خیال سے عمل کی شکل اختیار نہ کر سکی۔

---

[1] یہ اسکیم حیات سلیمان میں درج ہے۔ طوالت کے سبب اس کو یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ البتہ اس کی اشاعت کے بعد اخبارات و رسائل نے اس کا پرجوش استقبال کیا تو سید صاحب نے اس کے جواب میں جو شذرہ معارف میں لکھا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے کام کی نوعیت کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اسی اجمال کی تفصیل اسکیم میں پیش کی گئی تھی۔

" اردو انسائیکلوپیڈیا کی جو تحریک ہماری طرف سے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔

(بقیہ ص آئندہ پر)

سید صاحب دار المصنفین، پریس، معارف وغیرہ کی ابتدائی منزلوں کی ترقی کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے علمی کاموں میں اس طرح منہمک اور گوشہ گزیں ہو گئے کہ دوسرا کوئی کام ان کے مرکز توجہ کو اپنے نقطہ سے ہلا نہیں سکا۔ موجودہ ارباب دار المصنفین کے علاوہ ایک صاحب جو ۱۹۱۶ء میں سنگساز کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے پینتیس سال تک سید صاحب کے ساتھ اور اس کے بعد ۱۹۷۹ء تک دوسرے حضرات کے ساتھ اس ادارے میں کام کرتے رہے۔ ان سے ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ سید صاحب ناشتہ کے بعد کتب خانے آتے تھے۔ دوپہر تک اس طرح یکسوئی کے ساتھ مسلسل بیٹھ کر کام کرتے، ایک گھنٹے کے لئے کھانا کھاتے اور ظہر کی نماز کے لئے اُٹھتے پھر عصر تک اسی طرح کام کرتے اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ عصر کے بعد باہر صحن میں بیٹھ جاتے، مولانا حمید الدین مولانا عبد السلام مولانا مسعود علی، مولانا عبد الباری وغیرہ احباب سے ملاقاتیں اور تفریحی باتیں کرتے، چائے کی ان ہی نشستوں میں آئندہ کے پروگرام طے ہوتے تھے۔ مغرب کے بعد پھر کام شروع کر دیتے لیکن آنکھوں کے پُرانے مریض تھے اس لئے ڈاکٹروں کی ہدایت پر کچھ عرصے کے بعد رات کی محنت چھوڑ دی تھی۔

معارف کے ابتدائی برسوں میں تو سید صاحب کو شذرات، وفیات، تبصروں کے علاوہ کبھی کبھی ہر شمارہ کے لئے ایک سے زیادہ مضمون بھی لکھنے پڑتے تھے اور بعد میں بھی صرف چند

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہم کو خوشی ہے کہ اکثر ارباب قلم اور معاصر اخبارات و رسائل نے اس کا خیر مقدم کیا اس کام کی حقیقی ابتدا تو اکتوبر ۱۹۲۱ء سے ہوگی لیکن ابتدائی کام کا نقشہ ابھی سے تیار ہو رہا ہے۔ تمام علوم کو ۱۷ اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر صنف کو ایک دائرہ بنایا گیا ہے۔ اس طریقے سے ۱۷ ادارے اب تک قائم کئے گئے ہیں۔ ہر دائرہ کا الگ الگ ایک دبیر خصوصی ہوگا جو ملک کا مشہور و مقبول عالم ہوگا۔ ملک کے جن اشخاص سے علمی اعانت کی امید ہو سکتی تھی زبانی یا تحریری ان سے تبادلۂ خیال ہو چکا۔ انسائیکلوپیڈیا میں مغربیات کے علاوہ مشرقیات کا بھی حصہ جی لگا کر لکھا جائے گا اور تحقیق کے معیار سے ایک حرف بھی فروتر نہ ہوگا۔ اس طرح امید ہے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا کام دے گی، مغربیات میں تمام علوم و فنون جدیدہ کے چیدہ اور منتخب حصے آجائیں گے، جدید علوم پر بیسیوں کتابوں کے لکھنے سے جو بات حاصل نہ ہوتی وہ اس مجموعے سے ان شاء اللہ حاصل ہوگی۔ (معارف جنوری ۱۹۱۷ء)

شمارے ایسے ملیں گے جن میں سید صاحب کے مضامین شامل نہیں۔ ان کے مضامین کے موضوعات کا دائرہ بھی محدود نہ ہوتا تھا بلکہ زمانہ کی ضرورت نئے سے نئے موضوعات پیش کرتی اور سید صاحب نہ صرف اس کا چیلنج قبول کرتے بلکہ تاریخی، تحقیقی، تنقیدی اور انشأ پردازانہ صلاحیتوں سے کام لے کر ہر ضروری موضوع پر سیر حاصل مضمون لکھ کر قارئین کو مطمئن کر دیتے تھے، اس کی مثال کے لئے ایک مختصر سی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے علمی کاموں اور ذمہ داریوں سے قطع نظر صرف معارف کے لئے ہر مہینہ ایک یا دو مضمون لکھ دینے والے سید سلیمان ندوی کو کتنے مختلف النوع موضوعات پر بیک وقت عبور حاصل تھا۔ اگست ۱۹۱۷ء سے اپریل ۱۹۱۸ء تک کی مسلسل فہرست حسب ذیل ہے۔

قرآن مجید کا منظوم اردو ترجمہ	اگست ۱۹۱۷ء
اہل سنت والجماعت	اگست ۱۹۱۲ء
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (ایک شاعر کی حیثیت سے)	ستمبر ۱۹۱۲ء
زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ	اکتوبر ۱۹۱۲ء
حسن بن منصور حلاج	اکتوبر ۱۹۱۲ء
ہوم لنگویج	نومبر ۱۹۱۷ء
مسلمانانِ ہند کی مذہبی تنظیم	" "
علامہ شبلی کی تیسری برسی	" "
نواب نور الحسن خاں کلیم	" "
وصایائے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی	دسمبر ۱۹۱۷ء
ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں۔	جنوری ۱۹۱۸ء
"مثنوی مجنوں لیلیٰ"	فروری ۱۹۱۸ء
سلطان ٹیپو کی چند باتیں	فروری ۱۹۱۸ء
"رموزِ بیخودی" کا تفصیلی تعارف اور تبصرہ	اپریل ۱۹۱۸ء

سید صاحب کی علمی شہرت تو الندوہ کے زمانۂ ادارت میں ہی عام ہو چکی تھی، دکن کالج پونہ کی ملازمت کے زمانہ میں تاریخ پر ان کا عبور اور اصابت رائے بھی مسلم ہو گئی تھی اسی لئے ۱۹۱۵ء میں انجمن ترقی اردو پونہ کے سالانہ جلسے کا صدر بھی موصوف کو بنایا گیا جس میں انھوں نے اردو زبان سے متعلق ایک تاریخی خطبہ پیش کیا تھا۔ ارض القرآن اور مکاتیب شبلی کی اشاعت اور پھر معارف کے متعدد شمارے دیکھ کر پورے ملک کے اہلِ نظر نے مختلف قسم کی قومی تقریبات میں سید صاحب کو شرکت پر آمادہ کیا اور اس طرح عظیم مفکر و مدبر کی خفیہ صلاحیتوں کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔" چنانچہ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انجمن علمائے بنگالہ کی طرف سے منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس کلکتہ کی صدارت پیش کی گئی، اس خطبۂ صدارت میں سید صاحب نے بنگال میں مسلمانوں کی تاریخ اُس کی اہمیت اور اس کی موجودہ حیثیت، ان کی تعلیمی و مذہبی ضروریات وغیرہ کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لے کر اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے مفید مشورے دیئے تھے۔

اسی زمانہ میں کانگریس، مسلم لیگ اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ میں ہو رہے تھے۔ سید صاحب نے رسمی تقریروں سے قطع نظر کر کے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ انگریزوں نے تاریخ کی کتابوں کے ذریعے ہندو مسلمانوں کے درمیان جو منافرت کا جال پھیلا دیا تھا اس کو بے نقاب کرنا ضروری تھا، سید صاحب شعبۂ تصحیح اغلاط تاریخی کی نظامت کے زمانہ میں اس موضوع پر اچھا کام کر چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس تعصب و منافرت کے انسداد کا علمی اور استدلالی طریقہ اختیار کرتے ہوئے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں "ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد حکومت میں" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پڑھا جس میں دکھایا گیا تھا کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کی تعلیم پر ابتدا سے کس قدر دلچسپی لی ہے اور آخیر وقت تک ان کی کوششیں بھی رہیں کہ تعلیمی اعتبار سے ہندو پس ماندہ نہ رہ جائیں۔ انھوں نے اس کے لئے ہندوؤں کو خصوصی وظائف اور انعامات دے کر تعلیم کی طرف راغب کیا۔ اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ مارچ ۱۹۱۸ء کے ایک اجلاس ناگپور[1] کے موقع پر ایک برہمن نے دس روپیہ کی رقم اِن الفاظ کے ساتھ

---

[1] ۱۹۱۸ء میں ندوہ کا سالانہ اجلاس ناگپور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی صدارت میں ہوا تھا اس میں سید صاحب کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا اور وہ کئی برس کے بعد ندوہ کی کسی تقریب میں شریک ہوئے تھے۔

پیش کی کہ "میں یہ حقیر رقم ان احسانات کی یادگار میں دیتا ہوں جو مسلمان بادشاہوں نے ہمارے اسلاف پر کئے تھے اور یہ روپیہ اسی فارسی زبان کی تعلیم پر صرف کیا جائے جس میں ہمارے بزرگوں کو سلاطین سے سندیں ملتی تھیں"[1]

ان قومی و ملی اجلاسوں میں شرکت سے سید صاحب کو یہ فائدہ پہنچا کہ اس سے قبل کرسی پر مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہونے لگی تھی، سفر سے یہ تکان دور ہو جاتی یہی سفر ان کی تفریح کا ذریعہ بھی ہوتے، شعر و شاعری کا ذریعہ بھی، عام مشاہدہ و معلومات کا وسیلہ بھی اور نت نئے تجربات کا منبع بھی۔ سفر ان پر سوار نہیں ہوتا تھا وہ چلتے وقت میز پر کام کرتے رہتے اور واپسی پر تکان کا احساس و اظہار کئے بغیر فوراً کام شروع کر دیتے تھے۔ سفر میں بھی وہ پوری طرح علمی رہتے، اپنی تقریر یا مقالہ میں آخر وقت تک قطع و برید کرتے رہتے تھے۔ "روزنامہ ڈان کراچی" میں سید صاحب پر ایک خصوصی مضمون شائع ہوا تھا جس میں لکھا تھا کہ

> "سید صاحب کی بڑی خوبی ان کی محنت ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن میں انھیں ایک بار ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ چند لمحے قبل بھی سید صاحب کو دیکھا گیا تو قلم ہاتھ میں تھا، کاغذ سامنے تھا اور وہ خیالات و نظریات کی اصلاح اور زبان کی ترمیم و درستگی میں مشغول تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس مقالہ کو پندرہ بار سے زائد مرتبہ دیکھ چکے تھے۔"[2]

ان تمام مصروفیات کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں سید صاحب کے دو کتابچے "اہل سنت والجماعت" اور "حیات امام مالک" طبع ہو کر منظر عام پر آئے اسی طرح استاد کی وصیت کی تکمیل کرتے ہوئے اگست ۱۹۱۸ء میں سیرۃ النبی کا حصہ اول مشتاق ہاتھوں میں پیش کر دیا۔ ستمبر ۱۹۱۸ء کے شذرات میں لکھا کہ

---

[1] مکاتیب سلیمان مرتبہ مسعود عالم ندوی ص ۸۲

[2] ریاض، کراچی ستمبر ۱۹۵۳ء "سید سلیمان ندوی" مترجمہ شاہ محی الحق فاروقی۔

> "چار برس کے شدید انتظار اور شدید مزاحمتوں کے بعد آخر سیرۃ النبی جلد اول شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ یہ جیسی بھی ہے اور جس طرح بھی چھپی وہ موجودہ حالات میں مغتنم ہے، آئندہ جلد کے لیے جو بالکل تیار ہے یہ سامان بھی مشکل ہے۔ کاغذ کی قیمت اب تگنے سے بھی زیادہ بڑھ گئی پھر بھی نایاب ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ کاغذ میسر آجائے تو تیسرے حصہ میں بھی ہاتھ لگایا جائے"۔[1]

۱۹۱۹ء تک سید صاحب کی شخصیت جامع بن چکی تھی، مغرب کے ضروری علوم ندوہ میں انگریزی تعلیم کے حصول اور زبان پر دسترس سے لیکر مشرقی علوم کے منتہائے کمال تک دارالمصنفین سے پونہ کالج تک سماجی بصیرت سے لے کر صائب سیاسی شعور تک سید صاحب ایک ہمہ گیر اور کامیاب رہنما کی حیثیت سے مقبول ہو رہے تھے ان کی شخصیت میں قدیم وجدید کا بہترین امتزاج پایا جاتا تھا، نئے پرانے کسی بھی حلقے میں اجنبی نہیں سمجھے جاتے تھے، جس طرح عربی مدارس میں ان کی عزت کی جاتی تھی اسی طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں میں وہ احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جس طرح دینی مسائل میں علما کے حلقوں میں سید صاحب کی وسعتِ نظر کا اعتراف کیا جاتا تھا اسی طرح ان کی تاریخی اور اثری تحقیقات کو نئے محققین کے حلقوں میں بڑی وقعت حاصل تھی۔ غرض وہ بڑی متنوع اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے، جو شخص بھی موصوف سے ملاقات کرلیتا، معتبر راویوں کا بیان ہے کہ وہ ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا، باطنی کمالات تو بعد میں سامنے آئے تھے ان کا ظاہر دیکھ کر ہر اعلیٰ ادنیٰ اور دوست دشمن ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ متعدد مشاہیر نے موصوف کا سراپا بیان کرتے ہوئے ان کی شخصیت میں بڑی کشش محسوس کی ہے یہاں صرف مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیانات نقل کئے جاتے ہیں جو باقی تمام بیانات کو بھی جامع ہیں۔ مولانا عرشی نے لکھا ہے کہ

> "سید صاحب ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ درمیانی قد، دہرا بدن، وجیہ چہرہ، متین اور باوقار شخصیت، دھیمی آواز کے ساتھ ایک صاحب کسی

---

[1] معارف ستمبر ۱۹۱۸ء

سے محو گفتگو تھے۔ یہی سید صاحب تھے"[1]

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بیان ہے کہ

> "سید صاحب کا نقشہ اسی وقت (میرے زمانۂ طالب علمی) سے آنکھوں کے سامنے ہے سراپا وقار، مجسم متانت، قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے کے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لباس ستھرا جس پر کہیں نکتہ چین اور دوربین کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے، آواز پست جو قرب کے باوجود بغیر قدر دانی اور شوق کے سنی نہ جا سکے، بالعموم کم گو اور بقدر ضرورت بولنے والے آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا اظہار کچھ نہاں کچھ آشکار جب کہیں تشریف لاتے تو مخالف اور موافق فضل و کمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہو جاتے، وہ اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج بک اور خوش مذاق تھے اور یہ مذاق بھی علمی و ادبی شان لئے ہوئے تھا"[2]

یہ تمام خط و خال - ۱۹۲۰ء تک ہی مکمل و متعین ہو چکے تھے بعد کی زندگی نے اس پر حاشیہ آرائی کا کام دیا ہے۔ ظاہری شخصیت کی یہ جامعیت اس پر باطنی کمالات اور علمی عظمت و جلالت کے امتزاج نے قدیم و جدید حلقوں میں انہیں یکساں طور پر مقبول ہی نہیں، مستند اور مسلمہ حیثیت کا مالک بنا دیا تھا اور ہندوستان میں ایسی جامع حیثیات شخصیت کی موجودگی میں ضرورت کے وقت نظر انتخاب "سید سلیمان ندوی" کے علاوہ کسی دوسرے پر کیوں کر ٹھہر سکتی تھی، خلافت کے وفد میں علما کی نمائندگی کا مسئلہ ہو یا حجاز کے حکمراں طبقہ کا باہمی تنازعہ ختم کرانے کے لئے رئیس وفد کی ضرورت ہو یا کوئی بھی دوسرا اہم کام ہو سید صاحب سے بہتر کسی

---

[1] ریاض مارچ ۱۹۵۴ء

[2] پرانے چراغ جلد اول ص ۲۲

شخص کا ملنا دشوار تھا چنانچہ ۱۹۲۰ء میں ترکی کی حمایت میں جب وفد خلافت کا انگلینڈ اور فرانس جانا طے ہوا تو مسلمانوں کے مذہبی علما کے نمائندہ کی حیثیت سے سید صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ اس وفد کے اراکین میں مولانا محمد علی جوہر (رئیس وفد) سید صاحب سید حسین مرحوم حسن محمد حیات اور مولوی ابو القاسم بنگالی شامل تھے۔

وفد خلافت کے بنیادی مطالبات یہ تھے کہ ترکی کی حکومت حسب سابق بحال و آزاد کی جائے، مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو انگریزوں کے وعدے کے مطابق غیر اسلامی اقتدار سے محفوظ رکھا جائے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کی جائے تبھی بلاد اسلامیہ کا تحفظ ممکن ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۰ء کے آخر میں یہ وفد روانہ ہوا، بمبئی کراچی موزع، وینس میں ٹھہرتے ہوئے ۲۵ فروری کو پیرس پہنچا وہاں معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ پر ہاؤس آف کامن میں کل ہی مباحثہ ہونے والا ہے فوراً ضروری تار وغیرہ دے کر پہلی گاڑی سے یہ لوگ روانہ ہو گئے اور دوسرے روز ۲۶ کی رات کو لندن پہنچے، وزیر اعظم کی تقریر ہو چکی تھی دوسرے ممبران تقریر کر رہے تھے۔

> "لیبر پارٹی کے بعض ممبر وفد کے طرفدار تھے، وزرا اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھوں میں رہے۔ آخر مسٹر بونر لا نے ایک بسیط تقریر کی اور معترضین کا جواب دیا لیکن وزرا اور ممبروں میں سے جو بھی وفد کے موافق کہلاتے تھے وہ صرف اپنی مصلحتوں کی بنا پر کہ قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھ میں لفظاً رکھنا چاہتے تھے حقیقی طور پر وہ بھی نہیں، یعنی ترکوں کو قسطنطنیہ پر کوئی اختیار نہ ہوگا تمام قلعے مسمار کر دیئے جائیں گے جہاز ڈبو دیئے جائیں گے اور استحکامات منہدم کر دیئے جائیں گے۔"[1]

اس وقت ارمنوں اور یونانیوں نے ترکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایسا جال بچھا دیا تھا کہ سارا یورپ اور امریکہ اس شور سے معمور تھا، پروپیگنڈہ یہ تھا کہ ترکوں نے ارمنوں اور یونانیوں کے لئے قتل عام کے دروازے کھول رکھے ہیں اور حکومت نے اسے روا رکھا ہے

۱۔ برید فرنگ ص ۱۵

یہ خبریں دن بدن مضاعف ہوتی رہیں، اس موضوع پر ناول و افسانے لکھے جاتے، ہاؤس آف کامن میں ان خبروں کے حوالے دیئے جاتے، اخبارات میں تار شائع ہوتے غرض یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جس سے خلاصی ممکن نظر نہیں آتی تھی وفد خلافت کو اس کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑی اور جہاں تک بن پڑا یہ لوگ مضامین و اخبارات کے ذریعے اس پروپیگنڈے کا جواب دیتے رہے۔ پندرہ روز تک یہ کام جاری رہا اور یہ لوگ فضا موافق کرنے کے لئے تمام ممکن ہتھیار استعمال کرتے رہے۔ ۱۱ مارچ کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کے قائم مقام مسٹر فشر سے وفد کی ملاقات ہوئی۔ مولانا محمد علی نے انھیں بتایا کہ اس وفد کے مطالبات پر ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان متحد ہیں۔ سید صاحب نے مسٹر فشر پر خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت واضح کی۔

وفد نے ترکوں کی حکومت کے قیام کے سلسلے میں اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن انگریز اس حکومت کے خاتمہ کا جو فیصلہ کر چکے تھے اسے تبدیل کرنے کے لئے وہ کسی طرح بھی تیار نہیں ہوئے۔ وفد کے بعض ارکان کبھی کبھی اپنے مقصد کے حل کے لئے پُرامید بھی ہو جاتے تھے لیکن سب لاحاصل۔

سید صاحب کسی بھی زمانے میں کتنی ہی معمولی یا غیر معمولی سیاسی شخصیت کے حامل رہے ہوں لیکن ان کی سیاسی بصیرت اس وقت قابل تحسین ہو جاتی ہے جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ ترکی سے متعلق انگریزوں کے رویہ کے آئینے میں ان کی دور رس نگاہوں نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا، وہ انگریزوں کے وعدوں سے ایک فیصد بھی مطمئن نہیں تھے اور یہ سہرا انھیں کے سر بندھتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں پہلی بار سید صاحب نے ہی "مکمل آزادی" کا مطالبہ قوم کے سامنے پیش کیا ان کا یقین کامل تھا کہ اس کے بغیر نہ ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ یہ مسلمان عالم اسلام کے لئے کچھ کر سکتے ہیں چنانچہ اگست کے آخیر میں مولوی عبدالباری صاحب کے نام ایک خط میں پہلے ایک طویل پس منظر بطور تمہید پیش کیا اور پھر عام ہندوستانی اور مسلمانوں کے لئے اپنا پیغام آزادی بھیج کر بات ختم کردی اور یہی سید صاحب کا سیاسی مسلک بھی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"مسلمان خود نصف صدی تک ہندوستان کی پالیٹکس سے الگ رہے اور بے فائدہ ہندوستان کے باہر کوہ و بیابان، بحر و بر اور صحرا اور ریگستانوں میں آوارہ پھرتے رہے حالانکہ منزلِ مقصود خود ان کا گھر تھا اگر ان کے ہاتھ خود ان کے گھر میں مضبوط ہوتے تو گھر سے باہر بھی ان کی آواز کی قوت ہوتی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان اور ہندوستانی ہونا ہندوستان سے باہر کس ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے۔ اس ذلت آمیز تخیل کے ساتھ بڑے سے بڑا دعویٰ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس کے منہ پر کہاں تک کھلتا ہے، لوگ ہم سے کہتے ہیں اور ہم شرمندگی سے اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ کہ تم جو اس زور و قوت کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو آزاد کرانا چاہتے ہو پہلے تو تم خود تو آزاد بن لو کیونکہ تم جن لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہو ان کی گرفتاری کے حقیقی سبب بھی تو تم ہی ہو جو خود تمہاری تلواروں کا مقتول ہو اس کے سرہانے تم اب ماتم کیوں کرتے ہو۔

خاتمۂ بحث کے طور پر سفرِ یوروپ کے خاتمہ پر اپنا سیاسی ایمان و عقیدہ، اب آپکے سامنے اور آپکے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں ..... اگر یوروپ کا چھ مہینے کا سفر، وزراء سے ملاقاتیں ارکانِ سیاست سے مباحثے، پولیٹیکل مجلسوں کی شرکت، عالمگیر اثر و اقتدار کے اخبارات کے ایڈیٹروں سے گفتگو، ممالکِ اسلامیہ کے حالات پر اطلاع یورپ کے سیاسی نظامات پر عبور اور موجودہ دنیا کی رفتار سے آگاہی کوئی تسلی بخش یقین و اطمینان قلب میں پیدا کر سکتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کعبہ اور مرقدِ اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیئے۔ اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے۔ اب علماء کرام کو نہ صرف درس و افتاء کی خدمات انجام دینا چاہیئے بلکہ ان کو صحیح راستے سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیئے جس سے وہ اپنے ملک کے آپ مالک ہوں، اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلا اور پیشہ ور اہلِ سیاست کی جولانگاہ نہ ہو بلکہ تمام مسلمانوں اپنے پورے مذہبی جوش اور دینی غیرت و حمیت کے ساتھ اس مقدس کام کے لئے

آمادہ ہو جائیں گے اور اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک وہ خود اپنے ملک میں آزاد نہ ہوں گے"۔[1]

یورپ کا یہ سفر سید صاحب کے سیاسی عروج کا زمانہ اور اس میں "سوراج" کی مانگ انکا مابہ الامتیاز کارنامہ ہے لیکن علمی آدمی کا سفر بھی علمی ہی ہوتا ہے، موصوف نے سیاست کے اس سفر کو بھی علمی رنگ عطا کر دیا۔ ان میں اخذ و اختیار کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ ہر جگہ سے کام کی باتیں نکال لیتے تھے، صدف کے بہت بڑے انبار سے ایک دو گہر نکال لانا محنت طلب تو ضرور ہوتا ہے لیکن باعثِ دلچسپی اور مسرت افزا بھی ہوتا ہے، سید صاحب کی دلچسپیاں بھی فزوں تر ہوتی گئیں اور پھر لندن جیسی جگہ جہاں جدید علوم و عقلیات کی پرستش ہوتی ہے، جہاں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم جیسی بے نظیر اور قابلِ دید عمارتیں موجود ہوں جہاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نظامِ تعلیم اور شاندار عمارتیں شمسی تعب و حرارت پیدا کر رہی ہوں جہاں مستشرقین سے ملاقات کے بھرپور مواقع اور وسائل میسر ہوں وہاں آٹھ ماہ رہ کر صرف سیاست آلود ہو کر واپس آجانا موصوف کے لئے باعثِ ننگ ہوتا۔ اسی وجہ سے وہاں سید صاحب کے جو قابلِ ذکر مشاغل رہے ان میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی سیر، یہاں اردو مطبوعات و مخطوطات کی تفصیل اور حیثیت دریافت کرنا انگلینڈ کے نظامِ تعلیم کا عمومی طور پر اور خصوصاً آکسفورڈ یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنا، خلافت، اس کے تمام متعلقات اور اسلامی حکومت کے بارے میں متعدد مقالے لکھنا۔ اس کے علاوہ حسب ضرورت اسلام، مسلمانوں خصوصاً ترکوں پر چاروں طرف سے جو حملے ہو رہے تھے۔ ان کا حتی الامکان جواب لکھنا وغیرہ شامل ہیں سید صاحب نے یہ ذمہ داری بھی اپنے اوپر لازم کر لی تھی کہ یورپ کی تمام کارروائیوں کی روئداد فوراً لکھ کر اپنے ہندوستانی دوستوں کو بھیجتے تھے۔ ظاہر ہے یہ نہ صرف طویل خط تھے بلکہ جن میں اس سفر اور مہم کے پورے حالات موجود ہیں بلکہ یہ اپنے موضوع پر ایک اہم دستاویز بھی ہے اور بعد میں یہ "برید فرنگ" کے نام سے شائع کی گئی تھی۔

---

[1] برید فرنگ ص ۱۱۱

لندن کے علمی کاموں میں انڈیا آفس لائبریری کی سیر کو اس لئے بھی خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اُردو تحقیق کی ضرورت، رفتار اور صورتِ حال سمجھانے میں بھی مدد کی، انگریز ہندوستان میں تجارت کے لئے آئے تھے وہ مادی تجارت کے ساتھ ساتھ علمی تجارت میں بھی سارا نفع خود ہی کما کر لے گئے۔ ہندوستان کے تمام ہی نادر مخطوطات ان کی لائبریریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ دوسری ذاتی اور سرکاری لائبریوں کا یہاں تذکرہ نہیں، سید صاحب کی تحقیق کے مطابق اس وقت تک صرف انڈیا آفس لائبریری میں اردو کی تین سو اہم قلمی کتابیں موجود تھیں۔ موصوف نے ممکن حد تک ان کتابوں کا مختصر تعارف لکھ کر معارف میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔

"انڈیا آفس لائبریری میں اردو کی مطبوعات" کے عنوان سے یہ مضمون جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں شائع ہوا۔ قلمی کتابوں کی بعض مزید تفصیلات سید صاحب کے ایک دوسرے خط سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں اس لائبریری کے اردو سیکشن کے انچارج انشی سالہ پروفیسر بلوم ہارٹ سے ملاقات کا تاثر بیان کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ

> "بہرحال انھوں نے (بلوم ہارٹ صاحب نے) انڈیا آفس کی اردو کی قلمی کتابوں کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ مجھے دیا۔ یہ فہرست بھی بے ترتیب ہے کوئی خاص ترتیب پیش نظر نہیں رکھی گئی ہے اس سے کسی چیز کا نکالنا بہت دشوار نظر آیا۔ بہرحال اتنا معلوم ہوا کہ اردو کی کل ۳۰۰ قلمی کتابیں یہاں ہیں، یہ زیادہ تر دلی سے ہاتھ آئی ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین کی دس بارہ تصنیفات ہیں، ہندی کی قلمی کتابیں کل سو ہیں، ہندی بھی پروفیسر بلوم ہارٹ ہی کے متعلق ہے، پروفیسر موصوف اردو کے بہت مداح ہیں اردو کو ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے مؤید ہیں، ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں۔"[1]

یہ ارکانِ وفد کیمبرج یونیورسٹی کو سرسری طور پر دیکھ سکے وہاں بعض مستشرقین سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، پروفیسر براؤن کے ساتھ دلچسپ علمی و ادبی ملاقات رہی، وہ سید صاحب

---

[1] برید فرنگ ص ،،

کو اپنا ہم ذوق دیکھ کر ان ہی کی طرف زیادہ راغب پائے گئے، پروفیسر موصوف نے "تاریخ دلکشا" کی دو جلدیں بھی ہدیہ کے طور پر سید صاحب کو پیش کیں، ہندوستان واپسی کے بعد بھی سید صاحب سے ان کی خط و کتابت رہی، ان کا ایک عربی خط اس وقت بھی دارالمصنفین میں محفوظ ہے۔

چوں کہ آخر میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی عمارت، اس کی فیکلٹیوں اور اس کے نظامِ تعلیم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نظامِ تعلیم، اس کی اصلاح و تبدیلی سے سید صاحب کو اسی وقت سے دلچسپی شروع ہو گئی تھی جب اُن کے آخری زمانہ طالبِ علمی میں مولانا شبلی نے ندوہ میں ان اصلاحات کا سلسلہ جاری کیا تھا اس کے بعد سے سید صاحب کی ان دلچسپیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور وہ مختلف مواقع پر اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے، آکسفورڈ کے نظام تعلیم اور ہوسٹل کے نظم سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے اور اس نتیجہ پہ پہنچے کہ تعلیم کا مقصد کسی علم میں حصولِ مہارت تک ہی محدود نہ ہو بلکہ تعلیم کو تمام تر توانائیوں کے ساتھ طالب علم کی مکمل شخصیت کی بالیدگی اور نشو و نما کا وسیلہ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ خامی نہ صرف عربی مدارس میں ابھی موجود ہے بلکہ ہندوستان کے مکمل نظام تعلیم کا ڈھانچہ اس اعتبار سے یورپ سے بہت مختلف ہو جاتا ہے اور سید صاحب نے اس میں تبدیلی کی بھرپور کوشش کی۔

جیسا کہ گزشتہ سطور سے واضح ہو چکا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسئلہ خلافت ہندوستانی مسلمانوں کا انتہائی جذباتی اور حساس مسئلہ بن گیا تھا۔ بڑے بڑے علماء و مفکرین اس کی حمایت میں اپنی توانائی صرف کر رہے تھے۔ اس مسئلہ سے سید صاحب کو بھی غیر معمولی دلچسپی تھی، انگلستان جانے سے قبل وہ اس کے لئے مقامی طور پہ آواز بلند کرتے رہے اور اس موضوع پر معارف میں متعدد مضامین لکھ چکے تھے لیکن وہاں جا کر جب حالات کا خود مشاہدہ کیا تو وہ بھی جذبات سے بے قابو ہو گئے۔ وفد کے ساتھ انگلستان جا کر جو کچھ بن پڑا وہ کیا، اپنی تحریروں سے اہل یورپ کے غلط افسانوں کے جواب شائع کراتے رہے، لیکن انداز بہر حال عالمانہ تھا۔ انگلستان کے ایک رسالہ مارننگ پوسٹ میں ایک اطالوی پروفیسر شرقیات کا مضمون "سلطان بحیثیت خلیفہ" شائع ہوا۔ اس پر انگشت نمائی پُر خطر بھی تھی اور مشکل بھی، سید صاحب نے اس کا بھی بے باکی سے جواب

دیا۔ ترکی کی خلافت کے وجود و بقا کی فکر و سعی سے سرشار سید صاحب نے اس کی اشاعت سے متعلق یہ ریمارک لکھا:

> "دیکھئے کون چھاپتا ہے، کمبخت کہتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد خلافت دنیائے اسلام میں نہیں رہی۔ فیوچر آف خلافت ان کا ایک رسالہ ہے جو اطالین وزارت خارجہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے[1]۔"

آٹھ مہینے کے اس سفر کے بعد یہ وفد ناکام ہو کر ہندوستان واپس لوٹ آیا۔ سید صاحب نے یہاں پہنچ کر تاریخی دلائل کے ساتھ خلافت کی اصلی نوعیت، اس سلسلہ میں غیر مسلموں اور ہندوستانی و غیر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و افکار پر متعدد مضامین لکھے۔ چنانچہ "خلافت اور ہندوستان" دسمبر ۱۹۲۰ء، خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار" مارچ ۱۹۲۱ء غزنوی سلاطین کے بیعت نامے "ستمبر ۱۹۲۱ء، دوسری بار "خلافت اور ہندوستان" اکتوبر ۱۹۲۱ء اور اس کے بعد فروری، مارچ، اپریل ۱۹۲۲ء کے شماروں میں "خلافتِ اسلامیہ اور دُنیائے اسلام" کے عنوان سے ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا اور اس سلسلہ کا آخری مضمون ۱۹۲۲ء میں بعنوان "خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف" لکھ کر شائع کیا۔ چونکہ اس وقت خلافت کا نعرہ بچے بچے کی زبان پر تھا اس لئے اس جذباتی فضا کے پیشِ نظر یہ مضامین غیر معمولی مقبول ہوئے اور بعض کو کتابی صورت میں بھی شائع کرنا پڑا۔

ترکی یا خلافتِ عثمانیہ اور جزیرۃ العرب کا مسئلہ یکساں ہونے کے باوجود اس وقت ایک نازک موڑ پر تھا، بنا بریں بہار میں ہونے والے خلافت کانفرنس کے اجلاس میں سید صاحب نے اپنا مبسوط خطبہ صدارت مذہبی نقطۂ نظر سے جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کی مداخلت" پر پڑھا، اسی طرح نومبر ۱۹۲۳ء کے شمارہ میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ارضِ حرم اور اس کے احکام و مصالح قرآن مجید کی نظر میں"۔ الغرض جب تک اسلامی ہند اور ممالک اسلامیہ میں شغفِ خلافت کو لعل بدخشاں کے ڈھیر کی حیثیت حاصل رہی اس وقت تک سید صاحب

---

[1] بریدِ فرنگ ص ۱۰۷

نے بھی خلافت پر ہر طرح سے خیال آرائی اور خامہ فرسائی سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

راولٹ ایکٹ (یعنی ۱۹۱۹ء کا وہ ایکٹ جس کی رو سے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنے والا ہر ہندوستانی گرفتار کر لیا جاتا تھا) اور امرتسر کے جلیانوالا باغ کے خونیں واقعہ (۱۹۱۹ء) کے بعد کانگریس اور خلافت ایک روح دو قالب کی مانند ہو گئے تھے، ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا، ہندوستانیوں کی اس ادا نے انگریزوں کو تڑپا کر رکھ دیا تھا اور وہ اس میں دراڑ پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے لیکن یہاں جوش و خروش کا یہ حال تھا کہ عوام سے قطع نظر مسلم علماء جو اکثر و بیشتر سیاست سے کنارہ کش رہتے تھے، انھوں نے بھی سر سے کفن باندھ لیا اور شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی روایت پر چل کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کی تقلید و حمایت اور تحریک آزادی کو تیز تر کرنے کے لئے نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا اور جمعیت نے کھل کر انگریزوں کی مخالفت میں صف بندی کی۔ انگریزی حکومت نے راولٹ بل کو واپس لینے کے ہندوستانیوں کے مطالبہ پر کان نہیں دھرے تو ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کلکتہ میں تحریک ترک تعاون (ترک موالات) کی تجویز پاس کی گئی اور دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور کے سالانہ اجلاس میں اس کی توثیق بھی کر دی گئی۔

وفد خلافت واپس آچکا تھا۔ اس کے اراکین کے ساتھ سید صاحب نے بھی اجلاس ناگپور میں شرکت کی، علی برادران نے گاندھی جی کی رہنمائی میں اس تحریک پر تیزی سے عمل درآمد شروع کرا دیا، پھر کیا تھا سرکاری ملازمتوں، سرکاری اسکولوں، کونسل کے ممبروں اور انگریزی خطاب یافتہ حضرات سب نے سرکاری اداروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور سب کا واحد شغلہ سیاست اور اس کا متحدہ پلیٹ فارم کانگریس بن گئی۔

اس وقت ملک و قوم پر ایسے حالات آگئے تھے کہ سید صاحب جیسی خالص علمی شخصیت کو بھی دارالمصنفین کی بہت سی ذمہ داریوں کے باوجود انگلستان سے لائی ہوئی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنا پڑا اور موصوف نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ جمعیت العلماء، خلافت اور کانگریس کے سرگرم رکن تھے اس لئے ان تینوں پارٹیوں میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ اقتصادی مشکلات و موانع کے باوجود ندوہ کی سرکاری امداد سید صاحب کی کوششوں سے

ہی واپس کر دی گئی۔ میرٹھ خلافت کانفرنس میں خلافت کے موضوع پر اپنا اہم خطبۂ صدارت پیش کیا۔ چونکہ دار المصنفین کا ہیرو خود ملکی سیاست کا اہم رکن تھا اس لئے اجلاس ناگپور کے بعد مشرقی یوپی کی سیاست کا مرکز اعظم گڑھ ہو گیا، مشرقی اضلاع کے دورہ کے وقت ملک کے سرکردہ لیڈروں کی قیام گاہ یہی دار المصنفین ہوتی تھی۔ مقامی طور پر بھی یہاں کام ہو رہا تھا اور دار المصنفین کے مینیجر مولوی مسعود علی عملی سطح پر خلافت کے کام کو سنبھالے ہوئے تھے۔ دار المصنفین کی اس مرکزیت اور سید صاحب کی اس اہمیت کے پیش نظر موصوف کو کانگریس کے دس ارکان کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔

اس کے بعد سید صاحب نے خلافت کے سبھی اہم جلسوں میں اور کانگریس کے غیر معمولی اجلاسوں اور کانفرنسوں میں پابندی سے شرکت کی، کہیں یہ شرکت صرف برائے نام ہوتی، کہیں عام تقریریں کرتے اور بیشتر جگہ خطبۂ صدارت پیش کرنے کا موقع ملتا تھا چنانچہ نومبر ۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں خلافت اور کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ دسمبر میں یہیں ایک ملک گیر سیاسی کانفرنس میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۲ء میں بہار کی صوبائی کانفرنس میں ایک اہم خطبۂ صدارت پیش کیا جس میں حرم پاک کی ضرورت، اہمیت اور اس کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کا بھرپور اظہار کیا اور اسی سال ارضِ مقدس کی داستان” کے عنوان سے یہ مضمون معارف میں شائع ہوا۔

۱۹۲۲ء میں کانگریس نے تحریک ترک موالات ختم کر دی اور اسی روز سے انگریزوں کی پرانی کوشش کے مطابق ہندو مسلم اختلافات کی گویا تجدید ہو کر ہندوستانی سیاست میں ایک نیا باب کھلا۔ اس دن سے آج تک لاکھ کوشش کے باوجود ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا مطلع ہمیشہ ابر آلود رہا ہے اس کا واحد سبب وہ فرقہ پرست ہندو تنظیمیں ہیں جو تاریخی تحریف کے انگریزوں کے پھیلائے ہوئے جال سے آج تک نہیں نکل سکیں ورنہ اہل بصیرت ہندو حضرات آج بھی یہ سمجھتے اور جانتے ہیں کہ یہ محض انگریزوں کی فریب کاری اور سازش تھی جس کو حقیقت سے بہت کم واسطہ ہے اور یوں بھی کون سی حکومت عوام پر ظلم نہیں کرتی۔ آج تو متعدد ممالک اور خود ہندوستان میں اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں پھر بعض جگہ اگر اتفاق سے ان مسلم حکومتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ غیر مسلم بھی ہوئے تو یہ نہ کوئی غیر روایتی بات ہے اور نہ ہی اس سے ہندوستان

کی تعبیر کی پورے آٹھ سو سال کی تاریخ مسخ کی جا سکتی ہے سیاسی ریشہ دوانیوں اور کبر و نخوت کے سایہ میں آکر قلبی بصیرت و بصارت غبار آلود اور اصابت رائے پاش پاش ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور غیر مسلموں میں بھی انصاف پسند، سیکولر ذہن رکھنے والے حضرات اس ماحول کو بہتر کرنے کے لئے مستقل فکرمند ہیں اور انگریزوں نے تاریخ کی نصابی کتابوں میں جو زہر بھر دیا تھا، مسلمانوں کے بیجا اور ناروا مظالم کی جو فرضی داستانیں تیار کروائی گئی تھیں، یہ حضرات ان کی نشاندہی کر رہے ہیں کوشش یہ ہے کہ اسے نصاب سے خارج کر دیا جائے اور تاریخ کی تصحیح کی جائے، عہد حاضر میں جس شدت سے مذہبی فضا کو مسموم کیا جا رہا ہے اسی طاقتور دانشورانہ اور عالمانہ کوشش اور سیاسی تدبر و حکمت عملی سے اس کا تدارک کرنے کی سخت ضرورت آپڑی ہے۔ سید صاحب اپنے مضامین، معارف کے اداریوں اور اپنی تقریروں میں بارہا اس طرف توجہ دلائی۔

ترکی میں خلیفہ کی حکومت ختم ہو چکی تھی لیکن ہندوستان میں تحریک خلافت بہت بعد تک جاری رہی اور کہا جا سکتا ہے کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں کی تھیں وہ ہندوستان میں رنگ لائیں۔ ہندوستان کی خلافت کمیٹی کبھی کانگریس کے ساتھ اور کبھی جداگانہ طور پر کام کرتی رہی، ترکی کے خاتمہ اور جنگ ختم ہونے کے بعد انگریزوں نے حجاز کی حکومت شریف حسین کے حوالے کر دی تھی۔ لیکن اہل حجاز شریف حسین کو غیر مخلص اور انگریزوں کی کٹھ پتلی متصور کرتے تھے اس لئے باوجودیکہ نجد کے حکمراں خاندان آل سعود اور اشراف مکّہ کے درمیان پرانی عداوت چلی آرہی تھی، ۱۹۲۴ء میں عبدالعزیز آل سعود حجاز پر حملہ کر کے طائف اور مکّہ پر قبضہ کرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور شریف حسین کو بھاگ کر جدہ میں پناہ لینی پڑی۔ حجاز کی خبریں کچھ مبالغہ کے ساتھ ہندوستان میں اس طرح پھیل رہی تھیں کہ نجدی لوگ اہل حجاز کا قتل عام کر رہے ہیں اور ان کے مقابر و مآثر کے انہدام کے درپے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ترکوں کی ہمدردی کا جذبہ ابھی پوری طرح سرد نہیں پڑا تھا کہ اس جذباتی مسئلہ نے حجاز والوں سے بھی ہمدردی پیدا کر دی اور وہاں کے مظالم کی خبریں سن سن کر یہ بیچین ہو جاتے چنانچہ خلافت کمیٹی

نے شریف حسین اور عبدالعزیز آلِ سعود کو تار بھیج کر اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا۔ دونوں کا جواب آیا کہ ہم حرم میں امن و امان چاہتے ہیں اور مشاہد و مقابر کی حفاظت کے خواہاں ہیں۔

لیکن حجاز کے حالات کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کی بےچینی کسی طرح کم نہیں ہوئی اور ۱۹۲۴ء کے آخر میں سید صاحب کی قیادت، مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری کی رکنیت میں خلافت کا ایک وفد حجاز کے لئے روانہ ہوا، جدہ میں شریف حسین سے گفتگو ہوئی، وفد نے کہا کہ حجاز میں دنیائے اسلام کے مشورہ سے جمہوری اور شرعی حکومت قائم ہو اور اس مقصد کے لئے مکہ میں اسلامی دنیا کی نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ شریف حسین نے اسے ناممکن العمل قرار دیا اور مزید بات چیت کے لئے وفد کو حجاز جانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ یہ وفد دو ماہ جدہ میں رہا۔ یہاں سے ناکامی پر اس نے مصر جاکر شیخ الازہر اور مصر کے دوسرے عمائدین سے گفتگو کر کے انھیں اپنی تجویز سے متفق کر لیا۔ یہ بڑی کامیابی تصور کی گئی، ہندوستان کے انگریزی اخبارات نے بھی بڑی سرخیوں میں اس کامیابی کو شائع کیا اور سید صاحب کو اس مہم کا سرخیل سمجھا گیا اس کے بعد یہ لوگ ہندوستان واپس آئے۔

یہاں سید صاحب کی سیاسی سرگرمیاں پھر جاری ہوگئیں، خلافت اور کانگریس کے اجلاس کانپور دسمبر ۱۹۲۵ء میں شرکت کی، جنوری ۱۹۲۵ء کے شذرات میں ان جلسوں کی افادیت پر تبصرہ کرنے کے بعد خلافت کمیٹی کو دوسرے اہم قومی کاموں کی طرف متوجہ کیا اور جامعہ ملیہ کے قیام کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا، تعلیم عامہ کی ضرورت پر خاص توجہ دلائی اور قریہ قریہ، قصبہ قصبہ میں مکاتیب، دارالمطالعہ اور مدارس شبینہ کا جال بچھانے کی تجویز پاس کرائی۔

مارچ ۱۹۲۱ء میں کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کا سالانہ اجلاس سید صاحب ہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ موصوف نے اپنے صدارتی خطبہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے علماء کی تنظیم و امارت کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا، انھیں گفتار سے زیادہ کردار کا غازی بننے کی طرف رغبت دلائی اور

بتایا کہ جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو اس وقت مسلمانوں کے مسائل ایک لازمی حل کے طلب گار ہونگے۔ مارچ ۱۹۲۶ء کے معارف سے ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> "ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ آئیندہ ہندوستان کی جو شکل و صورت بھی ہو بہرحال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر صورت جو خیال میں آسکتی ہے وہ ایک متحدہ جمہوریت کی ہے اس لئے ہر حال میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا کہ اپنے قومی و مذہبی ضروریات کے اپنے آپ کفیل ہوں۔ مسلمانوں کی اسلامی و مذہبی تعلیم، ان کے مدرسے ان کی مسجدیں، ان کے اوقاف، ان کے نکاح و طلاق و وراثت وغیرہ کے قوانین و مسائل خاص حکموں کے محتاج ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔"[1]

یہ باتیں مبنی بر حقیقت تھیں، اس لئے اس پر خاطر خواہ توجہ کی گئی، پاکستان تو اسلامی ملک کی حیثیت سے الگ ہو ہی گیا، ہندوستان میں بھی ان میں بیشتر معاملات کو آئین کے تحت رعایتیں دی گئیں۔

اپریل ۱۹۲۶ء میں دوسری بار سید صاحب کو عرب و حجاز جانے کا موقع ملا۔ اس کے پس پشت بھی ایک مذہبی و سیاسی جذبہ کام کر رہا تھا۔ دراصل اس وقت تک حجاز کے سیاسی حالات بہت محتاج امن و عافیت تھے کہ ۱۹۲۵ء میں سلطان سعود نے مدینہ پر قبضہ کر کے حجاز میں اپنی بادشا کا اعلان کر دیا اور جب بہت شور ہوا تو مسئلہ کے مذہبی پہلو پر غور کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں جون ۱۹۲۶ء میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک مؤتمر (مؤتمر عالم اسلامی) طلب کی۔ مستثنیات سے قطع نظر اس میں سبھی اسلامی ممالک نے شرکت کی۔ ہندوستان سے وفد خلافت سید صاحب کی قیادت میں روانہ ہوا۔ دوسرے ارکان میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر شعیب قریشی تھے۔ سید صاحب نے سلطان سے ملاقات کے دوران وفد کی آمد کا مقصد اور ہندوستانی مسلمانوں کی بے چینی پر روشنی ڈالنے کے بعد فرمایا کہ نجدیوں کے علاوہ دوسرے طبقے بھی تو مسلمان ہیں اور حجاز تنہا کسی کی ملکیت نہیں۔ یہ سارے عالم اسلام کا حق ہے۔ اس لئے دوسرے فرقوں اور مسلکوں کے زائرین کے مقابر و مآثر کا انہدام مناسب

نہیں ہے۔ موتمر کے انعقاد سے پہلے سلطان کے اس عمل پر ساری دنیا کو سخت تشویش ہے مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے سید صاحب نے بتایا کہ مقابر و مآثر دو جداگانہ چیزیں ہیں اول الذکر کے رکھنے پر آپ کو اختیار ہے اور موخرالذکر کو قرآن و حدیث اور دوسرے مآخذ سے کہیں بھی خلاف شرع ثابت نہیں بلکہ مآثر کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے اور یہاں (حجاز میں) مآثر ابراہیمی موجود ہیں۔ اگر شرعی اعتبار سے ان کی موجودگی پر حرف گیری کی گنجائش ہوتی تو سب سے پہلے قرآن پاک میں اس کی صراحت ہوتی اس لئے ضروری ہے کہ آپ (سلطان) ان چھوٹے اور معمولی مسائل کو چھوڑ کر مزید الجھنوں میں گرفتار نہ ہوں بلکہ تعمیری کام کرتے رہیں۔ اس کے بعد سلطان کی ہدایت پر ۲۱ مئی کو سید صاحب نے یہی خیالات بہت دلائل اور تفصیلات کے ساتھ مجلس العلماء کے سامنے رکھے اور اس کا خاطر خواہ اثر و فائدہ ہوا۔

۷ جون کو موتمر عالم اسلامی کا پہلا اجلاس ہوا جس میں سید صاحب کو نائب صدر کا اعزاز بخشا گیا اور صدر کی عدم موجودگی میں سید صاحب نے صدارت بھی کی۔ تمام اجلاس میں وفد خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کی تقریریں بہت ولولہ انگیز، بیباک اور موثر تھیں، بیشتر تجویزوں پر ان دونوں جماعتوں کا اتفاق تھا اس لئے وفد خلافت اور وفد جمعیۃ نے جو تجاویز پیش کیں دو تین کے علاوہ موتمر نے سب کو منظور کر لیا۔

اس سفر میں سید صاحب حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہونے کے علاوہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرتے رہے چنانچہ حرمین شریفین کے بڑے بڑے کتب خانوں، جامعات اور ان کے طرز تعلیم کو بھی دیکھا۔ ساڑھے تین ماہ بعد اواخر جولائی ۱۹۲۶ء میں یہ وفد واپس ہندوستان پہنچا۔ اس پورے سفر کی مفصل روداد سید صاحب نے ستمبر ۱۹۲۶ کے معارف میں پیش کی۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۶ء تک کا پورا عرصہ ہندوستانی سیاست میں اتھل پتھل اور بہت بیداری کا زمانہ ہے۔ ہندوستانی لیڈروں کی گرفتاری، رولٹ ایکٹ، جلیانوالا باغ کا واقعہ، جمعیۃ العلماء کا قیام، تحریک خلافت کا آغاز اور کانگریس سے اتحاد، وفد خلافت کا خاتمہ، ہندو مسلمانوں کے اختلافات، حجاز میں عبدالعزیز آل سعود کی حکومت کا قیام اور شریف حسین سے جنگ،

ہندوستانی مسلمانوں میں اس کے اثرات، موتمر عالم اسلامی کا اجلاس وغیرہ وغیرہ اس دور کی اہم سیاسی یادگار ہیں اور اتفاق سے سید صاحب جیسے گوشہ نشیں اور علمی شخص نے ان سبھی میدانوں میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ سات سالہ عرصہ سید صاحب کی سیاست کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، اس کے بعد ان کی آواز بند تو نہیں ہوئی لیکن اس میں سرگرمی نظر نہیں آتی۔

مجموعی طور پر سید صاحب ایک صاحب بصیرت سیاسی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ان کے متعلق چند باتیں مترشح ہوتی ہیں۔ سید صاحب کو شروع میں سیاست کا شوق اور دلچسپی نہیں تھی، وہ خالص علمی آدمی تھے اور اس حیثیت سے مطلع ہند پر چمکے۔

وہ عام مشاہد کی طرح اپنے گرد وپیش اور دنیا کے عصری حالات سے باخبر رہتے تھے نیز تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر انھیں زبردست عبور تھا۔

ایک صحافی ہونے کے علاوہ مدیر عالم ہونے کی وجہ سے انھیں مسلم مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ علم کا کاروبار اور سیاست کا پیشہ دو متخالف چیزیں ہیں دونوں کو ساتھ لے کر چلنا محال کی حد تک دشوار کام ہے۔ اس لئے وہ علم کو ترجیح دیتے تھے لیکن مسلم مسائل کی ضرورت انھیں کچھ وقت کے لئے خالص سیاسی بنا دیتی تھی۔ وہ سیاست میں آنے سے بہت کچھ خوش نہ ہوتے تھے اس لئے اس میں از خود شریک نہیں ہوتے تھے بقول خود "میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا اور کبھی شوکت علی نے اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا

حافظ زخود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اس گریز کے باوجود سید صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور جسے بعد میں حسرتؔ موہانی نے پوری شدت اور طاقت کے ساتھ مختلف مواقع پر پیش کیا۔

سید صاحب خالص مذہبی آدمی تھے اور مسلمانوں کی حمایت ان کا سیاسی شعار تھی اس لئے سیاست میں ان کی شرکت بیشتر مواقع پر مذہب کے نمائندہ کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء میں شرکت، انگلستان، حجاز کا سفر اور پھر موتمر میں شرکت مذہبی بنیاد پر ہی تھی۔

ہندوستان کے قومی مسائل کے میدان میں اترنے اور آزادی کا نعرہ دینے کے پس پشت بھی مسلم پرستی کی روح کام کر رہی تھی، ان کے اس زمانے کے سیاسی مضامین اور رسائل بھی اسی بات کے ترجمان ہیں البتہ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا امور میں امتیاز کے باوجود سید صاحب تنہا شخصیت نہیں تھے جو سیاست میں پیش پیش ہو جاتے تھے بلکہ اس دور میں تقریباً تمام ہی علماء سیاست میں شریک اور تحریک آزادی کے علمبرداروں میں تھے"، مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں نہیں رہ گئی تھیں بلکہ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔

یہی سبب ہے کہ سیاست ان کے علمی کاموں میں حائل ہونے کے بجائے معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آچکی تھی دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سید صاحب لندن جاتے وقت پریس کو دیئے گئے تھے اور دیباچہ وہیں سے لکھ کر بھیجا تھا، اسی سال سیرت عائشہ اشاعت پذیر ہوئی جس پر والیہ بھوپال نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ اس کو پڑھ کر علامہ اقبال نے انھیں لکھا کہ "سیرت عائشہ" کے لئے سراپا سپاس ہوں یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا"۔ ۱۹۲۴ء میں تین سالہ محنت و تحقیق کے بعد سیرت کی تیسری جلد شائع ہوئی۔ یہ پوری جلد معجزہ اور وحی پر ہے جس میں واقعات کی تلاش و تحقیق اور تنقید و تنقیح میں قابلِ تحسین جگر کاوی کی گئی ہے۔

ارض القرآن اور سیرۃ النبی کی جلد اول پھر دوم کے یکے بعد دیگرے مختصر عرصے میں شائع ہونے اور ان کی شہرت کی وجہ سے سید صاحب بہت جلد اتنے مقبول و مشہور ہو گئے تھے کہ علامہ اقبال اور ان جیسے دوسرے نامور علما کے علاوہ شرق و مغرب اور شمال و جنوب کے عوام و خواص براہِ راست اور بالواسطہ طور پر سید صاحب سے استفادہ کے مشتاق ہو گئے۔ جگہ جگہ سے دعوت نامے آتے، وہ ایک جان اور اتنے کام، سب کو قبول کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہو گیا تھا جہاں جاتے اپنا زبردست اثر چھوڑ کر آتے، ان کی منتخب مشغولیات میں سے مدراس میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساودرن انڈیا کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں آٹھ نشستوں میں ان کے سلسلۂ خطبات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ موصوف نے تقریباً ڈیڑھ ماہ

رہ کر سیرتِ نبوی کے موضوع پر آٹھ خطبات دیئے جن میں سیرت کے اخلاقی، سماجی، سیاسی مذہبی ہر پہلو کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یہ خطبات (خطبات مدراس) بجائے خود سیرت کی جامع کتاب کی حیثیت سے تسلیم کئے گئے، سید صاحب نے اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

> "ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے انگریزی اخبارات "ہندو" اور "ڈیلی ایکسپریس" میں برابر نکلتے رہے اور دلچسپی سے سُنے اور پڑھے گئے۔ اکثر حضرات کا اصرار ہے کہ ان خطبات کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شائع کردیا جائے، اس اصرار کی تعمیل کا خیال پیشِ نظر ہے۔
>
> شہر مدراس کے علاوہ بنگلور میں تین خطبے وانمباڑی میں دو، ترپانور میں ایک خطبہ مختلف مذہبی عنوانات پر دیئے گئے۔ بنگلور میں میری دوسری تقریر "زندہ نبی" کے عنوان پر ہوئی جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم اپنی سیرت، اپنی کتاب، اپنی سنت اور اپنی تعلیم کے لحاظ سے زندہ ہیں، اس لیے کسی دوسرے مدعی نبوت کے لئے اس دنیا میں جگہ نہیں"[1]

اس کے علاوہ سید صاحب وہاں کی قومی و ملی اہمیت کی مجالس میں میں بھی برابر شریک ہوتے رہے۔

۱۹۱۵ء کے انجمن ترقی اردو پونہ کے اجلاس میں وہ قومی سطح پر طلوع ہوئے اور پانچ سال میں وہ حیثیت ہوگئی تھی کہ ہر اہم قومی تقریب میں ان کی شرکت ضروری سی ہوگئی تھی وہ اس میں معزز مہمان کی حیثیت سے مدعو کئے جاتے اور خود اپنی دلچسپی سے ان میں شرکت کرتے تھے چنانچہ تاسیس جامعہ ملیہ (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں شرکت، مسلم یونیورسٹی وجود میں آنے کے بعد اس کے متعلق بعض اصلاحی مضامین کی تصنیف اس کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد (دسمبر ۱۹۲۲ء) میں شرکت، جامعہ ملیہ کے تقسیم اسناد کے جلسہ فروری ۱۹۲۳ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نومبر ۱۹۲۳ء وغیرہ میں شرکت موصوف کی اسی عظمت و شہرت کا نتیجہ ہیں۔

---

[1] معارف نومبر ۱۹۲۵ء

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معتمدی

مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی کا ایک اہم انقلاب اور حیرت انگیز واقعہ ندوہ کی معتمدی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ سے بساط شبلی اٹھی تو عرصہ تک سید صاحب سے دارالعلوم کو متعدی مرض کی طرح بچایا گیا، یہاں تک کہ دارالمصنفین کی تجویز پر جو ندوہ کی ہی پیدا شدہ تھی ندوہ سے بہت دور اعظم گڑھ جاکر عمل درآمد ہو سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت کے ارباب اقتدار کو ہر وقت شبلی گروپ کے دوبارہ اقتدار میں آجانے کا اندیشہ اور اپنا وجود معدوم ہونے کا خطرہ تھا لیکن چند سال کے بعد فضا صاف ہوگئی تو ۱۹۱۸ء میں پہلی بار ناگپور کے اجلاس ندوہ میں سید صاحب شریک ہوئے۔ گذشتہ اوراق میں یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ معارف کے پہلے اداریے میں بھی (جبکہ انھیں ندوہ سے علیحدہ ہوئے تین سال ہو چکے تھے) سید صاحب نے ندوہ سے محبت کا اظہار کیا ہے جو انھیں ندوہ سے ان کی وابستگی و موجودگی کے زمانہ میں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اختلاف محض افراد کا ہوتا ہے۔ اس میں ندوہ کا قصور نہیں اس لیے وہ اپنی دائمی تربیت گاہ اور مادر معنوی کی سربلندی کا ہر لحظہ خیال رکھتے تھے۔ ندوہ کی مدرسی کا زمانہ ہو یا الندوہ کی ایڈیٹری، الہلال کی ادارت ہو یا دکن کالج کی پروفیسری، دارالمصنفین کی سربراہی اور یورپ کی رکنیت ہو یا وفد حجاز کی ریاست، جامعہ ازہر میں تقریر ہو یا موتمر عالم اسلامی کی صدارت، کوئی موقع ایسا نہیں آیا جہاں انھوں نے ندوہ کی تعلیم و تربیت کی گہری چھاپ نہ چھوڑی ہو، ان کی ذات نہ صرف ندوہ کی ترجمان تھی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ایک متحرک ندوہ تھے۔ ظاہر ہے ایسے اطاعت شعار فرزند کو یہ مادر معنوی اور مادر علمی اپنے آغوش میں جگہ کیوں نہ دیتی۔

۱۹۲۳ء میں ایک بڑا حادثہ یہ بھی پیش آیا کہ ندوہ کے انتہائی مخلص و محنتی ناظم مولانا سید عبدالحئی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جانشینی کے لئے ندوہ کے اہل فکر و نظر نے غور شروع کیا اور بالآخر نگاہِ انتخاب سید صاحب پر جاکر ٹھہری اور موصوف کو ۱۹۲۵ء میں ندوہ کا معتمد تعلیم منتخب و مقرر کیا گیا۔ سید صاحب کا مستقر حیات تو دارالمصنفین اعظم گڑھ ہی تھا لیکن وہ پابندی سے لکھنؤ

آتے رہتے تھے۔ یہ منصب سنبھالنے کے بعد موصوف ندوہ کی اصلاح و تجدید کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ تعلیم میں ضروری اصلاح و ترمیم، لایق اساتذہ کا انتخاب، تعمیرات میں اضافہ اور ندوہ کے سالانہ اجلاس کا پابندی سے انعقاد وغیرہ ان کے بعض اہم اور قابلِ ذکر کام ہیں۔ ۹-۱۰-۱۱ فروری ۱۹۲۵ء کو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب خاں شروانی کی صدارت میں ندوہ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں سید صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر صوبہ سے دارالاقامہ کے لئے دس دس کمروں کا ایک بلاک تیار ہوا۔ اس کے لئے فی کمرہ ڈیڑھ ہزار کے حساب سے ہر صوبہ سے تخمیناً پندرہ ہزار روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس تجویز کا ہر صوبہ کی طرف سے خیر مقدم ہوا اور سال بھر میں رقم جمع کر کے دینے کا وعدہ کیا گیا۔ نواب صاحب موصوف نے بھی دس ہزار روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ اس تجویز کا اعلان کرتے ہوئے سید صاحب نے معارف کے ذریعہ عوام سے بھی امداد کی اثر انگیز اپیل کی۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں انبالہ میں اور نومبر ۱۹۲۶ء میں کانپور میں ندوہ کے اجلاس ہوئے اور ادارہ کی اصلاح و ترقی کے لئے مفید تجاویز پاس ہوئیں۔ تعلیمات سے سید صاحب کی غیر معمولی دلچسپی اور انگلستان مصر و حجاز کے تعلیمی اداروں کے مشاہدہ کے نتیجہ میں تجاویز زیادہ وقیع اور زیادہ متنوع ہو گئی تھیں اور ندوہ پر اس کا مثبت اور تعمیری اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ ندوہ کی ساکھ بحال ہو رہی تھی اور اسے رفتہ رفتہ عالمِ اسلام میں ایک ممتاز ادارہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ آخر وقت یعنی پاکستان جانے تک سید صاحب اسی انہماک اور مستعدی کے ساتھ ندوہ کی فلاح و ترقی کے لئے وقف رہے چنانچہ ان کی معتمدی کی پوری مدت ندوہ کی تاریخ میں ایک شاندار عہد سے تعبیر کی جاتی ہے۔ سید صاحب شبلی کے شاگرد تھے شبلی تقریباً سترہ برس علی گڑھ کالج میں پروفیسر رہ کر ۱۸۹۸ء میں وہاں سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ آخر دور میں سر سید سے ان کے سیاسی اور نظریاتی اختلافات ہو گئے تھے لیکن دونوں کی دوستی اور وضع داری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ شبلی کی وفات کے بعد سید صاحب نے مسندِ شبلی کو سنبھالا تھا اور وہ بھی معارف میں علی گڑھ کالج اور بعد میں یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے رہتے تھے۔

دسمبر ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی (کالج) کی پچاس سالہ جوبلی میں سید صاحب نے شرکت کی معارف میں اس کی روداد بھی لکھی جس میں وہاں کی انتظامیہ کی خامیوں اور کوتاہیوں پر توجہ

دلاتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کی اصل روح کے مطابق اس میں صرف اہل علم و اہل درد حضرات کی خدمات حاصل کرنے پر زور پر دیا۔ انھوں نے ہمیشہ ہی یونیورسٹی سے متعلق محبت بھرے لہجہ میں ہمدردانہ جذبات کا اظہار کیا۔ مفید سے مفید تر اصلاحوں کے مشورے دیتے رہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو ان مشوروں سے بہت فائدہ پہنچا۔ جب مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ علومِ مشرقیہ کا قیام عمل میں آنے لگا تو اس کی نصابی کمیٹی کا ایک ممبر سید صاحب کو بھی بنایا گیا۔ ۱۱ سے ۱۷ فروری ۱۹۲۶ء تک سات اجلاسوں میں اس کمیٹی نے میٹرک سے ایم اے تک نصاب تیار کرکے یونیورسٹی کے سامنے پیش کر دیا۔ لکھتے ہیں۔

> ”ہمارا کام ختم ہو گیا؛ اب نہیں کہا جا سکتا کہ منتظمین و ارکان یونیورسٹی اس کو رد کریں گے یا قبول کریں گے ہندو یونیورسٹی نے اپنے یہاں سنسکرت لازمی کر دی ہے اور ہم کو ابھی ردو قبول ہی میں پس و پیش ہے“[1]

علی گڑھ میں سید صاحب کی اہمیت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس نصابی کمیٹی کے قیام کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ جنوری ۱۹۲۷ء میں سید صاحب کو یونیورسٹی کورٹ کا ممبر منتخب کیا گیا جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا اور بقول رشید احمد صدیقی ”اُن کی رائے بہت متوازن اور بھاری بھرکم ہوتی تھی جس سے اختلاف کم ہی کیا جاتا تھا“[2]

۱۹۲۷ء کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں سید صاحب نے شرکت کی اور ”عہدِ رسالت میں اسلام کی اشاعت“ کے عنوان سے تقریر کی، وہ لاہور کے ماحول اور اہلِ علم و فن سے کافی متاثر ہوئے تھے چنانچہ واپسی پر معارف میں اس جلسہ کی روداد قلم بند کی تو اس شہر کو اہم علمی و ادبی مرکز و منبع قرار دیا۔

> ”اصحاب علم اور ارباب ادب کی جمعیت کے لحاظ سے وہ آجکل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے۔ ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، پرنسپل عبداللہ یوسف علی پروفیسر محمود شیرانی

---

[1] معارف فروری ۱۹۲۶ء

[2] معارف مئی ۱۹۵۵ء

پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر سراج الدین آزر، مولوی محمد علی، خواجہ کمال الدین، پروفیسر سید عبدالقادر، مولوی ظفر علی خاں اور متعدد ایسے اہل کمال اصحاب کی سکونت کا فخر اس کو حاصل ہے جن کے یکجا مرقع کمال کی مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی۔ اسی طرح کا بلکہ اس سے بھی اعلیٰ مجمع ادباء اور شعراء کا بھی ہے۔"[1]

اس موقع پر لاہور کے بہت سے عمائدین سے سید صاحب کی خصوصی ملاقاتیں رہیں۔ علامہ اقبال خط و کتابت کے ذریعہ پہلے سے متعارف اور ان کی تصانیف کے گرویدہ تھے۔ اُن سے ملاقات پہلی بار یہیں ہوئی۔ لکھتے ہیں "ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش قدمی فرمائی، قیام گاہ پر آئے، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانہ میں مدعو کیا جس کو وہ خود دار الفقراء کہتے ہیں اور میں دار الاقبال کہوں گا۔"

علامہ اقبال سے ملاقات کا تذکرہ آگیا ہے تو یہاں مختصراً دونوں کے درمیان تعلقات کا ذکر بھی نامناسب نہیں۔ علامہ موصوف شبلی سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد سید صاحب کو ان کا صحیح جانشیں تصور کرتے تھے اسی لئے ۱۹۱۶ء میں اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی تو انھوں نے سید صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ "اگر آپ اس جگہ کو پسند فرمائیں تو قبول کر لیں کیونکہ آپ کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لئے مفید ہوگا۔"[2]

لیکن سید صاحب نے دار المصنفین سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کیا۔ علامہ اقبال نے اس پر انھیں بہت دعائیں لکھیں اور لکھا کہ آپ جو کام کر رہے ہیں وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے[3]

۱۹۱۸ء میں "رموزِ بیخودی" شائع ہوئی تو سید صاحب نے اس پر تبصرہ لکھا اور زبان کی بعض خامیوں کا تذکرہ کیا اقبال نے اسے پڑھا تو خوش ہوئے اور بڑی محبت اور انکسار کے ساتھ لکھا کہ

---

[1] معارف مئی ۱۹۲۷ء

[2] اقبال نامہ مکتوب ۷،

[3] ایضاً مکتوب ۸،

آپ تبصرہ میں ہی غلطیوں کی نشاندہی کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی[1] پھر بہ اصرار معلوم کرنے پر سید صاحب نے وہ غلطیاں بھی لکھ بھیجیں۔ اس کے بعد سے علامہ اقبال سید صاحب سے مستقل طور پر علمی، ادبی اور مذہبی سطح پر استفادہ کرتے رہے، جو اشکالات پیش آتے لکھ بھیجتے اور سید صاحب جواب میں مطمئن کر دیتے، یہ تعلق بڑھتا رہا اور ۱۹۲۷ء میں پہلی بار لاہور میں ملاقات بھی ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان کی دعوت پر یہ دونوں حضرات افغانستان گئے تو وہاں عرصہ تک ساتھ رہنے کے بعد واپسی پر اقبال نے لکھا تھا کہ "علامہ سید سلیمان ندوی اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد ہیں"۔ اور پھر ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات پر سید صاحب نے پُر درد اور جگر سوز ماتم[2] کیا۔

علمی معرکہ آرائی: سید صاحب کی زندگی میں علمی معرکے اور ان کا قلمی جہاد بہت اہمیت رکھتا ہے یوں تو شعبۂ تصحیح اغلاط تاریخی سے منسلک ہونے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ شروع جو ہو گیا تھا اور اخبار "البشیر اٹاوہ" نے اس میں حرارت پیدا کر دی تھی لیکن ان کے علمی معرکوں کا باقاعدہ آغاز قیام لندن سے ہوا جہاں وہ خلافت مخالف لٹریچر کا جواب دیتے تھے۔ اسی وقت سے پروفیسر مارگولیتھ سے اختلافات کا آغاز ہوا جنھوں نے خلافت کی مخالفت میں مضمون لکھا تھا۔ سید صاحب نے اس کا جواب مجلہ "فارن افیرز" میں لکھا۔ وفد حجاز میں سلطان اور دوسرے علماء سے زبانی علمی معرکے رہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں اس کے سکریٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سے نہیں بنتی تھی اس کا سبب بھی نظریاتی ہی تھا۔ انگریزوں نے تاریخ میں تحریف کر کے جو نیا رخ دیا تھا، ہندو اس جال میں پھنس گئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف افسانہ طرازی کرنے لگے تھے۔ اس کے متعلق چاروں طرف سے سید صاحب کے پاس استفسارات آتے تھے۔ سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے شذرات میں ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دیا۔ ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کی جو داستانیں اور جو کہانیاں انگریزوں نے گڑھی تھیں ان کے غیر محسوس اثرات شروع ہو چکے تھے اور ہندو مسلم اختلافات بڑھنے لگے تھے۔ سید صاحب نے انگریزی حکومت کو اس

---

[1] اقبال نامہ مکتوب ۸۰

[2] ملاحظہ ہو یادرفتگاں ص ۱۳۷

طرف متوجہ کیا تو جواب ملا کہ یہ تو افسانے ہیں حقیقت سے انھیں کیا تعلق اور دوسری طرف عوام کے سامنے وہی چیزیں تاریخی دستاویز کی حیثیت سے مسلسل پیش کی جارہی تھیں۔ اس پر سید صاحب نے انگریزوں کے اس رویّہ کا دلچسپ اور غیر معمولی طنزیہ جواب دیا۔ اس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔

> "شترمرغ آپ جانتے ہیں کہ ایک عظیم الجثہ پرندہ ہے، اس کی نسبت فارسی میں ایک قصّہ ہے کہ جب ایک ایرانی شکاری نے اس کو پرند سمجھ کر شکار کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ میں تو شتر (اونٹ) ہوں اور جب اونٹ سمجھ کر اپنا سامان اور اسباب لادنا چاہا تو اس نے معذرت کی کہ میں تو مرغ ہوں اسباب لادنا میرا کام نہیں، بعینہٖ اسی طرح یورپ نے "تاریخی افسانہ" کے نام سے ایک علمی شترمرغ خلق کیا ہے۔ ناظرین کے سامنے جب اس کو پیش کیا جاتا ہے تو یقین دلایا جاتا ہے یا یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سرتاپا تاریخی واقعہ ہے اور جب آپ اس پر تاریخی حیثیت سے اعتراضات کریں گے کہ اس کے یہ مندرجہ واقعات اصلیت سے خالی ہیں تو جواب ملے گا کہ یہ تو افسانہ ہے اس میں تاریخی تطبیق کی تلاش کیوں ہے۔ یورپین افسانہ نویسوں نے اس طریقۂ تحریر کے ذریعہ ترکوں کی اخلاقی اور خانگی زندگی کی یہ بدترین تشہیر کی ہے۔ اب اس قسم کا پروپیگنڈا مسلمان سلاطین کے خلاف یورپین افسانہ نویسوں کے بہترین مقلد بنگالی مرہٹی اور گجراتی افسانہ نویس پھیلا رہے ہیں۔"[1]

مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیتھ کیمبرج کے تاریخ کے پروفیسر تھے، لندن کے قیام کے دوران سید صاحب نے ان کے بعض افکار و تخلیقات کا جواب دیا تھا۔ محمد بن عمر الواقدی اور اس کی کتاب المغازی سیر و مغازی پر ایک غیر معتبر و مشتبہ کتاب ہے۔ مارگولیتھ نے اپنی علمی و مستشرقانہ عمارت کی بنیاد اسی کو بنایا ہے، ایک انگریز نے اپنے ایک مضمون شائع شدہ مانچسٹر گارجین (لندن) میں مارگولیتھ کے حوالے سے پیغمبر اسلام کی شان میں بعض گستاخانہ

---

[1] معارف اکتوبر ۱۹۲۴ء

باتیں کہی تھیں اس کی اصلیت واقدی کی کتاب تھی۔ سید صاحب نے تحقیق و تنقید کے بعد علمی انداز سے ایک مضمون "واقدی" میں بہ استدلال واقدی اور اس کی کتاب کو غیر معتبر اور اسے محض داستان گو ثابت کیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ اسلامی ریویو (لندن) میں شائع ہوا۔ جسے دیکھ کر درہم یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مسٹر گویم نے اپنی کتاب "روایات" کے لئے سید صاحب کے پاس چند سوالات لکھ کر بھیجے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام متقدمین نے واقدی کو معتبر مانا ہے تو متاخرین کو اور آپ کو اسے غیر معتبر ٹھہرانے کا کیا حق ہے۔ سید صاحب نے ان تمام سوالات کا مدلل تفصیلی جواب لکھ کر "پھر واقدی" کے عنوان سے جنوری ۱۹۲۷ء کے معارف میں شائع کیا۔

اسی طرح ۱۹۲۲ء میں ایک یورپین مصنف نے کسی جگہ لکھا تھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ سید صاحب نے فروری ۱۹۲۲ء میں اپنے مفصل مضمون میں دکھایا کہ مسلمان فلاسفہ اور متکلمین یونان کے تمام بڑے بڑے فلاسفہ اور ان کے علوم و فلسفوں سے واقف تھے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ بعض مشہور ترین متکلمین نے ارسطو کا انتخاب کیا لیکن صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں میں فلسفہ کا دور متکلین مثلاً علاف، ابوالہذیل، نظام جاحظ اور ابوالحسن اشعری وغیرہ کی تصنیفات ہی کا دور ہے اور بعض حکماء نے تو ارسطو کے فلسفہ پر تنقید کر کے اس کی غلطیاں واضح کی ہیں۔

اس کے بعد عیسائیوں کی طرف سے ہی پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتوں کے لئے حد درجہ تنگ ہے اس پر سید صاحب نے "مسلمان عورتوں کے حقوق" کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک تفصیلی مضمون لکھا اس میں دکھایا گیا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی ناانصافیاں تھیں ان سب کا خاتمہ آخری پیغام ربانی اور تکمیل دین نے کیا ہے جس پر عمل کر کے عورتیں رہتی دنیا تک سکون و عزت کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہیں اور اس سے روگردانی کر کے ہمیشہ پریشانی اور ذہنی الجھنوں کا شکار رہیں گی۔[1]

اسی طرح سارڈا ایکٹ ۱۹۲۸ء میں نابالغوں کی شادی پر پابندی کے سلسلے میں بعض لوگوں نے نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو ناجائز بتایا اور اس پر حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر سے استدلال کیا۔ سید صاحب اگرچہ نابالغوں کی شادی سے متفق نہ تھے چنانچہ انھوں نے ایک محققانہ مضمون شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر پر لکھا اور نابالغ لڑکی کی شادی کو

---

[1] حاشیہ ص آئندہ پر

جائز ثابت کیا لیکن یہ اعتراف کیا کہ یہ ہر حال میں مستحسن نہیں ہے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسلامی شرع میں غیر اسلامی حکومت کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ۔

مرہٹی انسائیکلو پیڈیا شائع ہوئی تو اس میں پیغمبر اسلام کی سیرت کو مستشرقین اور متعصبین اسلام کے یہاں سے نقل کر لیا گیا تھا جس کا ہر جملہ مسلمانوں کے لئے خونچکاں تھا۔ سید صاحب نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بالآخر اس حصّہ کو انسائیکلو پیڈیا سے خارج کر دیا گیا۔

ماہنامہ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری اپنی ترقی پسندی کے جوش میں گاہ بگاہ اسلام مخالف مضامین لکھ دیا کرتے تھے، اسی طرح ان کے دوسرے حوارین کی تحریریں بھی اس میں شائع ہوتی رہتی تھیں اس کا موضوع عموماً وحی، قرآن مجید اور حدیث و سنت ہوتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں "نگار" میں "سنّت" پر دو مضامین شائع ہوئے جن میں حدیث کو ایک طرح سے غیر ضروری اور غیر معتبر قرار دیا گیا تھا۔ سید صاحب نے اگست ۱۹۲۹ء جولائی ۱۹۳۰ء اور اگست ۱۹۳۱ء کے شماروں میں مفصل، مدلل اور اصولی مضامین لکھے اس کا نتیجہ یہ ہوا بالآخر نیاز صاحب کو معافی نامہ شائع کرنا پڑا۔

اسی طرح اخبار اسٹیٹس مین میں صلاح الدین خدابخش کا مضمون اسلام کی مخالفت میں شائع ہوا تھا اور اس اخبار میں واقعۂ کربلا کے متعلق بھی ایک قابل اعتراض مضمون چھپا تھا۔ سید صاحب نے معارف میں ان کے دندان شکن جواب دیئے۔

مسلم یونیورسٹی کے ایک انگریز پروفیسر ڈاکٹر ٹرین نے ایک کتاب خلافت اور اس کی غیر مسلم رعایا کے نام سے لکھی تھی جس میں رعایا کے ساتھ حقارت آمیز اور غیر مساویانہ وغیر منصفانہ سلوک دکھایا گیا تھا۔ سید صاحب نے بڑے طنز آمیز لہجہ میں معارف کے شذرات میں اس بہتان طرازی کا سدّ باب کیا۔

---

[1] امریکہ و انگلستان سے شائع ہونیوالے روزناموں اور مختلف قسم کی سالانہ رپورٹوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے خدشات صد فیصد درست ہی نہیں نکلے بلکہ وہاں کے معاشرے میں عورت کا مقام ذلت و پستی کی انتہاؤں کو پہنچ چکا ہے، ہم روشن خیال خواہ کسی خوش فہمی میں رہیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وائل کی کتاب "تاریخ اقوام اسلامیہ" اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئیں، سید صاحب نے ارباب علم کو توجہ دلائی کہ ان کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق نہایت گمراہ کن اور لغو اعتراضات ہیں جس کو مسلمان برداشت نہیں کرسکتے۔ یہ احتجاج اتنا بڑھا کہ یہ دونوں کتابیں یونیورسٹی نصاب سے خارج کردی گئیں۔

"خیام" جو سید صاحب ہی کا نہیں بلکہ تاریخ و تحقیق کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کی بنیادی تحریک بھی ایک علمی معرکہ تھا۔ شبلی نے شعر العجم میں خیام پر ایک مضمون لکھا تھا۔ پروفیسر محمود شیرانی اور پروفیسر محمد اقبال (لاہور) نے اس کی مخالفت کی اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے رسالہ "اردو اورنگ آباد" میں ایک مفصل مضمون لکھا۔ سید صاحب نے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر کئی سال تک تحقیق و تفتیش کی۔ اور ۱۹۲۴ء کے معارف میں خیام پر ایک محققانہ مضمون لکھا پھر مزید مطالعہ اور غور و خوض کے بعد ۱۹۳۰ء کی پٹنہ کانفرنس "خیام" کے عنوان سے ایک بسیط اور بے نظیر مقالہ پیش کیا۔

مختصر یہ کہ علمی و مذہبی معرکہ آرائیاں سید صاحب کا خصوصی میدان بن گیا تھا، کوئی مضمون، کوئی اعتراض، کوئی غلط بات ادھر سے شائع ہوئی اور اگلے ہی لمحہ اس کا مدلل، مبسوط اور دنداں شکن جواب حاضر۔ اس کے لئے جھگڑالو اور مناظرہ والا ذہن و دماغ نہیں بلکہ زبردست مطالعہ، مختلف علوم کے ساتھ تاریخ پر عبور، اعلیٰ درجہ کی استعداد، غیر معمولی حاضر دماغی اور علمی انداز بیان درکار ہوتا ہے۔ سید صاحب اس میدان میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت ختم کرنے کے لئے سید صاحب نے جتنی کوششیں کی ہیں، کم لوگوں نے کی ہونگی اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ موصوف نے مرض کو سمجھ لیا تھا یہ مریض کا کام تھا کہ مجوزہ دوا اور معالجہ خود کرے۔ جب سے وہ تصحیح اغلاط تاریخی کے شعبہ سے منسلک ہوئے تھے تبھی سے ان کا ذہن اس معاملہ میں صحت مند اور صاف ستھرا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں انگریزوں کی تحریف سے یہ مرض پیدا ہوا تھا۔ سید صاحب نے اس کے لئے ہمیشہ علمی انداز اور طریقہ کار اختیار کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں اس مقصد کے لئے انھوں نے "ہندوؤں کی تعلیم مسلم حکمرانوں کے عہد میں" کے عنوان سے آٹھ قسطوں میں ہندو اور مسلمانوں کے

درمیان رواداری کے نمونے پیش کئے تھے، ۱۹۲۲ء میں تحریک ترک موالات ختم ہونے کے بعد ہندو مسلم جھگڑے شروع ہوئے تو پھر انھوں نے "مرض اور اس کی تشخیص" کے عنوان سے معارف میں مضمون لکھا، ان کا یہ مشن ہمیشہ جاری رہا اور وہ اپنی بات علمی پیرایہ میں پیش کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے ایک نئے انداز سے اس پہلو پر روشنی ڈالی، وہ پہلو یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان تعلقات کے آغاز کی صحیح تاریخ پیش کی جائے۔ انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر ان تعلقات کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے دکھایا ہے جس میں نفرت کا پہلو ہونا ظاہر ہے، سید صاحب نے اس کے برخلاف تاریخی حقایق و دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ طلوعِ اسلام سے پہلے ہی عرب تاجروں کا سندھ ملتان وغیرہ سے رابطہ قائم تھا۔ دو صدیوں کے یہ تعلقات اس وقت مزید خوشگوار ہوگئے جب سندھ پر محمد بن قاسم کی منصفانہ حکومت کئی سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی انھیں مقبوضہ بستیوں پر ہندوؤں کی حکومت ہوگئی۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا معاملہ رکھا تھا اس لئے اب ہندو حکمراں طبقہ بھی اپنے محکوم مسلمانوں کے ساتھ بڑی مروت سے پیش آتا تھا اور یہ تعلقات تجارت سے آگے بڑھ کر سیاسی علمی اور مذہبی بھی ہوگئے تھے۔ یہ غزنویوں سے کئی سو سال پہلے کے واقعات ہیں اس لئے یہ خیال کرنا کہ مسلمان اس ملک میں حملہ آور کی حیثیت سے ہی داخل ہوئے، غلط ہے۔ ان خیالات کا اظہار سید صاحب نے ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی فرمائش پر ۱۹۲۹ء میں دیئے گئے اپنے پانچ خطبات کے دوران کیا۔ یہ خطبات جس تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے ساتھ تیار کئے گئے تھے اس کی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں، مذکورہ اکیڈمی نے ان خطبات کو "عرب و ہند کے تعلقات" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں حکومت بمبئی کے شعبۂ تعلیم کے زیر اہتمام سید صاحب نے "عربوں کی جہاز رانی" پر چار خطبے پیش کئے، جن میں عربوں کی سمندر سے گہری واقفیت اور شوق اور جہاز رانی میں عربوں کی خدمات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اسی عنوان سے بعد میں شائع ہوئی اور اس کا انگریزی ترجمہ "اسلامک کلچر حیدرآباد" میں شائع کیا گیا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس اور ہسٹاریکل ریکارڈس سوسائٹی کے دو اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوئے اور نیٹل کانفرنس میں سید صاحب نے "خیام" پر ایک مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ پچھلے تمام مواد اور خیام پر لکھی گئی کتابوں سے جداگانہ اور ایک نئی نوعیت کا حامل تھا اس میں خیام صرف ایک عیاش اور نشے سے چور رباعی گو نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ ایک زبردست عالم نجوم و ریاضی، فلسفی، مہندس اور ایک راسخ العقیدہ، نیک مسلمان کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس دریافت نے نہ صرف تمام مشرقی محققین سے دادِ تحسین لی بلکہ یورپ کے سرکردہ مورخین و محققین کی بھی آنکھیں کھول دیں اور انھیں احساس ہوا کہ مشرقیات میں تحقیق کا پایہ ان سے بلند بھی ہے۔ اس اورینٹل کانفرنس کے عربی و فارسی سیکشن کا سید صاحب کو ممبر بنا لیا گیا۔ ہسٹوریکل ریکارڈس سوسائٹی میں مسلمانوں کی شرکت معدوم سی تھی، اس کا سید صاحب کو شدت سے احساس تھا اور وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر ایسا ہی رہا تو آئندہ جو تاریخ تیار ہوگی وہ موجودہ سے بھی بدتر ہوگی اور بڑی حد تک ان کے اس خدشہ میں صداقت موجود تھی۔ لکھتے ہیں۔

> "ہمارے مسلمان پروفیسروں اور مورخوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس مجلس کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا قالب ڈھالا جا رہا ہے حیف ہے اگر مسلمان اس صورت گری سے غافل رہے۔ ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب تاریخ اپنی شکل بدل چکی ہوگی اور معروضات واقعات بن چکے ہوں گے۔"[1]

یہ پیشن گوئی صد فیصد درست ثابت ہوئی، بیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے یہ قیاس حقیقت بنتا جا رہا ہے اور اس کے عواقب و نتائج بھی سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں۔ سید صاحب کی مصروفیات اور تمام قومی، علمی، تاریخی و تحقیقی کاموں اور مضامین کی اشاعت کے پہلو بہ پہلو استاد کی وصیت کا بہت خیال رہا۔ ۱۹۲۸ء سے اس کام میں وہ مستقل طور پر لگ گئے۔ سیرت سے متعلق مواد میز پر جمع رہتا۔ صبح سے دوپہر تک مسلسل بیٹھے رہتے۔ کھانا دارالمصنفین کے سبھی لوگ ساتھ کھاتے تھے کھانے پر انتظار ہوتا رہتا اور سید صاحب لکھتے

---

[1] معارف دسمبر ۱۹۳۰ء

رہتے کہ آرہا ہوں، آرہا ہوں، اس میں ایک ایک گھنٹہ گزر جاتا، یہ ایک دو دن کا واقعہ نہیں بلکہ ان کا معمول ہی بن گیا تھا، لکھنے کا اصل کام رات کے سکوت میں کرتے تھے، ایک خط میں عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ "سیرت نبوی کا کام شب میں کرتا ہوں، مسعود صاحب کلب سے دیر میں آتے ہیں۔ بنگلہ میں بالکل سناٹا رہتا ہے خوب یکسوئی رہتی ہے"[1] ۱۹۳۲ء میں یہ چوتھی جلد بھی شائع ہو گئی جس میں منصب نبوت کی حقیقت و خصائص اور اس کے فوائد کا ذکر کرنے کے بعد اسلامی عقائد پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سید صاحب کی ہر تصنیف ماقبل سے بلند درجہ اور زیادہ معلوماتی ہوتی تھی اور یہ اشتیاق رہتا تھا کہ اب کونسی کتاب شائع ہو اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے۔

سید صاحب کی معتمدی کے بعد سے ندوہ میں جدید عربی سیکھنے اور اس کے استعمال کا ذوق عام ہو چکا تھا۔ اب رفتہ رفتہ ایک عربی رسالے کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں عربی کے باذوق اور ذی استعداد طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سید صاحب نے مولوی مسعود عالم ندوی کی ادارت میں ایک ماہنامہ "الضیاء" جاری کیا جس کے انوار سے اہل ندوہ ہی نہیں باہر کے لوگ بھی منور ہوئے اور مصر و شام اور عرب ممالک میں ندوہ کے عربی معیار نے استناد کا درجہ حاصل کر لیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ۱۹۳۳ء میں سید صاحب کو شعبۂ اردو انجمن اردوئے معلیٰ میں تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی اور سید سلیمان ندوی کے باہمی تعلق پر رشید صاحب ہی کے چند خیالات نقل کئے جائیں جو اس تقریب کی تمہید بھی ہوگی اور ان میں سید صاحب کی شخصیت کی عظمت سے متعلق رشید صاحب جیسے دانشور کی زبانی بعض مزید گوشے بھی بے نقاب ہوں گے۔

> "سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا۔ کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے

---

[1] معارف نومبر ۱۹۵۶ء مکتوبات سلیمانی

جو علوم مشرقیہ یا مذہبی و ادبی مسائل سے متعلق ہوتے۔ یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا۔ تقسیم سے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے۔ سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے اور اکثر اہم مواقع پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا۔۔۔ عرصہ ہوا میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڑھ آجائیں جہاں ان کی بڑی ضرورت تھی، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب سید صاحب ارادہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے۔

سید صاحب تقریر کرتے میں کہیں اٹکتے نہ تھے، اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے الجھتے ہیں، سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہے جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جا رہے ہوں۔ تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا۔ ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے فکرے ضرور ہوتے ہیں جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے، کوئی جادو بیان مقرر ہو اور موضوع دلچسپ ہو تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے وہ تقریر کے فن و فسوں سے بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں ان کی بات آجاتی تھی۔

ان کی تقریروں میں بڑا وزن، بڑا خلوص اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے کہ اس کے ثبوت میں قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہوں۔ سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا۔ ذاتی معاملہ ہو، علمی یا اجتماعی وہ بڑی جچی تلی اور شریفانہ رائے دیتے تھے۔ مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لئے

> کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھا سکونگا ان میں سید صاحب ایک تھے۔" ۱؎

انھیں باتوں سے متاثر ہو کر رشید صاحب نے مارچ ۱۹۳۳ء میں سید صاحب کو ایک لکچر کی دعوت دی۔ جلسے کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے کی اور سید صاحب نے "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے اپنا وہ مشہور مقالہ پڑھا جو آگے چل کر "اردو" اور "ہندوستانی" کی تاریخ میں غیر معمولی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے شروع میں مسلم یونیورسٹی کے ذریعۂ تعلیم اور ہندوستان میں اردو کے ماضی حال اور مستقبل پر دلچسپ گفتگو کی گئی تھی۔ اس خطبہ میں سید صاحب نے اردو کا نام "ہندوستانی" رکھنے پر اصرار کیا اور کہا کہ

> "جب ملک آزاد ہو جائے گا تو اس کی سرکاری زبان کا مسئلہ درپیش ہوگا، اردو اجنبی نام ہے جو ڈیڑھ سو سال سے اس کے ساتھ منسوب اور زبانوں پر چڑھ گیا ہے ورنہ انگریزوں کی آمد سے بہت پہلے سے ہی اس کو ہندوستانی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے اگر اس کا نام "ہندوستانی" رکھ لیا جائے تو یہ نیشنل نام ہونے کی وجہ سے بہ آسانی سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کی جا سکتی ہے۔"

افسوس کہ یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور اردو والے آج اردو کا ماتم کرتے نہیں تھکتے۔ سید صاحب کا یہ خطبہ علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا اور بعد میں ان کے مجموعہ "نقوش سلیمانی" میں شامل کیا گیا۔

علی گڑھ کے اسی قیام کے دوران ایک دوسری نشست منعقدہ آفتاب ہال میں "سادگی اور کفایت شعاری" کے عنوان پر تقریر کی اور تیسری تقریر طبیہ کالج میں کی جس کا عنوان "طب یونانی کی تاریخ" تھا۔ اس تقریر میں انھوں نے طب یونانی کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے نبض شناسی اور نباضی کی حقیقت پر روشنی ڈالی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ

۱؎ گنجہائے گراں مایہ "مولانا سید سلیمان ندوی"

اگر طبیب اس میں مہارت پیدا کریں تو کسی بھی مرض کے لئے کامیاب معالج بن سکتے ہیں جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جن اجزاء پر طبی دواؤں کا مدار ہے وہ سب ہندوستان ہی میں پیدا ہوتی ہیں یہ علاج ہر اعتبار سے سستا اور مفید ہے۔ آخر میں موصوف نے ایک اور پتہ کی بات کہی کہ "ہندوستان کی صحت عامہ کا دار و مدار ولایتی طب پر نہیں ہے جو طب کے ساتھ تجارت بھی ہے بلکہ دیسی طب پر ہے جس کی دوائیں ملک میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے طبیہ کالج کے طلبہ طبیب بننے کی کوشش کریں، ڈاکٹر بننے کی کوشش نہ کریں[1]

اس تقریر کی اہمیت کا اندازہ نصف صدی گزر جانے کے بعد آج زیادہ صحیح طور پر لگایا جاسکتا ہے کہ طبیہ کالجوں سے فارغ ہونے والے طلبہ اپنے اعلیٰ یونانی میدانوں کو چھوڑ کر ایلوپیتھی سے معمولی تعارف کی بنیاد پر بھی بلا تامل ایلوپیتھک کا کلینک کھول کر بیٹھ جاتے ہیں ایلوپیتھی علاج کبھی کبھی ہلاک حد تک مضر ثابت ہوتا ہے۔ اس میں دواؤں کے مضر ردعمل کا لحاظ رکھتے ہوئے مریض کو متعدد مدافعتی دوائیں دی جاتی ہیں جن کا تعلق اس کے مرض سے قطعاً نہیں ہوتا۔ نتیجہ ظاہر ہے جب کہ طب یونانی میں معمولی استعداد رکھنے والا معالج بھی مریض کے لئے زیادہ مضر رساں نہیں بن سکتا چہ جائے کہ ہلاکت کا سبب بن جائے۔ عصر حاضر میں ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے جن علوم کو یہ طلبہ کئی سال تک پڑھتے ہیں اگر وہ اسی میدان میں محنت کر کے اختیار کریں تو زیادہ مفید اور کامیاب معالج بن سکتے ہیں۔ سید صاحب کو چونکہ طبابت ورثہ میں ملی تھی اس وجہ سے بھی انھیں اس عمیق حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملی ہوگی۔

علی گڑھ سے فراغت کے بعد سید صاحب اپریل ۱۹۳۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مدعو کئے گئے جہاں "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" کے عنوان سے ایک توسیعی خطبہ پیش کیا۔ بعد میں یہ خطبہ معارف مئی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

تاریخ کے مطالعہ نے سید صاحب کو زود حس اور بہت فعال انسان بنا دیا تھا۔

---

[1] معارف مارچ ۱۹۳۳ء

کہیں سے ایک نکتہ ہاتھ آیا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی اور جب تک اس کو تمام و کمال کھوج نہ نکالتے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے اس سلسلے کی تاریخی تحقیق کی کوشش اپریل ۱۹۳۳ء میں شائع شدہ ان کا وہ مقالہ ہے جو ”لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور قلعہ بنایا“ کے عنوان سے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور میں پڑھا تھا۔

مقالہ میں اس خاندان کی ڈیڑھ سو سال کی نامعلوم تاریخ دریافت کر کے اس کے مورث اعلیٰ استاد احمد معمار شاہجہانی لاہور کے حالات بیان کئے ہیں اور دوسری معتبر روایتوں کے علاوہ اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی معاصرانہ شہادت سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہی استاد احمد معمار تاج ہے جو ہندسہ اور ریاضیات کا بھی زبردست عالم تھا۔ مزید گہرائی سے مطالعہ کے بعد یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ حروف، نقطے اور شوشے کتنے زاویے اور فاصلہ پر اپنی شکل تبدیل یا دھندلی کر دیتے ہیں، روشنائی کی عمر میں کس طرح صدیوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ پتھر کی کونسی نازک ترین شکل دائمی بن سکتی ہے، کس پتھر کو کس زاویہ پر رکھنے سے گھاس، درختوں اور پانی پر اس کے کیا کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان مختلف علوم کا وہ متبحر عالم تھا۔ استاد احمد یہ بھی جانتا تھا کہ چاند کی روشنی کے علاوہ اگر مذکورہ حالات میں بھی تاج کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ زیادہ عظیم اور زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح سید صاحب نے ایک اور اہم تحقیقی مقالہ ”لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان“ کے عنوان سے اپنے فن اور موضوع پر منفرد مقالہ پیش کیا تھا۔

”اردو سندھی سے نکلی“ سید صاحب کا وہ لسانیاتی نظریہ ہے جس کو انھوں نے ایک مقالہ میں ناگری پرچارنی سبھا کی فرمائش پر سبھا کے زیر اہتمام ہونے والے ایک خصوصی جلسہ میں پیش کیا تھا۔ اردو کی پیدائش سے متعلق ایک مخصوص نظریہ پر محیط یہ مقالہ جولائی ۱۹۳۳ء کے معارف میں شائع ہوا اور بعد میں نقوش سلیمانی میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد ماہرین لسانیات نے اردو کے آغاز سے متعلق تحقیقات کی روشنی میں اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ”لسانیات“ کے باب میں کی جائے گی۔

سید صاحب نے ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس پٹنہ میں ”خیام“ پر جو تحقیقی مقالہ

پڑھا تھا اس کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کی افادیت کے پیشِ نظر کتابی صورت میں شائع کرنے کے بار بار تقاضے ہوئے۔ چنانچہ موصوف نے سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، رباعیات کے متعلق بعض اہم مسائل و مباحث کی مزید تحقیق کے ساتھ دوسرے علوم سے متعلق خیام کے رسائل کو آخر میں شامل کر کے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں "خیام" کے نام سے یہ کتاب ہدیۂ شائقین کر دی۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے تھے ان میں "خیام" بھی شامل تھی۔ مستشرقین یورپ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے (یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے جواب میں آج پچاس سال بعد تک بھی کوئی کتاب خیام پر نہ لکھی جا سکی جب کہ سید صاحب کی یہ کتاب انہی مستشرقین کی دریافتوں اور افسانہ طرازیوں کو غلط ثابت کر کے حقیقت و واقعیت پیش کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ فارسی میں علی دشتی کی کتاب "دمی با خیام" البتہ اس موضوع پر ایک اہم اور جامع کتاب آٹھویں دہائی میں شائع ہوئی ہے۔ علامہ اقبال جیسے فارسی کے عالم و شاعر اور ایران کے فلسفۂ مابعد الطبیعیات کے ماہر کا یہ تاثر کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ "خیّام" پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ اقبال کا گویا یہ تصدیق نامہ تحقیق کی بے شمار منزلیں طے کر لینے کے بعد آج تک مستند ہے۔

سید صاحب نے ندوہ کی تعلیمی اصلاح کا جو بیڑا اٹھا رکھا تھا اس کی مقبولیت عوام و خواص دونوں میں تھی۔ علمائے ہند کے بین الاقوامی نمائندہ کی حیثیت سے شہرت، ندوہ کی معتمدی تعلیم کے زمانہ میں ان کے شاندار فرائض کی انجام دہی اور دوسری یونیورسٹیوں میں موصوف کے مشوروں کی قدر و اہمیت ملک کی چہار دیواری سے بھی تسلیم کی جا چکی تھی اور ہر علمی جگہ احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ شاہ افغانستان (نادر شاہ) نے اپنے ملک کے تعلیمی نظام کی اصلاحات کے لئے جن تین مسلم مفکرین اور ماہرین تعلیم کو افغانستان مدعو کیا تھا ان میں سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے علاوہ سید صاحب بھی شامل تھے چونکہ یہ چیز ان کے ذوق کی تھی اور سیر و سیاحت کا موقع بھی نکلتا تھا اس لئے اس دعوت کو قبول

کرلیا اور اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان چلے گئے۔ اعظم گڑھ میں پاسپورٹ اور ویزا کی بعض دشواریوں کے سبب سید صاحب تاخیر سے پہنچے، وہ دونوں لوگ وقت پر جا چکے تھے اس لیے انھیں تنہا جانا پڑا۔

وہاں پہنچ کر افغانستان کے مشہور شاعر اور انجمن ادبی کابل کے سکریٹری سرور خاں گویا کے ساتھ سید صاحب قصرِ دلکشا پہنچے جہاں شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے تپاک اور تواضع سے ملے۔ دیر میں پہنچنے کی وجہ سے ہونے والی ممکنہ پریشانیوں پر اظہارِ ہمدردی کیا۔ رسمی باتوں کے بعد اصل موضوع اور مسئلۂ تعلیم پر سید صاحب نے بات چیت شروع کی اور خصوصاً عربی تعلیم کی اصلاح کے متعلق اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا۔ نیز افغانستان میں ندوہ کی مماثل درسگاہ کا تخیل وخاکہ پیش کیا۔ جس سے وہ خوش اور مطمئن ہوگئے اس کے بعد وزیرِ جنگ سردار شاہ محمود خاں نے چائے پر مدعو کیا جہاں دوسرے شاہی مہمان بھی موجود تھے یہاں بھی سید صاحب نے کابل میں عربی تعلیم کی اصلاحات کی اسکیم پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی اور اس کے رائج کرنے کو ناگزیر قرار دیا۔ انجمن ادبی کابل میں ارکانِ وفد کو ایک عشائیہ دیا گیا جس میں شاہی مہمانوں کے علاوہ کابل کے تمام نامور ادبا و شعراء اور اہل علم وقلم جمع تھے اور بقول سید صاحب ”یہ اس سفر کی سب سے زیادہ پر لطف تقریب تھی“ اس میں صدر انجمن نے مہمانوں کا پُر تپاک خیر مقدم فارسی زبان میں کیا اور پھر مشہور شاعر قاری عبداللہ نے ایک طویل خیر مقدمی نظم سنائی جس میں تمام ارکانِ وفد کی شان میں توصیفی اشعار کہے گئے تھے۔ سید صاحب کے متعلق جو اشعار تھے وہ درج ذیل ہیں۔

سیوم سیدِ ماکہ از ندوہ است   زدانش بہ ہندوستان قُدوہ است
زفیض ومشن تازہ شد جان علم   در اقلیم دانش سلیمان علم
چہ کلکش بمعنی طراز ندہ شد   خیالاتِ شبلی از و زندہ شد
چہ در شاہراہ حقایق شتافت   ”معارف“ از و رونق تازہ یافت
مضامین او جملہ محکم بود
نگارش بکلکش مسلم بود

(معارف فروری ۱۹۳۴ء ص ۹۰)

اس آغاز کے بعد تقریریں اور جوابی تقریریں ہوئیں۔

کابل کے قیام کے دوران یونیورسٹی، کالج، اسکول، عربی کے دارالعلوم، فوجی اسکول اور بعض دوسرے اداروں کا تفصیلی معائنہ کیا انھیں ہندوستانی اداروں سے بعض جگہ مشترک لیکن بڑی حد تک مختلف پایا۔ دارالعلوم عربی میں ایک عام بات یہ دیکھی کہ وہاں پچیس تیس سال کی عمر سے کم کا کوئی طالب علم نہیں تھا، دوسرے ان طلبار میں قابلِ ذکر ذہانت اور تیزی کا فقدان نظر آیا۔ ہندوستان کے عربی مدارس میں اساتذہ سے سوال وجواب کا جو رواج ہے اس میں بھی سرد مہری کا ثبوت ملا۔ مجموعی حیثیت سے وہاں کا نظام تعلیم اطمینان بخش نہیں تھا۔

سید صاحب نہ صرف عربی مدارس کے نصاب کو ہی قابلِ اصلاح سمجھا بلکہ نظام تعلیم پر ماہرانہ نظر ہونے کی بنا پر موصوف نے سبھی اداروں سے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کیا عربی مدارس اور فوجی نظامِ تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں ان کے تبصروں کو درج ذیل دو اقتباسات کے آئینہ میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

> "ضرورت ہے کہ اس (عربی) مدرسہ کے نظامِ تعلیم میں اصلاح کی جائے اس کے نصاب میں نئے علوم کو داخل کیا جائے اور ضرورت کے مطابق ان طلبہ کے رہنے سہنے کے طور طریقے میں صفائی اور بلندی خیال کا لحاظ رکھا جائے .... طریقۂ تعلیم، نظامِ تعلیم نصابِ تعلیم میں رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے اور ایسے علمار پیدا کئے جائیں جو نئی تعلیم کے نوجوانوں کی رہبری کر سکیں اور مفید اصلاحات کی پیش رفت میں مدد دے سکیں علمائے افغانستان نے گزشتہ دور ہائے حکومت میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ آج وہی کام انجام نہ دے سکیں۔ نظم و اصلاح، دین و دانش اور علم وفن کے آج کتنے کام ہیں جو ان کی نگاہِ التفات کے منتظر ہیں۔"[1]

فوجی نظام انتہائی ناقص ہے جس میں تعلیم کا حصول بیرونی ممالک کی گداگری کے بغیر ممکن نہیں۔ اس نظامِ تعلیم نے ملک میں بے حد ابتری پیدا کر دی ہے۔ ایک ایک افغان

---

[1] سفرنامۂ افغانستان ص ۴۲

بچہ کی تعلیم اور یورپ کی آمد و رفت اور وہاں کے قیام پر جو صرف آتا ہے اس سے افغانستان میں ایک چھوٹا سا اسکول چل سکتا ہے۔ علاوہ اس کے ملک کے اندر مستقل غیر ملکی زبانیں، غیر ملکی معاشرے، غیر ملکی سیاستیں اور غیر ملکی ذہنیتیں جڑ پکڑتی رہی ہیں جس کا نقصان افغانستان کو آج نہیں تو کل اسی طرح معلوم ہوگا جس طرح ترکی کو گزشتہ جنگِ عظیم میں معلوم ہو گیا تھا۔ یہ ہی وہ خیالات ہیں جن کی بنا پر نادر شاہ مرحوم کو خود کابل میں ایک افغان یونیورسٹی (دارالفنون) کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی"۔[1]

سید صاحب نے ایک نابغہ وقت کی طرح بعض چیزوں کو اپنی قوتِ متخیلہ کی آنکھ سے بہت پہلے دیکھ لیا تھا لندن کے دورانِ قیام ہندوستان کی آزادی کی پیش گوئی ہو، اردو کی جگہ ہندوستانی نام اختیار کرنے کا مسئلہ اور اہمیت ہو، تاریخ کی کتابوں کو ایک مخصوص نہج پر لکھے جانے کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ منافرت میں اضافہ کا اندیشہ ہو یا افغانستان میں بیرونی ممالک کے اثرات کے آئینہ میں اس صدی کی آٹھویں دہائی سے شروع ہونے والی بدامنی و بدنظمی یا قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے عدم استحکام کا یقین ہو، جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش وجود میں آیا سید صاحب نے ہر جگہ اپنی غیر معمولی فراست کا ثبوت دیا۔

افغانستان کے سفر سے واپسی کے بعد سید صاحب نے اپنے سفر کی روزانہ کی یادداشتوں کو مرتب کر کے معارف میں بالاقساط شائع کیا بعد میں "سفرنامۂ افغانستان" اور "سیر افغانستان" کے نام سے یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

ایک سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں سیرۃ النبی کی پانچویں جلد اشاعت پذیر ہوئی، اس کا موضوع اسلامی عبادات ہے شروع میں عبادات کی حقیقت اور اسلام میں اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد تمام فرض عبادتوں کی تفصیل اور انھیں پُر اثر بنانے کے لیے خشوع و خضوع کی اہمیت واضح کر کے انسانی زندگی پر اس کے غیر معمولی اثرات کا جائزہ لیا

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اپنے اتحادیوں کو صلے دینے شروع

---

[1] سفرنامۂ افغانستان ص ۴۵

کئے تھے جس طرح حجاز میں شریف حسین اور شرق اردن میں اس کے بیٹے کو حکومت عطا کر دی گئی تھی ۔ اسی طرح فلسطین کے ایک حصہ پر اسرائیل کی حکومت بنا دی گئی اور دنیا کے تمام یہودیوں کو یہیں لاکر بسایا جانے لگا ۔ آج اسرائیل جو کچھ ہے اس کی ابتدا یہی واقعہ ہے ۔ اس کا ردعمل پورے عالم اسلام میں ہوا اور ہر طرف سے فلسطین کی حمایت اور اسرائیل کی مخالفت میں صدائے احتجاج بلند ہونے لگی ۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی و مذہبی جوش اپنے شباب پر تھا ۔ سید صاحب ایک عرصہ تک تو اس مسئلہ پر خاموش رہے لیکن جب ۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی تو مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر انھوں نے اس کی صدارت بھی کی ، صدارتی خطبہ اتنا بر وقت ، جامع اور اثر انگیز تھا کہ تمام عالم اسلام میں توقع سے زیادہ مقبول ہوا اور مفتیٔ اعظم فلسطین نے سید صاحب کو اس کے لئے خصوصی طور پر مبارک باد بھیجی اور شکریہ ادا کیا ۔

اسی جلسہ کے دوران کسی نے ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" لاکر سید صاحب کے ہاتھ میں دیا جس کی تائید میں کتابچہ پر ہندوستان کے گیارہ مشاہیر علماء کے دستخط بھی موجود تھے ۔ اس رسالہ میں یہ نام تو از خود ہی لکھ دیئے گئے تھے لیکن ابتداء سے ۱۹۳۵ء تک کی تمام تصانیف سے سید صاحب کی گیارہ غلطیاں تلاش کر کے ان کی بنیاد پر سید صاحب پر کفر و الحاد کا الزام عاید کیا گیا تھا ۔ دراصل یہ ایسی غلطیاں تھیں جن میں سے بعض کی نوعیت تو سہو کتابت کی تھی اور بعض جگہ ابہام کے سبب مفہوم کی ادائیگی میں نقص پیدا ہو گیا تھا ۔ ان غلطیوں کا علمیت اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔ اس لئے سید صاحب کو اس کے لئے قرآنی غلطیوں کے عنوان سے مورد الزام قرار دینا درست نہیں تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رسالہ معاصرانہ رقابت و چشمک کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا ۔ سید صاحب نے معارف میں بہ تفصیل مصنف[1] کی کم فہمی کا ماتم

---

[1] امداد صابری

کرتے ہوئے اپنے خیالات اور مقصود کی وضاحت کرکے اس فتنہ کو فرو کیا۔

فلسطین کانفرنس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد کانفرنسوں اور تقریبوں میں شرکت کی۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو سید صاحب نے اس کے شعبۂ اردو کی صدارت سے جلسے کو نوازا اور اپنے پر مغز خطبے میں لکھنؤ کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات کا جائزہ لیا۔ اردو کی توسیع اور ترقی اور اردو ہندی کو قریب لانے کے لئے مفید مشورے دیئے۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی طلائی جوبلی کے موقع پر شعبۂ علوم وفنون کی صدارت کی اس میں "عرب اور امریکہ" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پیش کیا جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ عرب جہاز رانوں نے کولمبس سے کئی سو سال پہلے امریکہ کو دریافت کر لیا تھا اس کے علاوہ اپنے خطبۂ صدارت میں اسلامی علوم وفنون اور ان کے عروج وزوال کی مجمل تاریخ بیان کی۔

راجندر عبدالحق پیکٹ (اگست ۱۹۳۷ء کی پہلی میٹنگ اور آخری بھی کیونکہ اس کے بعد کانگریس نے بھی اسے توڑ دیا تھا اس) میں سید صاحب نے دارالمصنفین کی جانب سے سرگرم حصہ لیا۔ اس کے متعلق تمام موافق اور مخالف کوششوں پر وہ معارف میں تبصرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستانی یا آسان اردو لکھنے کی طرف اردو والوں کو خصوصی توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ اگر اردو کی اس شکل کو رواج دے دیا جائے تبھی اُردو کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور آنے والی نسل سنسکرت آمیز دقیق ہندی کے مقابلہ میں سبک اردو کو ہی ترجیح دے گی۔

سید صاحب کہیں ہوں، کسی مشغلہ میں ہوں استاد کی وصیت یعنی سیرت النبی کی تکمیل کی وہ ہر وقت تیاری کرتے رہتے تھے۔ مواد کی تلاش وتحقیق، موضوعات کا تنوع اور اسلوب کا لحاظ ہمیشہ پیشِ نظر رہتا تھا اور جب مخصوص موضوع پر حسب مراد مواد کی تحقیق مکمل کر لیتے، دن ورات محنت کرکے اس کی ترتیب وتبویب میں منہمک ہو جاتے چنانچہ ان تمام مصروفیات کے ساتھ ہی ۱۹۳۵ء میں پانچویں جلد شائع ہوئی تھی اور اب نومبر ۱۹۳۶ء میں سیرت کی چھٹی جلد طباعت وغیرہ کے مراحل سے گزر کر اہلِ ذوق کے

سامنے آئی۔ اس کا موضوع اسلام کی اخلاقی تعلیمات ہے۔ ابتداء میں اسلام میں اخلاق کی تعریف اور اہمیت اور پھر اسلام کی تمام اخلاقی تعلیمات کو تفصیل سے بیان کر کے "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم" کو دلائل سے ثابت کیا گیا تھا۔ اس لاجواب کاوش اور پیشکش سے متاثر ہو کر مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس پر اتنا بھرپور تبصرہ کیا تھا کہ بقول سید صاحب "ایک ذمہ دار صاحب قلم کے قلم سے جو تبصرہ بصیرت افروز شائع ہوا ہے، وہ خاکسار مؤلف کی پوری چوتھائی صدی کی خدمت کا ایسا معاوضہ ہے جس کے لئے وہ سراپا سپاس گزار ہے[1]" سید صاحب لکھتے ہیں کہ

> "چھٹی جلد کے بعد ساتویں جلد کا مرحلہ ہے اور سب کو معلوم ہے کہ اس کا موضوع معاملات ہوگا..... یہ ہمارے مباحث کا نیا راستہ ہوگا اس لئے اسے طے کرنے کی مشکلیں بھی ہمارے سامنے ہیں"[2]

سید صاحب نے اس کا آغاز کر کے دو ابواب اور ایک دیباچہ مکمل کر بھی لیا تھا لیکن استاد کی طرح شاگرد کی قسمت میں بھی یہی لکھا تھا کہ سیرت کا کام جاری (ناتمام) ہو اور اسی حالت میں وہ اپنے آقا کے دربار میں پہنچ جائیں۔ ان کی وفات کے بعد پہلے تو اسے معارف میں سلسلہ وار شائع کیا گیا اور پھر سید صباح الدّین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم ناظم دارالمصنفین نے اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا اور اس طرح عظیم استاد کے عظیم ترین کارنامہ سے متعلق عظیم ترین شاگرد کے لئے عظیم ترین وصیت "سیرت..... سیرت..... سب کام چھوڑ کر سیرت"..... صرف پیغمبر اسلام کی سیرت نہیں بلکہ اسلام کے نظام ہائے مختلفہ کی صحیح ترین تاریخ پانچ دہائیوں میں مکمل ہو کر اتمام کو پہنچی۔

اس کے علاوہ اردو زبان و ادب سے متعلق سید صاحب کے خطبات و مقدمات کا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا اور اپنی ناگزیر افادیت

---

[1] معارف فروری ۱۹۳۹ء

[2] ایضاً نومبر ۱۹۳۹ء

کے سبب یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔ رحمتِ عالم کے نام سے طلباء کے لئے سیرۃ نبوی کی تلخیص آسان اور دلنشیں زبان و اسلوب میں سید صاحب نے ۱۹۴۰ء میں پیش کی ۔

سید صاحب نے شبلی کے جن احسانات کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمر کے آخری پانچ برسوں میں شبلی کو سید صاحب سے زیادہ کوئی شخص عزیز نہ تھا۔ یہی حال شاگرد رشید کا تھا۔ چنانچہ جب مختلف لوگوں نے شبلی سے اُن کی سوانح لکھنے کا تذکرہ کیا تو وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے ۔ مولوی افتخار عالم مارہروی نے سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں گزارش کی تھی کہ وہ اپنے حالات ان کو دے دیں تاکہ سوانح عمری لکھی جا سکے، شبلی نے ٹال دیا ۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے پھر بھی کوشش کی اور پھر ناکامی ہوئی تو ۱۹۱۰ء میں شبلی کے عزیز ترین شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کی سفارش کے ساتھ تیسری مرتبہ بھی گزارش کی تو علامہ شبلی نے سید صاحب کو لکھ دیا کہ ”مولوی افتخار عالم میری لائف کیا لکھیں گے جب دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جاؤ تو تم ہی میری سوانح لکھنا ۔

استاد کی یہ وصیت سعادت مند شاگرد پر اعتماد کی انتہا تھی۔ چنانچہ شاگرد نے بھی اپنا حق ادا کر دیا اور ستاون برس کی عمر میں اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوئے جس کی استاد نے وصیت کی تھی یعنی حیاتِ شبلی کی تالیف کئی برس وہ اس کام میں مصروف رہے اور استاد کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو ضروری تحقیق و تفتیش کے بعد سپرد قلم کرتے رہے اور یوں ۱۹۴۳ء میں ”حیاتِ شبلی“ لکھ کر پایۂ تکمیل کو پہنچائی ۔

ایسے ہی زمانہ میں جب وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر اپنے آخری کام حیات شبلی کی تیاری میں مصروف تھے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی علمی و ادبی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ لیکن یہ سید صاحب کی شخصیت کے عروج کی وہ منزل تھی جب وہ ڈگری کی رغبت سے بہت بالاتر ہو چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے کبھی ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا۔ البتہ ڈگری کو ان سے منسلک ہونے کا اعزاز ضرور حاصل ہو گیا۔

ان تصانیف کے علاوہ سید صاحب نزدیک و دور کے سفر کر کے مختلف قومی، علمی اور

مذہبی جلسوں میں برابر شرکت کرتے اور معارف میں اپنے خیالات پیش کرتے رہے چونکہ موصوف کی توجہ اب تاریخ ہند، مسلمان قوم، ندوہ، مذہب اسلام کا تحفظ اور اردو کی بقا، وترویج وغیرہ پر مرکوز رہ گئی تھی۔ اس لئے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک حیدرآباد، پونہ پشاور، سورت، راندیر، بھاولپور، مدراس، دارد ھا وغیرہ کے اجتماعات و کانفرنسوں میں شرکت کا مقصد بھی ان ہی امور پر زور دینا تھا۔ اس طرح کے جلسوں میں شرکت اور سرگرمیوں کا جائزہ گزشتہ اوراق میں لیا جا چکا ہے۔

سلوک و تصوّف

سید صاحب کی زندگی کا دوسرا حیرت خیز واقعہ ان کا راہِ سلوک اختیار کرکے مولانا اشرف علی تھانوی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونا ہے۔ موصوف ۱۳ راگست ۱۹۲۸ء کو مولانا کی طرف رجوع ہوئے۔ مئی ۴۲ء میں بیعت ہوئے اور وہ مقام حاصل کیا جو یارانِ طریقت کو برسوں کی محنت کے بعد بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اپنا تمام علم اور عزت و عظمت و جلالتِ شیخ کے قدموں پر نچھاور کرکے اپنی ہستی کو بالکل مٹا کر رکھ دیا۔ دوسرے لوگوں کے لئے علامۂ دہر اور اپنے لیے سراپا طالب علم نے یہاں بھی اپنی امتیازی انفرادی شان برقرار رکھی۔ فنا فی الشیخ سے فنا فی الفنا تک سلوک کے منازل اتنی سرعت سے طے کیے کہ چار برس کی قلیل مدت میں مُرشد نے خلافت سے سرفراز کیا۔ غلام محمد صاحب نے لکھا ہے کہ "اس عطائے خلافت کے ساتھ ہی حضرت والا پر نیستی اور فنائیت بدرجۂ اتم چھا گئی وہ غرقِ عبدیت ہو گئے" اس اثر میں ڈوب کر حضرت نے جو غزل کہی وہ ان کے نزول پر شاہد ہے۔

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے — اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے
انھیں کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے — وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے
ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے انکو — مجال ہے جو کوئی ان کو ہمکنار کرے
سنا تو دے انھیں افسانۂ غمِ ہجراں — وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے
وہ اپنے کان سے سنتے رہیں مرے نالوں کو — وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے
تری نظر میں ہے تاثیر مستیٔ صہبا — تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

غزل کے ان اشعار کے الفاظ اور اصطلاحات سلوک و احسان کے اسرار و غوامض سے لبریز ہیں اور سالک کے تیزی سے طے کرتے ہوئے مقامات کے عکاس بھی۔ عصری حقائق و شواہد بتلاتے ہیں کہ سید صاحب کو اس عبدیت و فنائیت کی تعلیم مرشد تھانوی نے بطورِ خصوصی دی تھی۔ غلام محمد صاحب نے اس تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے حاضرِ مجلس ایک مسترشد تھانوی کا قول نقل کیا ہے۔

"ایک مرتبہ حضرت سید صاحب خانقاہ تھانہ بھون تشریف لائے، محفل خاص آراستہ تھی، سید صاحب حضرت مولانا تھانوی سے متصل بیٹھے ہوئے تھے چپکے سے سید صاحب نے کوئی بات حضرت شیخ کے گوش گزار فرمائی اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت شیخ قدس سرہٗ نے سید صاحب کے کان میں کچھ ارشاد فرمایا۔ ہم لوگ اس عرض و ارشاد کو سن نہ سکے مگر دیکھا یہ کہ دفعتاً سید صاحب پر گریہ طاری ہو گیا یہاں تک کہ سسکیاں بندھ گئیں۔ پھر سید صاحب رخصت ہو گئے۔ ساری محفل محوِ حیرت تھی کہ یہ کیا ماجرا تھا لیکن بارگاہِ اشرفیہ میں استفسار کی کس کو مجال ہو سکتی تھی ایک عرصہ بعد حضرت خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب) نے جرائت کیے وہ بات پوچھی تو حضرت حکیم الامت نے اس کا اظہار فرمایا اور خواجہ صاحب نے اس واقعہ کو بلا اظہار نام کے اشرف السوانح میں بھی درج فرما دیا۔

"ایک مشہور فاضل ندوی اتفاقاً چند گھنٹوں کے لئے حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چلتے وقت عرض کیا کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیے، حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں متردد ہوا کہ ایسے فاضل شخص کو میں کیا نصیحت کروں پھر اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے دل میں ایک مضمون ڈالا جو بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بالکل مناسب حال تھا۔ میں نے کہا حضرت آپ جیسے فاضل کو میں نصیحت تو کیا کر سکتا ہوں لیکن ہاں میں نے جو اپنی اس تمام عمر میں سارے طریق کا حاصل سمجھا ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں

وہ حاصل جو میں سمجھا ہوں وہ فنا و عبدیت ہے۔ بس جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو مٹایا جائے اس کے لئے سارے ریاضات و مجاہدات کئے جاتے ہیں اور بس۔ اپنی ساری عمر فنا و عبدیت کی تحصیل میں گزار دینی چاہیئے۔ اس تقریر کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ وہ آب دیدہ ہو گئے [1] (اشرف السوانح ص ۲۳۶)

شیخ و مرشد کی تقریر کا ہر ہر لفظ جب عبدیت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے تو طالب حق جس کو عبدیت کی یہ تعلیم دی جا رہی ہے اس پر مکمل اثر ہونا لازمی بھی ہے اور فطری بھی۔ چنانچہ بعد کی پوری زندگی میں یہ مستحضرانہ اثرات موجود ہیں۔ احوال سابقہ میں غیر معمولی تغیر و تبدیلی آ گئی، دل کی پرانی دنیا اُجڑ کر ایک نئی بستی آباد ہوئی تھی۔ اگر پہلے ہمیشہ دینداری اور پرہیزگاری کا پیکر اور عملی نمونہ رہے تھے تو اب صبغت من اللہ میں پوری طرح رنگ گئے تھے اور ظاہر بات کا راز بھی مخفی نہ رہ گیا تھا۔ بقول خود "دس بارہ برس سے جو چیزیں نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھیں وہ عملاً سمجھ میں آ گئیں۔ اب تلافئ مافات میں مصروف ہوں لعل اللہ یرزقنی صلاحاً" ۔ اب نہ دار المصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے نہ علمی مقالات و تصنیفات [2] سے چونکہ روزی قلم سے وابستہ ہے اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں ہے اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترکِ تعلق کر سکوں۔ [3]

امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد سید صاحب نے ادائیگی فرض کے علاوہ (جن میں دار المصنفین وغیرہ میں ڈیوٹی کے اوقات کی مصروفیت شامل ہے) ہر طرف سے ایک طرح کا ترکِ تعلق کر لیا تھا اور تلافئ مافات بھی میں منہمک ہو گئے تھے، موصوف کے رازداں اور داماد سید حسین مرحوم (سابق کمشنر یوپی) نے اپنے ایک مضمون میں اس ترکِ تعلق کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ چند اقتباسات ذیل

---

[1] ، [2] مکتوب بنام مولانا عبد الباری ندوی بحوالہ معارف سلیمان نمبر ص ۹۵ ، ص ۹۲

[3] سید صاحب ایک مرتبہ خود شیخ کے دروازے پر بڑے پر کیف انداز میں ایک صاحب سے کہہ رہے تھے "میں نے اپنا سارا علم ان بڑے میاں (مرشد تھانوی) کے در پر لا کر ڈال دیا ہے (تذکرہ سلیمان ص ۱۲۵)

میں پیش کئے جاتے ہیں۔

" پہلے دار المصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل وعیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرماتے یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں اب اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گزرتا خواہ مسجد میں ہوں یا اپنے سکونہ کمرہ میں۔ پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دار المصنفین کے ساتھ نوش فرماتے اور مغرب تک ان سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے یہ مجلس بھی ختم ہو گئی۔ کبھی اعزہ اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے۔ عرصہ ہوا ان کی صحبت میسر نہیں آئی تو وہ جا کر خلوت سے لے آتیں اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل وعیال اور احباب کی درخواست آپ کم مسترد فرماتے تھے اس لئے ان کی دلجوئی و استمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے اور جلد ہی کہیں اٹھ کر جانا چاہتے اگر کوئی اصرار کرتا تو تھوڑی دیر کے لئے رک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا کہ

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

(مجذوب)

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار ترک کر دیا اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا۔ باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی۔ دار المصنفین کے کام کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہو گئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں میں بند رہ گئے۔ نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں ہی نے چاٹ لیا۔ اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا

پہنے رہتے، بعض لوگ جنھیں مزاج عالی میں درخور تھا کبھی یہ عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے تو مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، یاد نہیں رہتا آپ یاد دلا دیا کریں۔

ان ہی ایام میں دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آگئے، آپ بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے۔ کبھی بعد نماز مغرب دار المصنفین کی مسجد کی شمالی چہار دیواری پر ایک گوشہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوئے کبھی مکانِ مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے۔ کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں فرما دیجئے ہوتے فرش بچھ جاتا یا قالین کی جا نماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے ٹھنڈک نہ لگ جائے فرماتے ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے۔

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاست مزاج میں مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کی مثال اور ظاہری و باطنی حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھا جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا۔"[1]

غالب تو صرف کہہ کر ہی رہ گئے کہ "میں عشقِ فنا میں مستغرق ہوں"، لیکن سید صاحب دراصل اس میں مستغرق ہو ہی گئے تھے۔ زندگی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ اس نئی بستی میں دکان نئی لگائی جا رہی تھی اور پرانی دکانوں کو بھی نئے قالب میں ڈھالا جا رہا تھا۔ مقصد کے اظہار کے لئے "انا" کی نفی کے ساتھ احوال سابقہ پر نظر ثانی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ماضی کی تحریروں پر بھی اس تحریک کا اثر ظاہر ہونے لگا۔

فن سلوک کا یہ دستور اور ایک شق ہے کہ اس سے وابستگی کے بعد سالک اپنے نفس کا محاسبہ کرنے لگتا ہے۔ نیز مقامات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ محاسبہ میں بھی وسعت و

---

[1] معارف سلیمان نمبر ص ۳۲۲ - ۳۲۹، "حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام" از سید حسین

گہرائی آتی ہے، حال سے گزر کر ماضی اور اس کے بعد وہ پوری زندگی کے ایک ایک لمحہ پر نظر ڈالتا ہے کہ اگر ماضی میں اس کے دامن پر کوئی داغ لگا ہو تو اس کو دھولے اور جو بھی کمی رہ گئی ہو اس کی تلاش کی صورتیں اختیار اور تدبیریں پیدا کرتا رہے۔ ہر سالک کا ماضی بہرحال اچھا ہونا ضروری نہیں۔ اس لحاظ سے سالکین کی بھی مختلف قسمیں ہو جاتی ہیں بعض سالک ایسے ہوتے ہیں جو شروع سے نیک و متقی اور سراپا جذب عشق رہے ہیں، بزرگوں میں بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور مجدد الف ثانیؒ اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بعض وہ جن کی زندگیاں اگرچہ بے داغ ہوتی ہیں لیکن جوہر عرفانی ایک عرصہ کے بعد کھلا ہے جیسے امام غزالیؒ، رومیؒ، شیخ فریدالدینؒ عطارؒ وغیرہ۔ تیسرے وہ ہستیاں جن کا ماضی کبھی اخلاق سے بھی پست رہا ہے مگر جب انقلاب آیا تو ان کی زندگی تقویٰ اور معیارِ معرفت قرار پا گئی۔ مثلاً جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ۔ سید صاحب کا شمار صوفیہ کے دوسرے زمرہ میں ہوتا ہے موصوف نے ہمیشہ نیکی و تقویٰ اور دینداری کی زندگی گزارنے کے باوجود اس وابستگی کے بعد اپنا محاسبہ تیز تر کر دیا۔ ماضی کے دھندلکے کو یاد کر کر کے آئینہ بنانے کی کوشش کرتے رہے اور چونکہ ان کا اثر تصانیف و مضامین کے ذریعے دوسرے عوام و خواص تک بھی پہنچا تھا اس لئے محاسبہ کے لئے بھی وہی علمی شان اختیار کی۔ جن کالموں کے ذریعہ ماضی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اس علمی محاسبہ کے لئے بھی انھیں کالموں کو وسیلہ بنایا اور جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں "رجوع و اعتراف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر تواضع، عبدیت اور فنائیت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ اس کے بعض حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

> "... کتابوں اور مضمونوں کے ہزارہا صفحات اتنے دنوں میں سیاہ کیے گئے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے اور کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے جس سے اتباعِ حق کے بجائے اتباعِ ہوا کا ارتکاب ہوا ہو، بندہ ہر حالت میں قصوروار ہے خطا و نسیان اس کا خمیر ہے اور اس کا علم و عمل کی لغزش گاہوں سے ٹھیک ٹھیک بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے یہ خاکسار ہیچمداں علی الاعلان اپنی ان تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کے خلاف ہوئی ہوں صدق دل سے

توبہ کرتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی سند کتاب و سنت میں نہ ہو، اعلان برأت کرتا ہے .....

ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے تو بعد کے اڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کردی ہے مثلاً معراج بحالتِ بیداری و بہ جسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال پہلے مجھے نہ مل سکا اور بعد کو اللہ نے توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کردی، اس طرح فنائے نار کے مسئلہ میں حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ گیا بعد کو جمہوری رائے کا اضافہ کرکے دونوں کے دلائل کی تشریح کردی اور اب بحمد اللہ اس باب میں جمہور ہی کے مسئلہ کا حق ہونا سمجھ میں آگیا ہے۔

مسئلہ تصاویر سے متعلق میں نے ۱۹۱۹ میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں (۱) ذی روح کے فوٹو لینے یعنی عکسی تصویر کشی اور خصوصاً (۲) نصف حصہ جسم کے فوٹو کا جواز ظاہر کیا تھا۔ اس سلسلے میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علمانے بھی مضامین لکھے جن میں سے بعض میرے موافق ہیں اور بعض میرے مخالف۔ لیکن بہرحال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آگئے ہیں اس لئے سب کو سامنے رکھ کر اب اس سے اتفاق ہے کہ صحیح یہی ہے کہ امر اول دستی تصویر کی طرح ناجائز ہے اور امر ثانی کا کھینچنا ناجائز اور کھینچوانا باضطرار جائز اور دھڑ کا بغیر سر اور چہرے کے دونوں جائز۔

زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رہا ہے، روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عدم وجوب کی قائل تھیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ان کے مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی ہے جس سے اس مسئلہ میں ان کی اس رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے ..... اس لئے اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور کہنا ہے کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلے کے مطابق زکوٰۃ کے وجوب کا قائل ہوں اور اس پر بحمد اللہ عامل ہوں اور کتاب کے آئندہ اڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح بھی

ہو جائے گی۔

..... یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں۔

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی ہو تو اس کی خدمت میں عرض ہے کہ میرے اس رجوع و تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کرے اور صحیح امر اختیار کرے۔ علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح اور قولِ ثانی کا عام رواج رہا ہے یہ انھیں کا اتباعِ حق ہے۔[1]

فکر کی بلندی، الفاظ کے مد و جزر اور لہجہ کی قوت و صلابت سے شخصیت ظاہری کا نزول و تنزل اور عظمتِ باطنی، بالیدگیٔ روح اور ارتفاع ذات کے تمام ہی اسرار و امکانات یہاں مخفی ہیں، ان اقتباسات کے مطالعہ کے بعد کسی بھی صاحب بصیرت کی رفتار قلب اور ذہنی افق ارتعاش آشنا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

یہ رجوع و اعتراف جب مرشد کی نظر نواز ہوا تو وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے وجد آفریں کیفیت طاری ہونے لگی اور ہندوستان میں تصوف کی تاریخ میں پہلی بار شیخ اشرف جیسے صاحب تمکنت و جلالت مرشد نے مرید و خلیفہ کی مدح میں ان کی معرفت آگاہی کی تصدیق کرتے ہوئے چند اشعار لکھ کر بھیجے شروع کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں مثنوی معنوی کے ایک شعر میں تصرف یسیر کے بعد خلیفہ سلیمان پر اس طرح چسپاں کیا ہے۔

از سلیمان گیر اخلاص عمل   دان تو ندی را منزہ از دغل

دوسرے شعر یہ ہیں۔

اے دلت معمور از اسرار حق   اے دلت مخمور از آثار حق
اے دلت پُر نور از انوار حق   اے دلت مسرور از اخبار حق
صد مبارک باد این اظہار حق   صد مبارک باد ایں اقرار حق

---

[1] معارف جنوری ۱۹۲۳ء

سب سے آخر میں ایک معذرت بھی شامل ہے۔

گرچہ ناظم نیستم ابیات را   نثر کردم لیک ایں جذبات را
مقصد من خیر خواہی ہست و بس   بو کہ بار غبت فتد در گوش کس

قابل غور امر یہ ہے کہ موصوف نے برسوں کی یہ منزلیں بظاہر چار سال کے دنوں اور مہینوں میں کیوں کر طے کرلیں! یہ سمجھ لینا اس وقت کچھ دشوار نظر نہیں آتا جب سید صاحب کی کتاب زندگی کا ہر باب اس سلسلے میں رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ تواضع سادگی سید صاحب کا موروثی وصف تھا، سنت و اتباع سنت سے محبت اور بدعات سے نفرت کا وصف حکیم سید ابو حبیب صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ مطالعہ و تدبر شبلی کا فیضان تھا اور علم و تفکر اور توازن خصوصی طور پر ودیعت الٰہی تھا باقی عزت و شہرت اور عظمت و برگزیدگی ان کے ظاہری نتائج تھے اور خمیر، یعنی آبائی مسلک تصوف ہی تھا جس کے پردے اس منزل پر آکر چاک ہوئے جس میں وہ بالآخر جاکر مل گئے اور اس نے ان کو قبول ہی نہیں جذب بھی کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ صلاحیتوں کی اسی زرخیزی سے متاثر ہو کر چالیس سالہ رفیق مولوی عبدالباری صاحب نے لکھا ہے کہ

> یہ تقاضا قلب میں تیز تر ہوتا جاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ "اشرف، سید صاحب جیسے اکابر علم و قلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے استفادات کا سونا یہاں ایک آنچ میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا۔
> الحمد للہ ایسا ہی ہوا!"[1]

شیخ اشرف تھانوی سے مناسبت، اور منزل عرفان تک رسائی آنِ واحد کی طلسمی فضا یا کسی وقتی تاثر کے نتیجہ میں نہیں ہو گئی تھی بلکہ سید صاحب کے فطری غور و فکر تحقیق و تدقیق، تنقیح و تنقید، آزمائش و انتخاب، نزاکت و نفاست اور ترک و اختیار کی ہزاروں منزلیں طے کرنے اور بحر العلوم کی برسوں کی غواصی کے بعد اس راہ سے وابستگی عمل میں آئی تھی۔ تمام علوم اور میدانوں میں کامران و سرشار رہنے کے بعد بھی ایک اضطراب اور تنگی

---

[1] معارف سلیمان نمبر ص ۹۱

باقی رہتی تھی جس کی تسکین کے لئے عرصہ تک وہ مرکز کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہے کسی بھی عالم و عارف سے وابستہ ہونے کا ارادہ کرتے، معیار مزاج پر پورا نہیں اترتا تھا کسی کے یہاں علم کو عمل پر غالب دیکھ کر بے اطمینانی ہوتی کسی کے تصوف میں فلسفہ کی آمیزش دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتے کسی عامل و کامل شیخ کو علمی اعتبار سے ہم ذوق نہ پاکر شرح صدر نہیں ہوتا تھا اور کسی کے یہاں عمل پر رسوم کو غالب دیکھا۔ غرض بلند معیاری کی وجہ سے میزان پر کوئی بھی ٹھہر نہ سکا لکھتے ہیں۔

> "کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا لیکن کوئی ایسی ہستی نظر نہ آئی تھی جو میرے درد کی درمانی کر سکے۔ بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بارہا یہی خیال آتا تھا کہ کاش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے"[1]

بالآخر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ہی کے ہندوستان میں واحد جانشین اور صوفیا میں سید صاحب کی طرح ہی بلند معیار مرشد مولانا اشرف علی تھانوی پر نظرِ انتخاب ٹھہر گئی، دس سال سے سلگتی ہوئی یہ چنگاری ہوا پانے کے بعد اب زیادہ دیر دبی نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ مولانا تھانوی سے استفادہ کا شوق، اضطراب کی حدوں کو پار کرنے لگا علمی معاملات میں اپنے مخصوص بے لاگ مسلک کا خیال کر کے حجاب آتا تھا اور ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ اتفاق سے ایک رسالہ بھیجنے کی علمی تقریب سے خط و کتابت کا آغاز ہو گیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مسئلہ سود کے جواز کے بارے میں حیدر آباد سے منشی عبداللطیف صاحب کا ایک کتابچہ شائع ہوا تھا۔ مولانا تھانوی نے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد اصلی نوعیت اور شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے سود کی حرمت کے متعلق مولانا ظفر احمد عثمانی سے عربی میں ایک کتابچہ مرتب کرایا اور علماء کی رائے لینے کے لئے وہ تمام اسلامی اداروں اور

---

[1] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۸۳

سرکردہ علماء کے پاس بھیجا گیا۔ مدیر معارف، مصنف اور جید عالم و فاضل ہونے کی بنا پر سید صاحب کو بھی یہ رسالہ بھیجا گیا۔ سید صاحب نے اس رسالہ کا آٹھ صفحات میں عربی میں جواب دیا اور ساتھ ہی مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اپنے ایک نجی خط میں مذکورہ کتابچہ سے متعلق ضروری باتیں لکھنے کے بعد اپنے قلبی احوال کا اظہار اور طلب صادق کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ تہلکہ خیز الفاظ لکھے جن سے اعظم گڑھ سے تھانہ بھون کی سینکڑوں میل کی مسافت منٹوں میں طے ہو کر دونوں باہم بعید قصبوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل جانے کا گمان ہوتا ہے۔

> "بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا اٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکینت و طمانیت کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ یاد آتی ہے لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بیگانگی سے میرے متعلق اب تک کیا کیا پہنچا ہو اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں۔ میں تو اس رسالۂ استفسار کا ممنون ہوں کہ اس اجنبیت و بیگانگی کی جگہ اس کی بدولت دانست و یک جہتی کی صورت پیدا ہوئی۔ اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس سے علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں رہتے۔ دعا کا طالب و ہمت کا خواستگار ہوں۔ والسلام

یہ خط دراصل مولانا تھانوی سے خط و کتابت شروع کرنے کی ایک تمہید و تقریب تھی اور سید صاحب کو اس کے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا، مولانا تھانوی کا تسلی بخش جواب آیا تو موقع غنیمت سمجھ کر سید صاحب نے فوراً اپنے تمام حالات لکھ بھیجے اور اپنے طبیب روحانی اشرف سے کوئی مناسب حال نسخہ تجویز کرنے کی التجا کی۔ یہ خط محض ایک حال نامہ نہیں بلکہ ایک متبحر عالم دین و طالب صادق کی زندگی کا کچا چٹھا اور اپنے مرض کی پوری تاریخ ہے جس کی بنیاد پر وہ کسی نسخے کا طلب گار ہے۔ اس اہمیت کے علاوہ اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ خط بہت جاندار اور جامع ہے چنانچہ اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

> "میں آپ کی دعا و دعوت کا بہترین مستحق ہوں، مسائل علمی کی الجھن سے نجات کا خواستگار نہیں بلکہ روح کی الجھن سے نجات کے لئے دعا و ہمت کا طالب ہوں...

ہیں نے اعتزال سے لے کر سلفیت تک بمدارج ترقی کی ہے۔ عقاید میں امام مالک کے اس اصول کا پیرو ہوں الاستوی معلوم والکیفیت مجھول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعتہ۔ سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف و تدوین میں خواہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں مگر اس مصروفیت نے ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبۂ محبت پیدا کردیا ہے۔ وللہ الحمد۔ فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں مگر اہل حدیث بالمعنیٰ المتعارف نہیں ہوں۔ ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتہً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا۔

میرا خاندان صوبۂ بہار میں علم ظاہر و باطن کا جامع رہا ہے۔ والد مرحوم ابوالعلائی المشرب تھے۔ بھائی صاحب مجددی تھے اور دونوں صاحب حال و نسبت تھے۔ بچپن ان بزرگوں کے آغوش میں بسر ہوا۔ ذکر و مراقبہ اسی سن میں شروع کردیا تھا۔ مگر بُرا ہو علم باطل کا کہ جس نے مدتوں کے لئے اس راہ سے ہٹادیا اور خدا جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور اب جب مرحلۂ اربعین سے گزر کر ہوش آیا تو ان بزرگوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے۔ میں نے یہ کیفیت اس لئے لکھ دی کہ جناب مستقبل کی اصلاح میں میرے ماضی سے بھی باخبر رہیں۔ میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت و تثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلے سے عقیدت تامہ رکھتا ہوں۔ خرافات و طامات صوفیہ کا دل سے منکر ہوں۔ صاحب نہیں لیکن اصلاح حال کا دل سے خواستگار ہوں۔

یورپ کے مذہبی و علمی حملوں کے مقابلے میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے اور اب تک پچیس برس کا زمانہ ان ہی مشاغل میں گزرا۔ اب آپ سے دعا کا طالب، ہمت کا خواستگار اور حصولِ اخلاص اور اصلاح قلب کے لئے کسی نسخہ کا سائل ہوں"۔[1]

---

[1] یہ دونوں خطوط تذکرۂ سلیمان ص ۵۴ اور ۵۵ پر درج ہیں۔

یہی وہ ذاتی اور نجی احوال تھے جنھوں نے سید صاحب جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو آستانۂ اشرفیہ پر پہنچایا اور طلبِ صادق اور وفورِ شوق و جذبِ عشق کی یہی وہ صلاحیتیں تھیں کہ برسوں کی منزلیں موصوف نے دنوں اور مہینوں میں طے کرلیں حالانکہ خود حاضرین دربارِ اشرفیہ کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر جلد کیسے 'رسوخ' حاصل ہوگیا جب کہ یہ مجلس میں آکر چپ چاپ بیٹھ جاتے اور مجلس ختم ہونے کے بعد فوراً اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں "ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد کس قدر رسوخ کیسے حاصل ہوگیا؟ مگر بعد کو پتہ چلا کہ جوہر ہی کچھ اور تھا" اسی کی تائید کرتے ہوئے غلام محمد صاحب نے حضرت تھانوی کے ایک خلیفہ مجاز حاجی حافظ محمد عثمان خاں صاحب کا قول نقل کیا ہے اس سے بھی مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "ایک مرتبہ حضرت سید صاحب ہی کے کمالات کا ذکر آگیا تو حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے اس کو عمر بھر پھونکتے رہیے تو سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اٹھتا ان میں (یعنی سید صاحب میں) کس بات کی کمی تھی"[1]

راہ سلوک میں آجانے کے بعد سید صاحب نظریاتی کشمکش کا شکار ہوئے۔ بعض لوگ معنی بالمتعارف تصوف کو رسوم فاسدہ کا منبع سمجھ کر ناپسند کرتے ہیں۔ بعض اصل تصوف یعنی راہ احسان و سلوک کو غیر ضروری اور خواب آور سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں اور صحیح تہ تک پہنچنے کی کوشش کو بھی تضیع وقت خیال کرتے ہیں، بعض حضرات مخالفت کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ سید صاحب کا تعلق ان سبھی حضرات سے تھا اور اس کے علاوہ دوسرے مسالک کے رہنماؤں سے بھی۔ ابتداءً یعنی جب تک اصلاح حال کے لئے خط و کتابت کا سلسلہ تھا یہ خاموش مراسلت سید صاحب اور مولانا تھانوی کے درمیان جاری رہی۔ لیکن

---

[1] تذکرۂ سلیمان ص ۱۲۷

جب سید صاحب حضرت تھانوی کے مرید ہو گئے اور علمی و عملی زندگی پر اس وابستگی کے اثرات ظاہر ہونے لگے تو حضرات متفکرین کو اس طرف سے تشویش لاحق ہوئی۔ البتہ اس کے اظہار مخالفت میں ضبط و احتیاط سے کام لیا جاتا رہا۔ سید صاحب پر مکمل اور بھرپور حملہ اس وقت ہوا جب انھوں نے "رجوع اعتراف" کے عنوان سے معارف میں مذکورہ سابق شذرہ لکھا اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ اس ردعمل کی دو اہم بنیادیں تھیں۔ ایک سید صاحب کی ذات اور دوسری دیوبندی اور اس وقت تک کے ندوی مکتب فکر کے امتیازات۔ ان لوگوں کو موصوف کی ذات سے ہی نہیں عظمت و برگزیدگی اور استفادہ سے بھی اختلاف و انکار تھا انھوں نے ذات پر حملے شروع کئے اور طرح طرح کے وار کئے۔ سید صاحب فنافی الفنا کی (آدمی فنا ہو جائے، مٹ جائے اور فنائیت کا احساس بھی جاتا رہے، ایسے شخص کے لئے مدح و ذم یکساں طور پر غیر اہم ہو جاتی ہیں۔ سید صاحب اسی) منزل تک پہنچ جانے کی وجہ سے ذاتی حملوں کا کبھی کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ لیکن موخر الذکر کا چونکہ علمی راستہ تھا اور ان لوگوں کے اختلاف کی وجہ ان کی یہ حیرت و استعجاب اور مجموعۂ اعتراضات تھا کہ مسند نشین شبلی آستانۂ اشرفیہ پر، علم کا دھنی فقیر کی دہلیز پر، ملت کا رہبر خانقاہ کے حجرہ میں یہ کیونکر ممکن ہوا۔ اس کے لئے خطوط کی بھرمار، سوالات کی بوچھار، الزامات کا انبار تھا کہ "یہ آپ نے کیا کیا، ایسا کیوں کیا، آپ کو کیا ضرورت پڑتی تھی، آپ تو نیک اور صاحب علم و عز و جاہ تھے، آپ نے ندوی نسبت کو ٹھیس پہنچائی، آپ کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مولانا تھانوی البتہ امر ہو گئے، خیر اس میں تو کچھ مضائقہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد سید صاحب کی علمی تحقیقات و کاوشیں رک گئیں" وغیرہ وغیرہ۔

سید صاحب میں تحمل اور وقار بھی امتیازی حیثیت رکھتا تھا اور جس علمی وسعت اور فکر صائب کی وجہ سے علامۂ دہر سمجھے جاتے تھے اسی فکری نہج پر مسلسل دس بارہ برس غور کرنے کے بعد یہ راہ اختیار کی تھی۔ اگر پہلے معیار بلند تھا تو اسے کسی طرح پست نہیں کہا جا سکتا اب علم کی وسعت اور عمر کی گنجائش اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھی یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس سارے علم کے باوجود انھوں نے "یہ" فیصلہ کر کے غلطی کی ہے جب کہ وہ خود لکھ چکے ہیں کہ

یہ فیصلہ وقتی نہیں، دس بارہ برس کی فکر کا نتیجہ تھا۔ سید صاحب عام طور سے خاموش رہتے لیکن اگر کبھی محفل میں لوگ جمع ہو کر استفسارات کرتے تو فرما دیتے۔

> "وہ لوگ مجھ کو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں۔ آخر اس بات پر یہ کیوں نہیں غور کرتے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر میں واقعی علامہ اور محقق ہوں تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما ہے میں نے اپنے اندر کوئی کمی تو پائی جس کی تکمیل کے لئے میں وہاں گیا۔"[1]

خطوط کے ذریعہ جن حضرات نے اظہار تاسف کیا تھا اور لکھا تھا کہ ہم نے تو اپنا قبلہ وکعبہ آپ کو بنایا تھا، ہمیں آپ ہی سے روشنی ملتی تھی اور آپ بھی دوسرے کے آگے جھک گئے اپنا سارا علم اور جاہ و منزلت دوسرے کے قدموں پر لے جا کر رکھ دیا۔ ہم آپ سے یہ امید نہیں کرتے۔ سید صاحب نے ایسے اہل الرائے کو نہایت استقامت کے ساتھ جواب میں لکھا کہ

> "جن کمالات کی بناء پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا ان ہی کمالات نے مجھ کو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا۔ میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں۔"[2]

سید صاحب کے چچا سید ابو الکمال عبد الحکیم صاحب نے اس شور و غوغا سے کافی پہلے سید صاحب کو خط لکھ کر ان کی علمی حیثیت کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ظاہر و باطن کے تمام کمالات کے باوجود وہ کیا سبب نکل آیا جس نے آپ کو یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں بہار شریف کے کسی بڑے صوفی سے ان کی ملاقات ہو گئی جس نے ان پر یہ واضح کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو سرورِ انبیاء، منصب تبلیغ پر مامور اور ساری انسانیت کے لئے رحمت تھے، شرح صدر سے مشرف اور پیکر معصومیت ہونے کے باوجود فسبح بحمد ربک واستغفرہ کا حکم پایا اور سب کاموں سے ہاتھ کھینچ کر تسبیح و استغفار میں مشغول ہو جائیں

---

[1] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۱۵۳

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۹۷

لیکن اگر ان کے کسی امتی کو بالکل آخر عمر میں اسی طرح سنت مطہرہ کو زندہ کرنے کی یہ سعادت حاصل ہو جائے تو اس پر اعتراض کرنا اسلام نہیں اسلام دشمنی ہے"! سید صاحب نے قومی و ملی خدمات کے بعد اپنی نہج پر کام کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر دی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن متوجہ بحق ہو گئے، تسبیح و استغفار میں مشغول ہو گئے یہ تو ان کی سعادت ہے قابل اعتراض بات نہیں"۔ اس کے بعد سید صاحب نے بھی چچا جان کو اسی ادب و احترام اور تسکین و تشفی سے بھرا ہوا جواب دیا۔ یہ جواب ایسا ہے کہ جس کے ہر ہر لفظ سے انابت و تواضع و خاکساری ٹپکتی ہے۔ لگتا ہے، آپ کوثر سے گذر کر ہوا کا کوئی جھونکا سید صاحب تک آ پہنچا ہے اور وہ اس کے نشے میں سرشار ہو کر یہ باتیں لکھ رہے ہیں۔

> "آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن من آنم کہ من دانم علماء پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے اس لئے اگر وہ درست نہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے معاملہ دماغ کا نہیں قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے؛ نفس کا نہیں روح کا ہے۔
>
> میری اتنی زندگی بندوں میں گزری۔ اب کچھ اس زندگی کے لئے کرنا چاہیے جو باقی ہے۔ ابھی منزل مقصود بہت دور ہے ... صرف تسبیح و مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو۔ ہم تو بندوں کی رضامندی اور ناراضی میں گرفتار ہیں۔ مالک کی رضامندی اور نارضامندی کی کس کو فکر ہے۔ دعا کیجئے کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ صحیح راستے پر چلائے[1]

اور یہی وہ اسباب تھے، حال دل اور طلب صادق تھی جس نے سید صاحب جیسے مسند نشین شبلی کو آستانۂ اشرفیہ پر، علم کے دھنی کو فقیر کی دہلیز پر، ملت کے رہبر کو خانقاہ کے حجرہ میں پہنچا دیا اور یہ سید صاحب پر ہی موقوف نہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ علم کے بہت سے اہم ترین ستونوں نے زندگی کی تمام تر نیرنگیوں اور علم و عمل کی بہاروں کے نظاروں سے فارغ ہو کر اسی

---

[1] معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء، آثار علمیہ، مکاتیب سلیمان

راہ میں آکر اپنے ایمان ویقین کو مستحکم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ جیسے عالم جلیل کو دس سال صوفیہ کی صحبت میں رہنے کی ضرورت پیش آئی، امام احمد بن حنبلؒ اپنے علم اور ورع کے باوجود ابو حمزہ بغدادی کو پلکوں پہ بٹھانے کے لئے تیار رہتے تھے اور اپنے صاحبزادے کو صوفیہ کی خدمت میں حاضری کی تاکید کرتے رہتے تھے! امام غزالیؒ نے معقول ومنقول کے سمندر کھنگال ڈالے لیکن گوہر مراد کو پانے کے لیے بو علی فارمدیؒ کے آستانہ پہ پہنچ کر ہی مطمئن وسرشار ہو سکے۔ امام رازی جیسے مشہور متکلم نے شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے علوم وکمالات کے باوجود اسی درویش کے یہاں قلبی تسکین کا سامان پایا۔ جلال الدین رومیؒ برسہا برس میدانِ علم کی بادیہ پیمائی کرنے کے بعد بالآخر شمس تبریز کے یہاں بوریہ نشین ہوئے۔ ابو العباس شریحؒ حضرت جنیدؒ سے اور امام ابو عمرانؒ حضرت شبلیؒ سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے اور بخاری کے مشہور شارح امام قسطلانیؒ نے بھی قاہرہ میں خانوادۂ سہروردیہ سے رشتہ قائم کیا۔ پھر اگر بیسویں صدی کے سیرت نگار رسولؐ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے خالص علمی ودینی علوم پر تبحر کے باوجود اپنے اندر کمی محسوس کر کے اس کی اصلاح کی جدوجہد کی تو نہ صرف یہ کہ انھوں نے شانِ سلیمانی کے عین مطابق کام کیا بلکہ اپنے اپنے وقت کے نابغہ حضرات کی اہم علمی روایات پر چل کر اس فہرست میں اپنا بھی ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔

سید صاحب ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس عمر میں صحت مند آدمی کچھ نہ کچھ کام کر لیتا ہے لیکن سید صاحب کو تنفس کی شکایت ۱۹۴۰ء سے قبل ہی سے چل رہی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں استسقائے قلبی کا مرض لاحق ہو گیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں اس کا اتنا شدید دورہ ہوا کہ لیٹ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آٹھ روز تک دن رات مسلسل کھڑے رہے اور سانس لینا بہت مشکل ہو گیا اس کے بعد سے برابر اس کی شکایت رہی جس نے انھیں کسی مستقل تصنیف سے معذور کر کے رکھ دیا اور حیاتِ شبلی (۱۹۴۲ء) ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی۔ ڈاکٹروں نے اگرچہ لکھنے پڑھنے کی سخت پابندی لگا دی تھی لیکن سید صاحب کو تشفی نہ ہوتی تھی البتہ سختی کی وجہ سے وہ صرف وفیات اور شذرات لکھنے پر قانع ہو گئے۔ ساتھ ہی اپنی نگرانی میں رفقاء سے کتابیں تیار کراتے رہے اور سال میں تین کتابیں دار المصنفین سے شائع ہونا ضروری سا ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کو تحقیقی کام کرنے سے انکی عمر اور صحت نے زیادہ مجبور کیا تصوف نے نہیں کہ اس لئے یہ خیال بھی باطل ثابت ہوتا ہے کہ وابستگیٔ شیخ کے بعد ان کے علمی وتحقیقی کام رک گئے تھے۔

دار المصنّفین سے علیحدگی

سید صاحب اگست ۱۹۴۶ء میں ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ شرقیہ کے امیر ہو کر دار المصنفین سے چلے گئے۔ وہاں چار سال ملازم رہے جون ۱۹۵۰ء میں واپس آکر پاکستان چلے گئے اور تین سال بعد وہیں انتقال ہوا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دکن کالج پونہ کی پروفیسری تو سید صاحب بہت پہلے یعنی اپنی جوانی میں چھوڑ چکے تھے اس کے بعد سے متعدد اہم اور پرکشش عہدوں کی پیش کش کی گئی اور موصوف صرف دار المصنفین میں رہنے کی خاطر سب کو مسترد کرتے رہے۔ علامہ اقبال نے اورنٹیل کالج لاہور میں، رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اور پنجاب یونیورسٹی نے اپنے یہاں پروفیسری پیش کی تھیں۔ ڈی لٹ کی ڈگری بھی ان کے لئے باعثِ فخر نہ بن سکی۔ سید صاحب نے ان عہدوں اور اعزازوں کے لئے عدمِ قبولیت کی راہ صرف اس لئے اختیار کی کہ وہ دار المصنفین کی مستقل خدمت سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتے تھے اگر انھوں نے عالمِ شباب میں ان عہدوں کو مسترد نہ کیا ہوتا تو وہ اس میدان میں بھی بہت ممتاز ثابت ہوتے، ساٹھ برس کی عمر کے بعد ہر آدمی اپنے کنجِ عافیت میں رہنا اور اپنے جوانی کے لگائے ہوئے باغ کے پھل اور ہوا کھانے کے پروگرام بناتا ہے ان سب باتوں کے باوجود سید صاحب پینسٹھ سال کی عمر میں دار المصنفین سے علیحدہ ہو کر دوسری ریاست میں کیونکر ملازم ہو گئے؟ اس سوال کا شافی جواب بوجوہ اب تک سامنے نہیں آسکا ہے، سید صاحب پر مضامین مقالات، معارف و ریاض کے سلیمان نمبر اور دوسرے

لٹریچر میں اس موضوع پر مستقل کلام نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سید صاحب پر جو متعدد مضامین لکھے گئے ان میں بھی کچھ وضاحت نہیں ہے حتیٰ کہ حیاتِ سلیمان جیسی آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب بھی مجبوراً اس باب میں صرف ایک مبہم صفحہ پیش کرنے پر بھی مکتفی ہے۔ ذرا اندر چلیں دار المصنفین کے ناظم اور مدیر معارف سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے اس سوال کے جواب میں فرمادیا کہ "اچھی ملازمت مل گئی۔ اس لئے دار المصنفین چھوڑ کر چلے گئے اور کیا بات ہوتی۔[1] مزید قیاس آرائی کی جائے تو معارف کے سلیمان نمبر کی فہرست مضمون نگاران دیکھنے پر ایک خلا سا نظر آتا ہے۔ دار المصنفین کی تاسیس کے وقت اس کے جو اراکین منتخب و مقرر ہوئے تھے اُن میں سید صاحب کے علاوہ مولانا مسعود علی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد السلام ندوی اور مولانا عبد الباری کے نام شامل تھے۔ سید صاحب تو ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے تھے بقیہ یہ سبھی حضرات کم از کم ۱۹۵۸ء تک اس سے وابستہ رہے۔ ظاہر ہے ایک ایسے علمی ادارے میں چالیس سالہ رفاقت کے بعد مرنے والے پر کم از کم ایک ایک مضمون تو معارف کے سلیمان نمبر میں ان سبھی حضرات کا ہونا چاہیئے تھا لیکن رسالہ مولانا مسعود علی اور مولانا عبد السلام ندوی کے ناموں سے عاری اور خالی ہے۔ یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے اور شرح صدر کے فقدان کا نتیجہ بھی بہر حال محض اس قیاس پر تحقیق کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے نام بھیجے ہوئے سید صاحب کے خطوط کو مکتوباتِ سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کچھ رہنما مواد دستیاب ہوا۔ اس کے علاوہ تمام ہی ممکنہ مکاتیب کا مطالعہ کیا گیا ان میں شاہ معین الدین احمد کے نام دو خطوط صحیح مگر مولانا عبد الباری ندوی نیز مسعود عالم ندوی کے نام متعدد خطوط سے بھی کچھ اہم مواد فراہم ہو سکا اعظم گڑھ کے دورانِ قیام وہاں کے بزرگ شہریوں سے رابطہ قائم کر کے راقم الحروف نے سید صاحب کے ان احباب اور مستفیدین کا پتہ لگایا جو مقالہ کی تبویب کے وقت بقیدِ حیات تھے[2] چند حضرات

---

[1] مقالہ نگار کو اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں اپریل ۸۱ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ حاضری اور قیام کا موقع ملا ادارہ اور شہر و مضافات اعظم گڑھ کے متعدد بزرگوں سے ملاقات کر کے بھی مقالے کے لئے مواد حاصل کیا تھا۔ سید صباح الدین صاحب سے بھی اسی موقع پر یہ سوال و جواب کئے گئے تھے۔

[2] واضح رہے کہ مقالہ مارچ ۱۹۸۲ء میں مکمل ہو چکا تھا۔

ہی مستند قرار پائے جن میں دو کا تعلق ۱۹۱۶ء (پیدائش معارف) اور ۱۹۲۱ء سے ہے۔ ان میں سے ایک صاحب ۱۹۲۹ء میں اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیئے گئے تھے اور دوسرے صاحب آج بھی دارالمصنفین میں موجود ہیں۔ ان سبھی حضرات سے مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

اس کے علاوہ تذکرہ سلیمانؒ میں دو کارآمد چیزیں اور ملیں۔ ایک سید صاحب کے آخری تین سالہ رفیق اور مذکورہ مؤلف غلام محمد صاحب کے خیالات جو سید صاحب کے ملفوظات سے مستفاد ہیں اور دوسرے مولانا عبدالباری ندوی کا ایک خط جو اس موضوع پر وافر معلومات فراہم کرتا ہے اس تحقیقی مواد کے بعد موضوع زیرِ بحث یعنی دارالمصنفین سے سید صاحب کی علیحدگی اور اس کے اسباب کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن موضوع کی وسعت، باب کی تنگ دامانی اور مشرقی وضعداری کی بہرحال مجبوری کے سبب چند اہم اور بنیادی نکات و اسباب پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے جس سے کم از کم شخصیت کے اس تاریک اور قلم انداز پہلو پر اجمالی طور پر مستقل روشنی پڑ سکے گی۔

تاسیس دارالمصنفین سے متعلق گفتگو کے دوران یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے جن شاگردوں کو اپنے بعد کے لئے تیار کیا تھا ان میں لائق ترین ذات سید سلیمان ندوی کی تھی اس لئے شبلی نے تاکید کر دی تھی کہ سیرت نبوی کے مسودات سید سلیمان ندوی (اور مولانا حمیدالدین[1]) کے علاوہ کسی کو ہرگز نہ دیئے جائیں۔ حیاتِ شبلی کو سید سلیمان ندوی کے علاوہ کوئی ہاتھ نہ لگائے غرض علامہ شبلی، سید سلیمان کو اپنا اصل جانشین قرار دے گئے تھے اسی لئے وفات کے بعد خادمانِ شبلی سر جوڑ کر بیٹھے اور سید صاحب کو استاد کی مسند پر بٹھا دیا۔

”سلیمان اس وقت نوجوان تھے کوئی ۲۹، ۳۰ سال کی عمر کے اور کس نوجوان

---

[1] مولانا حمیدالدین فراہی نے بھی سید صاحب کی اہلیت و لیاقت کے پیش نظر یہ کام ان ہی کے سپرد کر دیا تھا۔

کے دل میں دنیوی ترقیوں کے ارمان اور مالی خوشحالی کے حوصلے نہیں ہوتے مرنے والے کی وصیت .... کو سنا، ظاہری کانوں سے نہیں گوشۂ دل سے سنا اور تعمیل اس طرح کی کہ شاید استاد مرحوم خود بھی اس طرح نہ کر پاتے۔ رفیقوں، جلیسوں نے سید الطائفہ کہہ کر پکارا اور خانقاہ شبلی کے اس جنید پر لقب پوری طرح چھا کر رہ گیا۔

۱۹۱۵ء میں دار المصنفین کا باقاعدہ ادارہ قائم کر دیا اور الندوہ کا جانشین نہیں نعم البدل "معارف" کے نام سے جاری کیا ادارہ اور رسالہ نے ۳۵-۳۶ برس کے عرصہ میں جو کچھ کر دکھایا تھا اس کا تعلق ماضی سے نہیں حال سے ہے، خبر سے نہیں مشاہدہ سے ہے، شنید سے نہیں دید سے ہے"[1]

اس ادارہ، رسالہ اور استاد کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے "سب کام چھوڑ کر" سید صاحب آستانۂ استاد پر آپڑے اور پوری زندگی اسی کے لئے وقت کر دی اور ایک سو روپیہ کے قلیل مشاہرہ پر برسوں کام کیا بہت دن کے بعد بڑھتے بڑھتے یہ رقم ڈھائی سو روپے تک پہنچی تھی۔

علمی اعتبار سے اپنی تصانیف اور معارف کے مضامین کے ذریعہ ایک طرف بین الاقوامی سطح پر اس ادارہ کو استناد بخشا، دوسری طرف ملک کے گوشے گوشے میں مذہبی، قومی و ملی جلسوں میں خطبات پڑھنے سے دار المصنفین عوام و خواص کا مرجع نگاہ بن گئی، اردو کے لئے ہر قدم پر بے جھجک میدان میں نکل آنے والا شخص بھی دار المصنفین کا ناظم تھا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۷ء تک مسلسل سیاست کے میدان میں رہ کر ملکی سطح کی سیاسی سرگرمیوں کا ایک مرکز اسے بھی بنایا، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، سروجنی نائڈو اور دوسرے درجنوں لیڈر یہاں آکر قیام کرتے اور بسا اوقات یہیں سے پالیسی تیار ہو کر اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس سے اس زمانے میں دار المصنفین کی شہرت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

اسی طرح انگلینڈ اور عرب ممالک میں خلافت کے وفود کی رکنیت و سربراہی کر کے اس ادارہ کے نام کو چمکایا۔ موتمر عالم اسلامی کے نائب صدر اور قائم مقام صدر بھی

رہے۔ اور ان اسفار میں ایک طرف وزیر اعظم برطانیہ سے بے لاگ گفتگو کی تو دوسری طرف جدہ میں شریف حسینؒ اور حجاز میں عبدالعزیز سے بھی بے باک گفت و شنید ہوئی۔ نتیجتاً دارالمصنفین کا نام روشن ہوا۔

ان بیرونی ممالک میں سید صاحب ہی کے ذریعہ اس ادارہ کی کتابوں کا تعارف ہوا۔ مال گولیتھ اور دوسرے مستشرقین یورپ کے مرکزوں میں سید صاحب کے نام کے ساتھ ساتھ اس ادارہ کا نام بھی دنیا بھر میں گونجا۔ خیامؔ جیسی شہرہ آفاق تصنیف کی اشاعت کا کریڈٹ بھی دارالمصنفین ہی کو گیا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کو نامنظور کر دینے والا شخص بھی اسی ادارہ کا ناظم تھا۔ اپنے خونِ جگر سے اس قطرہ کو بحرِ اعظم بنانے اور اس ادارہ کو پالنے اور بلند ترین مقام دلانے کے بعد عام حالات میں سید صاحب کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ موصوف سب کو چھوڑ کر کسی دوسری ریاست کی تنخواہ قبول کر بیٹھتے۔

جو حقائق اب تک سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں ایک طبقہ کے نزدیک سید صاحب کے رفیق مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، شبلی کی مسند نشینی کے اصل مستحق تھے جب کہ استادؒ کی تمام تاکیدوں سے قطع نظر سید صاحب کے اصرار پر ہی عبدالسلام صاحب کو حیدرآباد کی ملازمت سے استعفیٰ دلا کر بلایا گیا اور ادارہ کا اہم رفیق قرار دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالسلام صاحب بذاتِ خود بڑے شریف، بذلہ سنج اور بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے اور یہ بات بھی محقق ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ سید صاحب کے متعلق انھوں نے کبھی برملا سوءِ ظن کا اظہار نہیں کیا لیکن یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ وہ کبھی کبھی یوں ہی آزردہ خاطر ہو جایا کرتے تھے اور عموماً سید صاحب سے الگ تھلگ رہتے تھے، آخر تک ان کا یہی معمول رہا۔

مولانا مسعود علی صاحب شبلی کے شاگرد تھے اور سید صاحب کے گہرے دوست۔ انتظامی صلاحیتوں میں ملکہ تھا۔ شبلی کی نگاہِ انتخاب تعمیرات کے سلسلے میں انہی پر پڑی تھی۔ اس لئے دارالمصنفین کی بیشتر عمارت ان ہی کی نگرانی کا نتیجہ ہے۔ موصوف نوابانہ انداز سے زندگی گزارتے تھے اور ان کا شمار شہر کے باثر حلقہ میں کیا جاتا تھا لیکن پڑھنے لکھنے کی کوئی شہادت نہ مل سکی جب کہ سید صاحب کی پے بہ پے شائع ہونے والی کتابوں اور اپنے رفیق کار

کی عظمت و برگزیدگی اور بین الاقوامی شہرت کے نتیجہ میں بتدریج احساس کمتری کا شکار ہوتے گئے۔ مزید برآں اپنے عہدہ کے سبب اس احساس برتری نے نخوت کی شکل اختیار کرنی شروع کردی اس کے مظاہر بھی سامنے آنے لگے چنانچہ پہلی بار خلافت کے رئیس وفد کی حیثیت سے جب حجاز کے سفر سے واپس آئے اور اس کے بعد جلد ہی خطبات دینے کے لئے مدراس کا سفر درپیش ہوا تو مولوی مسعود علی صاحب نے ان سے محاسبہ شروع کردیا کہ آپ اتنے اتنے دن دارالمصنفین سے باہر رہتے ہیں۔ سیاست لڑاتے اور دنیا بھر میں گھومتے ہیں، ہم مستقل دارالمصنفین کی چہار دیواری میں رہ کر اس کی خدمت و حفاظت کرتے رہتے ہیں[1]۔ یہ محاسبہ شدید تر ہوتا گیا، ادارہ کے ملازمین کے سامنے بھی اسی طرح کے استفسارات ہوتے، دونوں کی قیام گاہیں آمنے سامنے تھیں، اختلافات کی باتیں گھروں کے اندر بھی ہونے لگیں۔

دونوں کے مکانوں کے سامنے صرف ایک صحن تھا اور دارالمصنفین کی زمین باغ کے ساتھ سبزی کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ سبزی کی مساوی تقسیم پر خواتین کے روایتی جھگڑے اور طعن و تشنیع کا سلسلہ طول پکڑ جاتا اور سید صاحب اپنے زیردستوں کو ہر حال میں سکوت اختیار کرنے کی تلقین و تاکید کرتے[2]۔

سید صاحب کی اہلیہ بھی حلیم الطبع تھیں۔ کیسا ہی سنگین موقع آجائے، بات آگے بڑھا کر اپنا وقار کم کرانے کے عادی نہیں تھیں۔ عرصہ تک وہ بھی اسی طرح نبھاتی رہیں لیکن اندر و باہر کی اس کشمکش سے سید صاحب پریشان رہنے لگے غیر معمولی محنت اور ان حالات کا اثر

---

[1] حالانکہ بہ ظاہر بات ہے کہ دارالمصنفین کوئی اسکول یا مدرسہ نہ تھا جہاں حاضری کی پابندی سے اہتمام ضروری ہو، مصنف تو یوں بھی حسب مراد جگہ جاکر کام کرسکتا ہے اور خود سید صاحب کے علمی مشاغل تو کسی بھی سفر میں کم نہیں ہوئے وہ نہ صرف وہاں سے مضامین بھیجتے رہتے بلکہ اپنے کارناموں کے ذریعہ وہاں دارالمصنفین کی بڑے پیمانے پر تشہیر کرتے تھے۔ ان افادات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ وقتِ ضرورت سید صاحب کی غیر حاضری بھی ادارہ کے لئے افادیت سے معمور ہوتی تھی۔

[2] یہاں ناموں کے اظہار سے عمداً گریز کیا جارہا ہے۔

ان کی صحت پر پڑا۔

تحقیقی ذرائع مؤید ہیں کہ تھانہ بھون سے وابستگی کے بعد وہ مزید حیلوں سے پریشان کیے جاتے اور طرح طرح کی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک مرتبہ دارالمصنفین میں عقیدتمندان تھانوی کی ایک مجلس منعقد ہوئی، چشم دید حضرات کا بیان ہے کہ بعد میں اس پر بھی اظہار ناراضگی ہوا۔ اگرچہ دارالمصنفین کی انتظامیہ کے بیشتر خود بھی تھانہ بھون ہی سے وابستہ تھے اور پہلے سے تھے لیکن سید صاحب کا امتیاز یہاں بھی برقرار رہنے کے سبب توازن کا کہیں کوئی راستہ نہ نکل سکا۔ دارالمصنفین کے رفیق شاہ معین الدین احمد صاحب جو بیس سال تک سید صاحب کے ساتھ رہے اور ان معاملات سے اچھی طرح واقف تھے، سید صاحب کے جانے کے بعد چند سال تک مولوی مسعود صاحب کی نظامت میں بھی کام کیا۔ ان پر مولوی مسعود علی صاحب کے گہرے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ موصوف نے حیاتِ سلیمان میں ان حالات و اسباب پر بہت مختصر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک شاہد قدیم اور ایک مستند ماخذ ہونے کی حیثیت سے ان کے اس اختصار میں بھی ایک دریائے بیکراں موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ

> ” ایک زمانے میں ان دونوں کا اتحاد ضرب المثل تھا اور دونوں نے دارالمصنفین کو پروان چڑھایا تھا لیکن پھر اختلاف بھی اسی درجہ کا ہو گیا۔ اس کا سبب دونوں کا اختلاف مزاج تھا۔ سید صاحب نرم خو، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے۔ اختلاف اور جنگ و مقابلہ سے گھبراتے تھے۔ ان کی ایک سطح تھی جس سے کسی حال میں نیچے نہ اترتے تھے۔ مولانا مسعود علی کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا۔ اب اس کی تفصیل کیا لکھی جائے ..... وہ کسی معاملہ میں ادنیٰ اختلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ دارالمصنفین کے معاملات میں بھی استبداد اور مطلق العنانی سے کام لیتے تھے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان کو کسی بات میں تامل نہ تھا، اس لئے دونوں میں اختلاف بڑھتا گیا جس کا اثر دونوں کے گھروں سے کر دارالمصنفین کے معاملات تک پہنچ گیا۔ سید صاحب اس کو اپنی طبعی بردباری اور دارالمصنفین کے مصالح کی خاطر برداشت کرتے رہے لیکن آخر وقت میں ان کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ان کا دارالمصنفین میں سکون کے

ساتھ رہنا مشکل ہو گیا، اس کی تفصیل بڑی طویل اور ناخوشگوار ہے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اس لئے ان کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔"[1]

شاہ صاحب کی کسر نفسی اور دونوں فریقوں سے تعلقات کی جھلک اس کے ایک ایک حرف سے عیاں ہے اگرچہ پوری کتاب میں یہی ایک موقع ہے جہاں موصوف نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے لیکن یہاں بھی دینی حمیت، بلندئ اخلاق، اور پاس ادب ان تلخ ترین حالات کے بیان کرنے میں ہر ہر جگہ ساتھ رہا ہے اور جہاں دامن احتیاط ہاتھ سے چھوٹتا نظر آیا بلطائف الحیل دونوں جگہ کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ بیانِ بالا میں موضوعِ زیرِ بحث کی کونسی کائنات ہے جو جلوہ نما نہیں ہے۔

سید صاحب کا اثر اندرون و بیرونِ ملک کے مشاہیر کے علاوہ خود ارباب و عمائدین ادارہ پر بھی کچھ کم نہیں تھا اور یوں بھی سید صاحب نے جو خدمات انجام دی تھیں، سبھی ان کے معترف تھے اور دار المصنفین کی اتنی عظمت کا واحد سبب سید صاحب ہی کو متصور کرتے تھے، اگر سید صاحب ان حالات کو ادارہ کی مجلس عاملہ میں پیش کر دیتے تو غالباً مولوی مسعود علی صاحب کا دار المصنفین میں موجود رہنا ہی مشکل ہو جاتا لیکن یہاں بھی سید صاحب کی سیادت نے انھیں غیر معمولی حلیم الطبع ثابت کر دکھایا وہ جن ناساعد حالات کا ایک عرصہ تک شکار رہے اس صفتِ حلم کی بدولت انھوں نے شکایت کا شعار اختیار نہیں کیا۔ کتابوں اور محولہ مضامین میں کیے گئے اشاروں اور احباب کے ذریعہ سنی گئی باتوں کے علاوہ سید صاحب کے اس دور کے بعض تکلیف دہ خطوط بھی اس سلسلے میں عصری اور داخلی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء کے ایک خط میں کس بے بسی اور عاجزی کے ساتھ اپنے گہرے دوست کو لکھتے ہیں:

"برادرِ من۔ میں جس طرح بسر کر رہا ہوں میری دعویٰ ہے کہ بہت سے احباب اس طرح چند سال بھی بسر نہیں کر سکتے۔ تاہم میں نے سترہ سال بسر کیے اور چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے ٹھیس نہ لگے اور جس طرح یہاں میں جسمانی اور روحانی آلام

---

[1] حیات سلیمان ص ۵۶۹،

میں رہتا ہوں ان سے نجات کی ہر وقت آرزو ہے۔

برادرِ من! میری حالت ہمدردی کے لایق ہے، ملامت و عتاب کے لایق نہیں
میں اپنے رونے کا بھی آپ مالک نہیں۔
یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد،،[1]

یہ تکالیف جھیلنے کے باوجود حسنِ اخلاق کا یہ حال تھا کہ نہ صرف خاموش رہتے بلکہ اگر دور رہتے تو برابر ان کی خیریت معلوم کرتے اور صحت کی طرف سے اظہارِ تشویش کرتے رہتے جو رفقائے ادارہ معاملات سے باخبر اور سید صاحب کے حامی تھے ان کو سخت ہدایت کرتے کہ سوء ادب نہ ہو جائے میرا ان کا معاملہ ہے، آپ کو میری حمایت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں، آخر وہ بھی تو مینجر مطبع ہیں ان کا بھی کچھ اختیار ہے۔ میری غلطیوں پر ہی تو مجھے تنبیہ فرماتے ہوں گے! اس کے علاوہ سید صاحب خواہ کتنے ہی رنجور ہوتے لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں ان سے مشورہ میں وہی وضع اور شان برقرار رہتی۔ ایک مرتبہ انھوں نے طویل عرصہ تک بہت سخت سست، کہا اور پھر معافی تلافی کرلی لیکن وہ ایسا (ناقابلِ اظہار) واقعہ تھا کہ برسوں اس کا داغ نہ دھلتا مگر سید صاحب نے اس سلسلے میں جو معاملہ فرمایا اس کے بارے میں خود ان کے ایک خط سے روشنی ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

„جس تاریخ کو برادرِ موصوف تھانہ بھون گئے تھے اس دن ان کے طرزِ عمل سے یقین تھا کہ میری ہزار برائیوں کے باوجود میری طرف سے انھیں کوئی شکایت نہیں اور ہو بھی تو وہ معافی مانگ چکے اور میں بھی مسجد میں معافی مانگ چکا۔ اس کے بعد کوئی حرکت ہوئی تو میں ہر طرح طلبِ عفو کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ باوجود برادرِ موصوف کی خاموشی کے میں نے ان کو تھانہ بھون خط لکھا انھوں نے ویسا ہی جواب دیا جیسا وہ دے سکتے تھے[2] اور اس کے باوجود آج ان کو خط لکھ رہا ہوں اور مشورہ مانگ رہا ہوں“

---

[1] فاران کراچی، دسمبر ۱۹۵۵ء

[2] طنز و طعن و ملامتوں سے بھرا ہوا خط۔

جیسا جواب آئے!![1]

آخری جملہ میں جو سوز پنہاں ہے اہل تجربہ اس کی کسک سے غافل نہیں رہ سکتے۔ روایات شاہد ہیں کہ اختلافات اور ضد کا کمال یہ تھا کہ سید صاحب کی مطبوعات کی اشاعت بھی بند کرادی گئی، اسٹور سے کتابیں نہ نکالنے کی سخت ہدایات جاری کردی گئیں، یہی نہیں بلکہ برسات کی سیلن میں دھوپ لگانے کی بھی سخت ممانعت کردی گئی نئی کتابوں کے طباعت کے راستے بند کردیئے اور سید صاحب کو علمی طور پہ مفلوج کرنے میں کسر نہ چھوڑی لیکن سید صاحب نے اپنی مروّت، حلم و ایثار، شرافت طبعی اور ادارے کی بدنامی کے سبب اُف تک نہ کی۔ مولانا عبدالباری نے لکھا ہے کہ

> "سید صاحب اپنی علمی و دینی خدمت و محنت کے ایک بڑے سرمائے کو برباد ہوتے دیکھ رہے تھے اس کا قلق خود ان کو جتنا ہوگا، دوسرا اندازہ بھی کیسے کرسکتا ہے اور اس میں ان کو اشخاص کے ذاتی تعلقات سے بھی کہیں زیادہ ادارے کی اصلاح کی فکر تھی!"[2]

ان حالات میں سید صاحب کو مجبوراً دارالمصنفین سے جدائی کا تلخ ترین فیصلہ کرنا پڑا نئے مسکن کی تلاش میں ان کی نگاہیں نہ جانے کہاں کہاں کی پیش کش کی خبریں لائیں۔ آخر میں علی گڑھ اور پنجاب یونیورسٹیوں کی پروفیسری حیدرآباد اور بھوپال میں جامعہ علوم شرقیہ کی ڈائریکٹر شپ (امارت) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا چنانچہ یہاں بھی حسب دستور سابق معیارِ ذوق سے مطابقت رکھنے والے عہدہ کا انتخاب کیا۔ عربی ادب اور اسلامی علوم کی بقاء و ترویج اور عوام کو ان سے لازمی استفادہ کے امکانات کی خاطر نواب حمیداللہ والی بھوپال کے دس سالہ اصرار کو جون ۱۹۴۶ء میں قبول کرلیا اور عہدہ کی قبولیت کے ساتھ ہی بہ شرط بھی منظور کرائی کہ دارالمصنفین سے ان کا تعلق بدستور قائم رہے گا اور وہ ضرورت و نگرانی

---

[1] فاران کراچی، دسمبر ۱۹۵۵ء مضمون "مکاتیب سلیمان" از مولانا عبدالباری ندوی۔

[2] فاران کراچی بحوالہ سابق

کے لئے اعظم گڑھ جاتے رہیں گے۔

انھیں دار المصنفین سے علیحدگی منظور ہو گئی لیکن مذکورہ بالا تمام باتوں کے باوجود وہ اس کے پُر از برگ و بار درخت کے تنزل کے خطرات کے پیشِ نظر اس کی نگرانی سے کنارہ کشی اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ موصوف کا جسم تو بھوپال میں تھا لیکن روح اپنے گھر پر منڈلاتی رہتی تھی۔ اس کے تذکرے برابر مجلسوں میں کرتے اور احباب کو یاد کرتے رہتے تھے۔ خطوط میں بھی اپنے چمن کے لئے یہ بلبل ہمیشہ نوا سنج رہتا۔ شاہ معین الدین احمد صاحب کے نام بھوپال کے ابتدائی زمانے کے ایک خط کا کچھ حصّہ محل نظر ہے۔

"یہاں سرکاری مہمان خانے میں ہوں بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آیند مستقبل ہے مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے۔ اے کاش کہ مجھے وہاں سکون میسر آتا، خلاف مزاج حالات سے میں بچا رہتا، وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے۔

حب الوطن از ملکِ سلیمان خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی می کرد
می گفت گدا بودن کنعان خوشتر

ایک ہزار تنخواہ، سواری کا الاؤنس اور پانچ سو روپیہ ماہوار سلسلۂ دار التصنیف کے لئے اور دفاتر و محاکم شرعیہ اور تعلیمات مشرقی کی امارت۔ اس جاہ و اعزاز سے نہ دل میں فرحت اور نہ قلب میں انشراح۔ استاد مرحوم نے اخیر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا

مرا گر تو بگذاری اے نفسِ طامع
بے بادشاہی کنم در گدائی

بحمد اللہ و بفضلہ طمعِ نفس سے خالی ہوں مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے جن میں سے ایک دار التکمیل کا خیال ہے جو مجھے یہاں لایا ہے۔"[1]

---

[1] معارف فروری ۱۹۵۴ء

بھوپال میں سید صاحب کا قیام تقریباً چار سال رہا۔ نواب صاحب ضرورت وتوقع سے زیادہ اور بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ قاضی القضاۃ اور امارت تعلیمات علوم شرقیہ کے عہدہ جات جلیلہ پر فائز کیا۔ عوام وخواص نے شروع میں تو شور مچایا کہ دونوں اہم ترین عہدے ایک ہی شخص کو "باہر" سے بلا کر دے دیئے گئے، اخبارات نے بھی اسے خطرے کی گھنٹی تصور کیا لیکن چند ہی ماہ میں جب سب نے شانِ سلیمانی کو دیکھا تو شرافت وعظمت کا اعتراف کیا اور موصوف مرجع خلائق بن گئے اور پھر تو عوام کے اجتماعات، خواص کی صحبتیں اور روحانی مجلسیں جاری رہتیں اور عوام کی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۹ء میں سفر حج کے ارادے کے ساتھ ہی موصوف نے بھوپال چھوڑنے کا ارادہ کیا تو عوام وخواص نے بھوپال کے قیام پر اصرار کیا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کی ابتری کے سبب سید صاحب کا وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ہو رہا تھا لیکن اہل بھوپال کی محبت کی خاطر اس وقت تو سفر کے محض معمولی سامان کے ساتھ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں حج کو روانہ ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت تو سفرِ حج درپیش ہے اور دعا کرتا ہوں کہ موانع مرتفع ہوں اور امسال محرومی نہ رہے اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ اپنے سارے رفقاء جن کے ساتھ زندگی کا بڑا اور اہم حصہ بسر ہوا اپنی تقصیرات کی معافی چاہوں اور یہ رسمی طور پر نہیں بلکہ واقعی طور پر اس لئے آپ سے اور دیگر رفقاء سے آپ کے ذریعہ یہ خواہش پیش کی ہے میں اپنے دل سے بھی سب کو معاف کرتا ہوں۔
>
> دارالمصنفین کے مستقبل کے متعلق آپ کو جو تشویش آج ہے وہ میرے سامنے روز اول سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمت اور استقلال بخشے۔ آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں، دوامی زندگی لے کر تو کوئی آیا نہیں۔ ع آج وہ کل ہماری باری ہے، پھر کام تو آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے۔"[1]

---

[1] معارف فروری ۱۹۵۴ء۔ آثار علمیہ خطوط سلیمان بنام شاہ معین الدین احمد

حج کو گئے تو وہاں ایک طرف تو مکۂ معظمہ میں رباط بھوپال میں قیام کا انتظام تھا۔ دوسری طرف سلطان عبدالعزیز بن سعود نے اپنا خصوصی مہمان بنایا۔ سید صاحب نے قیام قبول نہیں کیا صرف کھانا ساتھ کھاتے تھے[2] یہ پورا سفر خالص رضائے الٰہی کی کوششوں، مصروفیتوں اور محنتوں پر صرف ہوا۔ سفرنامہ تو کیا خط تک لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ عبدالحکیم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس وقت طبیعت کا یہ رنگ رہا کہ قلم چھونے کو جی نہیں چاہا کہیں خط تک نہیں لکھا، کوئی روزنامچہ نہیں لکھا غرض ایک صفحہ تحریری سامان اس سفر میں ہاتھ نہ آیا۔ وہاں ایک نجدی عالم سے تصوف پر بحث ہوئی اور قرآن و حدیث کے حوالے سے سید صاحب نے اس کی حقیقت سمجھائی تو اس نے تصوف کی اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے دورانِ قیام عشقِ الٰہی اور حبِ رسول کی غیر معمولی کیفیت طاری رہی، مولوی عبدالمنان بیدل نے بھی اسی سال حج کیا تھا۔ سید صاحب سے انھیں قربت ہوگئی تھی، ان کا یہ تاثر ہے[1] کہ سید صاحب کی جو واردات و کیفیات اور جو احوال دیکھے پورے مجمع میں چند ہی نفوس اس معراج کو پہنچے ہوں گے۔ طواف بیت اللہ اور مزار اقدس پر حاضری کا صحیح ترین لطف اٹھانے والوں میں سید صاحب کا خاص مقام ہے۔

راہ سلوک اختیار کرنے اور حضرت تھانوی سے وابستگی کے بعد سید صاحب کی شاعری کا جو نیا دور شروع ہوا۔ وفات شیخ کے بعد وہ سرد پڑ گیا تھا لیکن حرمین شریفین کی اس حاضری نے اس میں دوبارہ حرارت پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں وہاں بھی چند جواہر ریزے ظہور پذیر ہوئے۔ مرتبہ کے اعتبار سے بیت اللہ شریف کی ایک غزل اور مزار اقدس کی زیارت کے وقت کی ایک نعت ان ہر دو میدانوں میں ان کا امتیاز ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

---

[1] معارف سلیمان نمبر "سفر حجاز کے تاثرات ص ٢٤٨

[2] سید صاحب کے صاحبزادے محترم سید سلمان صاحب نے بتایا کہ میں خود سید صاحب کے ساتھ اس حج میں موجود تھا، والد محترم نے رباط بھوپال کا قیام چھوڑ کر سلطان کا مہمان بننے سے انکار کر دیا۔ البتہ کھانا قبول کر لیا۔

دیدہ و دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں　　جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں
روز مرا نیا مقام صبح کہیں، کہیں ہے شام　　عشق کی منزلیں تمام راہ خم و دراز میں
دل کو نصیب ہو گداز جاں کو عطا ہو سوزِ نو　　ہے یہ دعا بعد نیاز درگہِ بے نیاز میں
دل جو مِلا سیاہ کار آنکھ عطا ہوا اشک بار　　دھوئے جو دل کو بار بار خلوتِ خاص راز میں

نعت بھی ذیل میں نقل کی جاتی ہے تاکہ اس صنف میں اس کے مقام کی تعین میں آسانی ہوسکے۔

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے　　مکی و مدنی ہاشمی و مطلبی ہےؐ
پاکیزہ تر از عرش و سما جنتِ فردوس　　آرام گہہ پاک رسول عربی ہےؐ
آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو　　خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے
اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ　　بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوبِ نبی کی　　محبوب خدا وہ ہے جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینے میں مدت سے لگی ہے

حج سے واپسی کے بعد سیاسی حالات[لہ] کے سبب سید صاحب نے جنوری ۱۹۵۰ء میں بھوپال سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دوران دارالمصنفین سے محبت میں کیونکر کمی آسکتی

[لہ] ہندوستان آزاد ہونے کے بعد تمام ریاستی نظام ختم کردیا گیا۔ بھوپال کی ریاست بھی انڈین یونین میں شامل کرلی گئی اسی کے ساتھ ساتھ تمام مراعات ختم کردی گئیں۔ ہر پرانی چیز بتدریج ختم کی جارہی تھی۔ قاضی القضاہ کا عہدہ بھی باقی نہیں رہا۔ شرعی تعلیمات کا بورڈ بھی ختم کیا جانے والا تھا سید صاحب نے فوراً استعفیٰ پیش کردیا۔ اور پھر جلد ہی وہ بورڈ بھی توڑ دیا گیا۔ استعفیٰ کے وقت سید صاحب کے پیچھے ایک مقدمہ لگ گیا، اپنی بیٹی کی طلب پر انھوں نے بارہ سو روپے انھیں پاکستان بھیجے تھے۔ اس حقیقت سے لاعلمی اور محض شک کی بنا پر ملکی سطح پر سرمایہ کی منتقلی کا الزام عاید کیا گیا۔ سید صاحب نے حاضرِ عدالت ہو کر اصل صورتِ حال پیش کی تو مقدمہ اٹھا لیا گیا۔

تھی بلکہ انھیں یہ خیال تھا کہ دار المصنفین میں ان کی موجودگی کے زمانے میں منتظم صاحب سے تعلقات خراب تو رہے لیکن ادارہ ان کی وجہ سے کس بلندی پر نہ پہنچ گیا ہے۔ اس بات کا سبھی کو اعتراف ہوگا۔ ایک بات تو صحیح نکلی لیکن ان کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا کہ ان کی عدم موجودگی نے دل کی کدورتوں کو بھی صاف کر دیا ہوگا اور اب پھر ان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہوگی۔ اس خوش خیالی میں وہ بھوپال سے واپسی میں اپنے وطن دیسنہ ہوتے ہوئے مئی ۱۹۵۰ء میں اعظم گڑھ پہنچ گئے۔ جب یہاں جائزہ لیا تو حالات پہلے سے بھی ابتر ہو چکے تھے کسی کا استقبال اور خیر مقدم تو کیا اب تو بعض پرانے اپنے لوگ بھی ساکت وصامت نظر آ رہے تھے باتوں کے جواب میں مصلحت اندیشی کارفرما تھی۔ اب یہاں کشش وجاذبیت کی مسند پر تحیر وحسرت جلوہ افروز تھی جس کی چلمن سے نفرت ولاتعلقیت جھانک رہی تھی، اس طرح کے حالات نے سید صاحب کے دل پر زبردست ضرب لگائی اور وہ بھی آزردہ وپژمردہ رہنے لگے۔

دراصل ان حالات کے دو اسباب تھے اول مینجر صاحب کا یہ احساس کہ اتنے عرصہ ادارہ میں رہنے کے علاوہ قیام بھوپال کے چار سالہ دور میں بھی وہ یہاں کے کام دیکھتے رہے بالفاظ دیگر اقتدار پر قابض رہے اور اس کے بعد اب پھر یہیں واپس آ گئے۔
دوسرے بھوپال کے زمانۂ قیام میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے اسلامی دستور اساسی کی تشکیل کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کی صدارت کا عہدہ سید صاحب کو پیش کیا گیا تھا مگر انھوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ انٹلی جینس نے اس پیش کش کی اطلاع حکومت ہند کو دے دی چنانچہ جب وہ حج کو گئے تو پاکستان میں ان کی موجودگی کی تشہیر کر دی گئی۔

> "دسمبر ۱۹۴۹ء میں جب میں سفر حج میں تھا۔ ہندوستان کے اخبارات نے بے بنیاد خبریں میری پاکستان میں موجودگی کے متعلق شائع کیں۔ یہاں تک کہ میرے منصب اور عہدے کی بھی تعیین کر دی گئی۔"[1]

---

[1] مکتوبات سلیمان، جلد دوم ص ۲۲۷

جب سید صاحب دار المصنفین پہنچے تو اس خبر سے فائدہ اٹھا کر اس طرح کے بہی خواہوں نے کچھ خطرات کی نشاندہی کر کے اور کچھ پاکستان میں ان کے سنہرے مستقبل کے خواب پیش کر کے وہاں جانے کے مشورے دیئے۔

> " مولانا مسعود علی کو یہ یقین تھا کہ سید صاحب کی دار المصنفین سے علیحدگی کے بعد وہ بلا شرکت غیرے اس کے مالک و مختار ہو جائیں گے اس لئے سید صاحب کی بھوپال کی واپسی کے بعد ان کی کوئی پذیرائی نہیں کی بلکہ اُلٹے ان کو پاکستان جانے کے سبز باغ دکھا کر وہاں جانے کا مشورہ دیتے رہے۔[1]

سید صاحب پاکستان سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> "..... دار المصنفین میں مجھ سے خود بھی کہا تھا اور اب بھی میں نے سنا ہے کہ مولوی صاحب (مولوی مسعود علی صاحب) نے فرمایا ہے کہ میں یہاں دار المصنفین قائم کر لوں تو محمد علی جناح کی طرح میرا کارنامہ ہوگا۔ میں نے ہندوستان میں دار المصنفین قائم کر کے کیا فائدہ اٹھایا جو یہاں قائم کر کے حاصل کروں گا۔ اب جب وقت آیا کہ جوانی کی محنت سے بڑھاپے میں فائدہ اٹھاؤں جو صیاد نے چمن سے باہر نکال دیا۔"[2]

غرض بھوپال سے دار المصنفین آنے پر سید صاحب کے تمام خیالات قیاسی و فرضی نکلے ہی نہیں بلکہ جب یہ امکان پیدا ہو گیا کہ سید صاحب پاکستان جا سکتے ہیں تو اختلاف میں بھی اتحاد جلوہ گر نظر آیا اور کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو سید صاحب سے قیام دار المصنفین پر اصرار کر سکے اور ان کے وجود کا خیر مقدم کر سکے۔ مزید برآں عملی طور پر انھیں اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ رخت سفر باندھ رکھیں اور جانے کے لئے موقع کی تلاش میں رہیں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد سید صاحب نے مولانا عبد الماجد دریا بادی رئیس مجلس عاملہ دار المصنفین کے نام بھیجے ہوئے

---

[1] حیات سلیمان ص ۵۷۰

[2] ایضاً

ایک خط میں اپنی ناقدری کے گلے کے ساتھ دارالمصنفین سے رُخصت کرنے کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"اگر واقعی میری قدردانی آپ کے دلوں میں ہوتی تو آپ کے ارکانِ منتظمہ و ارکانِ عاملہ یا ناظم امورِ انتظامی (مولانا مسعود علی صاحب[1]) میری واپسی کیلئے کوئی

---

[1] قیام دارالمصنفین پر گفتگو کے دوران یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسعود صاحب انتظامی صلاحیتوں میں یکتا تھے اور شبلی کے معتمد بھی۔ اس موقع پر بھی اس کا اعتراف ضروری ہے لیکن اس سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا مسعود علی صاحب ۱۹۱۴ء کے شاگرد شبلی تھے۔ استاد نے ان کی علمی لیاقت کا کہیں اور کبھی اعتراف نہیں کیا، آج بھی بہت سے شاگردوں کو ان کی انتظامی صلاحیتوں اور سماجی سرگرمیوں کے پیشِ نظر بعض اساتذہ محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کا علمی پایہ بھی بلند ہی ہو۔ حقایق بتاتے ہیں کہ شبلی نے علمی میدان کے لئے سید صاحب ہی کا انتخاب کیا تھا۔

مسعود صاحب شاگرد شبلی ہونے کی حیثیت سے دارالمصنفین کے آغاز میں واقعی انتہائی مخلص تھے جن کی طرف شاہ صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد وہ پہلے جیسے مسعود صاحب نہ رہے تھے بلکہ حالات نے انھیں سید صاحب کا حریف و رقیب بنا دیا تھا اور اب ان کی سختی و محاسبہ خالص انتظامی صلاحیتوں کی دلیل نہیں بلکہ یہاں رقابت و چشمک کی کارفرمائی اپنے عروج پر تھی جیسا کہ واقعات شاہد ہیں۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ سید صاحب کے جانے کے بعد مسعود صاحب کسی بدل یا نعم البدل کا انتظام نہ کر سکے بلکہ ادارہ میں اب وہ لوگ بھی نہ رہے جو سید صاحب کے زمانہ میں تھے۔ ظاہر ہے اسے محض ان کی انتظامی صلاحیت نہیں کہا جا سکتا۔ ان حالات کی بنا پر سید صاحب اور مسعود صاحب کے درمیان تعلقات کی خرابی کا جو مختصر اور محتاط تجزیہ پیش کیا گیا ہے اسے غالباً سید صاحب کی جانبداری پر محمول کرنے کی گنجائش کم رہتی ہے۔ پیش کردہ حقائق کے لئے دوسرے مآخذ کے علاوہ اعظم گڑھ میں ایسے افراد سے تفصیلی ملاقاتوں کے بعد یہ رائے قائم کی گئی ہے جو سید صاحب کے جانے کے بعد برسوں مسعود صاحب کے دست راست رہے تھے۔ بایں ہمہ تحقیقی مقالہ کسی موضوع پر حرف آخر نہیں ہوتا بلکہ وہ تحقیق دروازے کھلے رہنے اور حقایق وانکشاف کرنے کی تحریک بھی دیتا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سید صاحب کے صاحبزادہ محترم ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب نے علامہ سید سلیمان ندوی سے متعلق ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کی کتاب پر اپنے پیش لفظ میں ایک پورے پیراگراف میں راقم الحروف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس موضوع پر کھل کر بحث کرنے سے باز رکھنے کے لئے بقول ان کے "متنبہ" کیا تھا۔ لیکن کیا کہا جائے کہ شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور بعض دیگر حضرات اس مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ ان حقایق کی تلاش اور ان کی پیشکش میری مجبوری تھی، میں نے بعض نام اور کافی نتائج تحقیق اس مقالہ و کتاب میں شامل نہیں کئے ہیں، اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں صرف مختصر، ضروری اور محتاط انداز میں اپنے معروضات پیش کر دیئے ہیں میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے والد محترم اور مولانا عبدالباری ندوی کے تحریری بیانات کو قلمزد نہیں کر سکتے اور مجھے امید ہے کہ ان معروضات کے ملاحظہ کے بعد موصوف اپنے خیال پر نظرثانی فرمانے پر مجبور ہوں گے۔ البتہ یہاں میں شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سے صد فیصد متفق اور ان کا موئید ہوں کہ چوں کہ دونوں اس دنیا میں نہیں رہے اس لئے اب اس باب کو بند ہو جانا چاہیئے۔

> اصرار یا درخواست پیش فرماتے اور دار المصنفین میں میرے قیام پر مصر ہوتے حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں احباب کے مقابلہ میں انکار کا مادہ ہی سرے سے نہیں، میں تو ہمیشہ سے مروت کا مارا ہوا ہوں بلکہ احباب خاص (مولانا مسعود علی صاحب) نے مشورہ دیا کہ آپ کا ہندوستان میں اب کوئی کام نہیں آپ ہندوستان سے باہر جائیں، اس کے یہ معنی ہوئے کہ دار المصنفین کو میرے وجود کی ضرورت نہیں اور ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میرے سامان کی خریداری میں سبقت کی۔"[1]

اس سلسلہ کے آخر میں بغیر کسی تبصرے کے ایک معاصر رائے پیش کی جاتی ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے سید صاحب کے تین برس کے بعد ندوہ میں داخلہ لیا تھا، اس وقت سے پاکستان جانے تک ..... بلکہ پاکستان جانے کے دو سال بعد بھی دونوں کے درمیان دوستانہ و برادرانہ تعلقات رہے اور وہ سید صاحب کے رازداں ہی نہیں رازدار ہو بھی ہوں گے۔ معارف کے سلیمان نمبر میں "سیرۃ السید کے انمول سبق" کے عنوان سے شائع شدہ مضمون ان ہی مولانا عبدالباری صاحب کا لکھا ہوا ہے جس پر تبصرہ خود ان کے قلم سے آگے آتا ہے۔ معارف کا سلیمان نمبر شائع ہوا اور موصوف نے غلام محمد صاحب کے مضمون بعنوان "سیرت سلیمانی کا عرفانی پہلو" کا مطالعہ کیا جس میں انھوں نے ایک جگہ یہ دکھایا تھا کہ ہندوستان کی، سید صاحب کی پوری زندگی ناز و نعم اور عیش و مسرت اور کامرانیوں سے لبریز، ہمیشہ لائق شکر رہی ہے تو اس کے بعد مولانا عبدالباری صاحب نے غلام محمد صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ

> "ان (سید صاحب) کے مقامات عالیہ میں جس مقام کی معرفت سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والا بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا اور جس کا میرے اوپر سب سے زیادہ اثر رہا وہ ان کا مقام صبر تھا۔ چالیس سال کے بے شمار مواقع و تجربات میں کبھی شاذ ہی خفیف لغزش کا مشاہدہ ہوا ہوگا۔ وہ بھی بس لب و لہجہ کے خفیف تغیر کی حد تک۔

---

[1] مکتوبات سلیمانی جلد دوم ص ۲۲۲

مولانا گیلانی مدظلہ، ذرا دور کی[1] اور آپ صرف آخری دور کی واقفیت کی بنا پر خیال فرماتے ہیں کہ سید العارفین کی زندگی کا بیشتر حصہ شکوریت کی راہ تھا اور صباریت کی منزل سے صرف آخر زمانہ میں گزار دیا گیا۔

کیا کہوں، سنی سنائی نہیں آنکھوں سے دیکھی[2] سناتا ہوں کہ ان کے امتحان صباریت کی بڑی کڑی کڑی منزلیں خود دار المصنفین کے دوران قیام میں آئیں اور اس کا خاتمہ جیسی ٹریجڈی (المیہ) پر ہوا کہ جس ادارہ کو انھوں نے تیس پینتیس ۳۵ برس خونِ جگر پلا پلا کر پالا تھا اس سے دودھ کی مکھی کی طرح علیحدگی، بس سید عالی مقام ہی کا ظرف تھا جو خون کے اس گھونٹ کو بھی صبر و سکون ہی کے ساتھ پی گئے۔

ان کی عظیم الشان زندگی کے اس سب سے المناک المیہ کی طرف خود انھیں کے مکاتیب سے بعض ہلکے اشارے اپنے مضمون[3] میں کر دیے تھے مگر "یاران مصلحت اندیش" نے ان کو بھی بلا اجازت ہی نہیں عدم اجازت پر بھی سرے سے حذف ہی فرما دیا، جس سے نہ صرف ان کے ایک بڑے کمال "سیرت و سلوک" کی سب سے بڑی شہادت کا اخفا ہوا بلکہ ڈھونڈنے والوں کو "سید السوانح" کے سب سے بڑے تاریخی سانحہ و حادثہ سے تاریکی میں چھوڑ دیا گیا کہ آخر جو ادارہ ان کی عمر بھر کی علمی و تعلیمی کمائی کا سب سے گراں قدر خزانہ تھا اور جس کی خاطر وہ ہمیشہ، ہر طرح کی جاہی و مالی ترغیبوں اور تحریصوں کو ٹھکراتے رہے۔ اس کو محض بھوپال کی تنخواہ اور نوکری کے لئے چھوڑ بھاگے!![4]

---

[1] غلام محمد صاحب نے مولانا گیلانی کے ایک خط (مورخہ ۱۵؍ فروری ۱۹۵۴ء شائع شدہ سلیمان نمبر ص ۲۹۷) کے حوالے سے سید صاحب کی شکوریت کی تائید حاصل کی تھی یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

[2] کاتب مکتوب ابتداء سے ہی دار المصنفین کے رکن رہے ۱۹۷۵ء میں اعظم گڑھ میں وفات پائی۔

[3] سیرت السید کے انمول سبق، شائع شدہ معارف سلیمان نمبر زیر ادارت شاہ معین الدین احمد ندوی

[4] بحوالہ تذکرہ سلیمان ص ۲۸۱

سیّد صاحب پاکستان میں

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر چند سال بہت سختی اور آزمائش کے گزرے تھے۔ ہندوستان کی زمین تنگ ہو چکی تھی اور برادرانِ وطن کا بڑا طبقہ یہ خیال کرتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں رہ گیا ہے۔ اس تعصب نے ان کے قلب و نظر اور ہوش و خرد کو شکار کر رکھا تھا۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا بنانے میں مسلمانوں کے کارنامے اور جد و جہد آزادی میں ان کی قربانیاں داستانِ پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں لیکن مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ حضرات جنھوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی وہ اس دورِ پُر آشوب میں بھی ہندوستانی سیاست کے اُفق پر چمکتے رہے۔ ان حضرات کی مستقل رہائش نے ہندوستان کے باقی ماندہ مسلمانوں میں ہمت و حوصلہ اور یہاں رہنے کے لئے اعتماد پیدا کیا تھا۔ سید صاحب کی نوعیت اس سے قدرے مختلف تھی، موصوف ہندوستان میں رہنے کے خواہش مند تھے لیکن دار المصنفین کے اندرونی نامساعد حالات کے سبب بھوپال سے واپسی کے صرف پندرہ ہی دن بعد انھیں اعظم گڑھ چھوڑ دینا پڑا تھا۔ اور مجبوراً وہ اپنے داماد سید حسین کے یہاں کانپور جا کر رہے۔ اس طرح ان پر دو طرح کی افتاد پڑی تقسیمِ ملک اور وطنِ مالوف اعظم گڑھ سے جدائی۔ سید صاحب کی ایک بیٹی، داماد اور بڑے صاحبزادے ابو سہیل کراچی میں قیام پذیر ہو چکے تھے اور سید صاحب کو بھی پاکستان

بلانے کا مسلسل اصرار کر رہے تھے۔ ان پریشان کن حالات میں موصوف خود بھی کشمکش میں مبتلا ہو گئے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کہاں رہیں۔ البتہ اعزہ سے ملاقات کے لیے پاکستان جانا چاہتے تھے!

"میری کئی اولادیں بسلسلۂ ملازمت پاکستان آ چکی تھیں، ان کا تقاضا تھا اسی طرح میرے احباب کوشاں تھے کہ میں پاکستان آجاؤں لیکن میرا دل ترکِ وطن کے لیے آمادہ نہ تھا مگر جب یہ خبر ملی کہ میری نواسی سخت قسم کے ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے اور میری بڑی لڑکی ولادت کے بعد سخت بیمار ہے تو دل کو بے چینی ہوئی اور چاہا کہ کسی طرح کراچی پہنچوں لیکن نو اوبجکشن سرٹیفکیٹ ملنے میں مایوسی ہوئی کیونکہ بھوپال سے تعلق منقطع ہو چکا تھا اور وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا"![1] (مکتوباتِ سلیمانی ج ۲ ص ۲۳۶)

اتفاق سے ہندوستان کے خیر سگالی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے انھیں پاکستان جانے کا پرمٹ مل گیا اور وہ ۷؍ جون ۱۹۵۰ء کو عارضی طور پر کراچی گئے۔ لیکن پھر انھیں مجبوراً وہیں کی شہریت اختیار کرنی پڑی۔ جب دہلی پہنچے تو وفد روانہ ہو چکا تھا تنہا لاہور پہنچے وہاں بھی اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سرکاری سفر کی وجہ سے اخراجات کی طرف سے اطمینان تھا لیکن پھر سب پیسہ جیب سے خرچ کرنا پڑا۔

"آئندہ سفر کے لیے ایک دوست سے روپیہ قرض لینے پڑے اور ۱۴؍ جون کو کراچی پہنچا۔ یہاں بھی مجھے وفد کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوا اور نہ اس کے کسی رکن سے ملاقات ہوئی اور سچ یہ ہے کہ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ وفد واپس جا چکا ہے یا جا رہا ہے۔ بہرحال میں نے جس غرض کی خاطر سفر کیا تھا اور ذاتی مصارف سے کیا تھا اس کے لحاظ سے میں نے اپنے کو وفد کا پابند نہیں بنایا اور ساتھ ہی دو چار روز بعد رمضان شریف شروع ہو رہے ہیں، قصد کیا کہ یہاں ٹھنڈے موسم میں رمضان بسر کر کے واپس جاؤں، یہی ہندوستانی احباب کو بھی لکھ دیا۔ رمضان بعد انڈین ہائی

> کمشنر کے دفتر سے پرمٹ کی واپسی کی درخواست کی۔ پہلے تو پرمٹ دینے سے انکار کیا گیا پھر جواب ملا کہ دلی تار دے کر پوچھا جائے گا اس میں چند روز لگیں گے اور جواب آنے پر پرمٹ دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ جلدی نہیں ہے جب چاہئے پرمٹ لے جائیے اور ایک فارم بھرنے کا حکم ہوا جس میں عجیب عجیب خانے تھے جس کو بھرنے کا جی نہ چاہا بالآخر فارم بھر کر داخل کیا گیا تو اب انڈین ہائی کمشنر کے دفتر کا اصرار ہوا کہ بذاتِ خود ان کے دفتر میں حاضر ہو کر پاسپورٹ آفیسر کے سامنے دستخط کروں۔ یہ بھی کیا۔ وہاں دفتر کے چپراسی نے جو سلوک کیا اس سے دل پر چوٹ لگی۔ خیر پرمٹ ملا اتفاق سے کچھ طبیعت خراب ہو گئی اس لئے پرمٹ کی توسیع کی درخواست دی جس سے انکار کیا گیا۔ ابھی اسی حالت میں تھا کہ ہندوستان کے بعض دوستوں نے لکھا کہ پاکستان کے اخبارات آپ کے متعلق جو خبریں شائع کر رہے ہیں اُن سے یہاں بڑی بدگمانی پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے لکھا کہ ان اخباروں کا روکنا میرے بس میں نہیں ہے۔ اخبارات نے یہاں آنے پر خیر مقدم کئے، مضامین اور نوٹ لکھے اور اپنے حسنِ ظن کا اظہار کیا تھا یا بعض مجالس میں میری تقریروں کے اقتباسات چھاپے تھے[1]"

بہرحال پرمٹ کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ دوسری طرف پاکستان میں مستقل قیام کے لئے لوگوں کا اصرار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اتفاق سے انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں سید صاحب نے ایک مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمراں" کے عنوان سے پڑھا۔ جس کی صدارت اسٹیٹ منسٹر ڈاکٹر محمود حسین خاں کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ اب حضرت سید صاحب پاکستانی بن چکے ہیں اور ہندوستان واپس نہیں جائیں گے[2] اور اس طرح اضطراری طور پر مستقل قیام پاکستان کی

---

[1] مکتوبات سلیمانی جلد دوم ص ۴۰-۲۳۸

[2] تذکرہ سلیمان ص ۳۲۲

صورت نکل آئی۔ چند ماہ بعد اپنے داماد سید ابو عاصم صاحب کو ہندوستان بھیج کر دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء میں اپنے اہل و عیال کو بھی کراچی بلا لیا۔

وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں نے بھوپال کے زمانۂ قیام میں سید صاحب کے پاس مولانا احتشام الحق کاندھلوی کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا تھا کہ پاکستان کے اسلامی دستور کی تشکیل کے لئے پانچ رُکنی بورڈ کا قیام عمل میں آیا ہے جس کی صدارت کے لئے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت ہماری نظر میں نہیں ہے۔ ساتھ ہی بہت سے وعدے کئے گئے تھے اور بعض یقین دہانیاں بھی کرائی گئی تھیں اور آخر میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ اسے قبول کر لیں اس وقت سید صاحب نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ اس موقع پر جب کراچی پہنچے تو پھر اس کو قبول کرنے کیلئے اصرار کیا گیا لیکن موصوف کی فراستِ ایمانی انھیں کسی بڑے عہدے کے عوض خرید نہ سکی۔ سید صاحب کی یہ شرط تھی کہ جو قانون تشکیل دیا جائے اگر حکومت کا ارادہ اس پر عمل کرنے کا بھی ہو تو قبول کر سکتا ہوں۔ ورنہ نام کے استعمال سے کچھ حاصل نہیں زبانی وعدے بہت ہوتے رہے لیکن جمہوریت کے نبض شناس کو تحریری وعدہ درکار تھا وہ نہیں مل سکا تو انکار کر دیا گیا اور کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا۔

سید صاحب علمی شغل کے خواہاں تھے۔ چنانچہ حکام کی خوشامد، دریوزہ گری اور کاسہ لیسی کے مقابلے میں اپنے مزاج کی مناسبت سے "مکتبۃ الشرق" کے نام سے کتابوں کی دوکان کھول کر اس میں مصروفیت کو ترجیح دی۔ نتیجتاً معاشی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن سپر نہیں ڈالی، ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن پیشانی پر بل نہ آیا۔ حکم عدولی کے سبب حکومت کی نگاہ میں قابل ملامت ٹھہرے مگر پائے استقامت کو جنبش نہ ہوئی اور بعض دوسری آزمائشیں بھی آئیں انھیں بھی ہنسی خوشی جھیلا البتہ اس علمی و کتابی کیڑے کو کچھ شکوہ تھا تو یہی "کراچی نے مجھے جاہل بنا دیا۔ یہاں نہ کوئی اچھی لائبریری ہے، نہ لکھنے پڑھنے کی جگہ، میرے لئے تو کوئی عمدہ کتب خانہ ہو اور اس میں بیٹھ کر کام کر سکوں"۔[1]

---

[1] بحوالہ ریاض سلیمان نمبر ص ۱۴۹

گدڑی کا لعل کب تک کتابوں کی دوکان میں چھپا رہ سکتا تھا پاکستان کے لوگوں نے تارک الدنیا بنانا پسند نہیں کیا۔ جوہر چمکا اور گوہر پہچان لیا گیا اور کچھ ہی عرصہ میں جگہ جگہ اعزازیئے اور استقبالیئے دیئے گئے۔ سید صاحب جمعیۃ العلمائے اسلام کے ایک جلسہ کی صدارت کی خطبۂ صدارت نے سب کو گرویدہ بنالیا اور پھر تو تنظیم جمعیۃ العلمائے اسلام کی ہی صدارت پیش کردی گئی لیکن موصوف نے انکار کردیا۔ اس عہدہ کے لئے دو سال تک مسلسل جھگڑے چلتے رہے۔ تب چند معتبر حضرات نے ایک بار پھر سید صاحب سے کہا کہ اگر آپ اس کو قبول کرلیں تو تنازعہ ختم ہوجائے۔ سب کا تعاون آپ ہی کے ساتھ ہوگا چنانچہ سید صاحب نے بہت دن کے بعد ۱۹۵۲ء کے آخر میں جمعیۃ العلمائے اسلام کی صدارت قبول کرلی جو آخر تک برقرار رہی۔

اس طرح پاکستان کے تمام طبقوں کے مذہبی علماء کی ۳۱ نفری کمیٹی کا صدر سید صاحب کو بنایا گیا اس کمیٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دستورِ پاکستان کو اسلامی رنگ میں پیش کیا جائے۔ اس میں مسلمانوں کے ہر مسلک کے علماء کو نمائندگی دی گئی تھی، اس کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں ان کا اثر یہ ہوا کہ اس بھاری بھرکم کمیٹی کے فیصلے کا بھرم رکھتے ہوئے اس دستور کو کالعدم قرار دے دیا گیا جو محض اس مقصد کے تحت متذکرہ بالا بنیادی دستور ساز کمیٹی نے بنایا تھا۔

کئی برس سے ہندوستان میں اور دو برس قبل پاکستان میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی جس درخواست کو سید صاحب نامنظور کرتے رہے تھے، اب شرائط تسلیم کئے جانے کی وجہ سے اسے قبول کرلیا۔ ۱۹۵۲ء میں صاحبزادہ لیاقت علی خاں نے ایک لاکمیشن قائم کیا[1]۔ جس کے ارکان جسٹس عبدالرشید، جسٹس میمن اور سید صاحب تھے۔ اس کا مقصد دستور کو شرعی رنگ میں پیش کرکے اس پر عمل درآمد کرانا تھا۔ مفتی محمد شفیع صاحب بھی کراچی میں مقیم ہوچکے تھے۔ سید صاحب ان کے جوہر شناس تھے چنانچہ ان کی عظمت کا اعتراف کراتے

---

[1] یہ وہ کمیشن تھا جو مذکورہ ۳۱ نفری کمیٹی کی رپورٹ کا جائزہ لے کر اس کی قانونی شکل دینے میں ممکنہ رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے قائم ہوا تھا۔

کے لئے اور اپنی شرعی ذمہ داری کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بھی سید صاحب نے مفتی صاحب موصوف کی ضرورت کا اظہار کیا اور انھیں بھی اس کمیٹی کا رکن بنوا دیا۔

سید صاحب عرصہ سے اس بات کے آرزومند تھے کہ تمام ممالکِ اسلامیہ کے درمیان ربط و اتحاد کی فضا قائم ہو جائے اور تمام ممالکِ اسلامیہ کی آواز ایک ہو کر نکل سکے اس کے لئے وہاں کے تمام مشاہیر و علما اور مفکرین کا اتحاد ازبس ضروری سمجھتے تھے۔ اس غرض سے انھوں نے "احتفال علماء" کے نام سے اسلامی ملکوں کے علماء کی ایک کانفرنس طلب کی۔ یہ تین روزہ کانفرنس کراچی میں ۱۴ فروری ۱۹۵۲ء کو شروع ہوئی جس کی تین نشستیں ہوئیں اور ان کی صدارت حسب ذیل حضرات نے فرمائی۔

پہلا اجلاس مولانا سید سلیمان ندوی دوسرا اجلاس مفتی اعظم فلسطین (مفتی امین الحسینی) اور تیسرا اجلاس ایران کے مشہور شیعہ عالم کاشف الغطاء۔

اس میں تقریباً سبھی ممالک کے علما شریک تھے اور ان کے لئے غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ مشرق میں بیداری کے بعد ایشیا کے کسی ملک میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے لیکن

> "میرے نزدیک تو علمائے اسلام کا یہ اجتماع بجائے خود ایک تاریخ تھا.... اگرچہ اس بنا پر کہ یہ پہلا اجتماع تھا نقائص تھے تاہم افادہ سے خالی نہ رہا خصوصاً ایران و نجف کے علماء کی آمد سے مظاہر مختلفہ کے درمیان ایک خوشگوار حد تک رواداری فرق کی راہ میں منزل طے ہوئی۔[1]

عالمِ اسلامی کی اس ایشیائی کانفرنس کا انعقاد سید صاحب کا ایک نادر کارنامہ تھا اسی سال موصوف کو ۱۹۵۲ء ازملا کہ مصر کی سب سے بڑی علمی و ادبی عربی اکیڈمی "مجمع العلمی الادبی" کا ممبر منتخب کیا گیا اور اسی سنہ میں وہ کراچی یونیورسٹی کی سینیٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ یہ کوئی نیا اعزاز نہیں تھا بلکہ عرصہ تک وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے ممبر بھی رہے تھے۔ اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کی صدارت پیش کی گئی لیکن

---

[1] مکاتیب سلیمان مرتبہ مسعود عالم ندوی ص ۱۳۷

بعض دیگر وجوہ کے علاوہ خرابیٔ صحت کی بنا پر بھی قبول نہیں کی۔

ہندوستان میں جس طرح آل انڈیا ہسٹری کانگریس اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس مضمون کی واحد اہم ترین تنظیم تھی یا آج آئی سی ایچ آر کی جو اہمیت ہے، پاکستان میں بھی آل پاکستان ہسٹری کانگریس قائم کی گئی تھی۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کا پہلا اجلاس لاہور میں ہوا اس میں سید صاحب نے شعبۂ تاریخِ اسلام کی صدارت کی۔ صدارتی خطبہ کے علاوہ "دیبل" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پیش کیا۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں اس کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا اس کے جنرل سیشن کی صدارت سید صاحب نے کی۔ سید صاحب کی اردو دوستی ہندوستان ہی میں ان کا جزوِ زندگی تھی، اردو کے کہیں کانٹا چبھتا اُن کے خنجر بن کے لگتا۔ اسے کوئی ٹیکھی نگاہ سے دیکھتا سید صاحب اس کی آنکھ نکالنے کو تیار ہو جاتے، زبان پر اس کے خلاف حرف لاتا موصوف مضبوط دلائل کا انبار لگا کر اس کی زبان کو گنگ کر دیتے، ذریعۂ تعلیم اردو بنانے کے لئے وہ کونسا حربہ تھا جس کا استعمال سید صاحب نے نہ کر لیا ہو، اس کی ہندوستان گیر جاذبیت و مقبولیت کا احساس رکھتے ہوئے ہمیشہ ان کی یہ دلی خواہش رہی کہ اس کو آسان بنا کر مزید عام فہم کیا جائے اور اس کا محدود اجنبی نام ختم کر کے "ہندوستانی" نام رکھا جائے تاکہ ہندوستان کے چپہ چپہ سے اس کے لئے صدائے استقبال بلند ہو، مذہبی فرقوں کے درمیان یہ منافرت کے بجائے یگانگت و موانست کا ذریعہ بن سکے اور ہندوستان کے ہر صوبہ، ہر علاقہ، ہر مذہب اور ہر فرقہ کا ہر شخص یہ کہنے پر فخر کرے کہ یہ ہندوستانی ہماری مادری زبان ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو گذشتہ اوراق میں ۱۹۳۲ء میں ان کے خطبۂ علی گڑھ کے موقع پر کی جا چکی ہے۔)

وہ عظیم ہندوستان جیسے متعدد مشرب و مسلک و زبان والے ملک میں تو بہانگِ دُہل یہ مطالبہ کرتے رہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ پاکستان کے شہری بن جانے کے بعد پاکستان جیسی نئی اور محدود لیکن اردو پروری کے لئے زرخیز زمین پر اس سلسلے میں اپنی

آواز بلند نہ کرتے اور اتحاد لسانی کا مطالبہ نہ کرتے وہاں تو اس کا مطالبہ کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا۔ چنانچہ ڈھاکہ کی ہسٹری کانگریس کے خطبۂ صدارت میں موصوف نے دوسرے اہم تاریخی و علمی نکات کی مدد سے پاکستان کے اتحاد و استحکام کے امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہا تھا کہ بنگلہ زبان کا رسمِ خط کچھ عرصہ سے سنسکرت کے زیر اثر آنے کی وجہ سے ناگری ہو گیا ہے، وقت کا تقاضا ہے کہ اس رسمِ خط کو اس کی قدیم شکل اردو (عربی) میں تبدیل کر لیا جائے۔ خطبہ کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے۔

> "بنگالی زبان پہلے تحریری زبان نہ تھی۔ مسلمان سلاطین نے بعض کتابیں لکھوائیں اور اسے تحریری بنا دیا مسلمان اس زبان کو عربی رسم الخط میں لکھتے تھے اور اس قسم کی پرانی قلمی کتابیں اب بھی موجود ہیں۔ اگر یہ عمل انگریزوں کے عہدِ انقلاب میں بھی جاری رہتا تو آج بھی اس صوبہ میں اس طرح بنگالی اردو بولتے جس طرح ہم گجراتی اُردو، دکنی اردو اور بہاری اردو بولتے اور سنتے ہیں۔ مگر انگریزی عہد میں ہندو بنگالیوں نے انگریزی تعلیم میں سبقت کی اور بنگالی زبان کو جدید اصطلاحات و محاورات سے سنوارا اور اس کا رسم الخط ہندی کے قریب بنایا اور نئے الفاظ خالص سنسکرت ماخذ سے لکھنے لگے اور عربی اور فارسی لفظوں کو زبان سے خارج کیا تو وہ ایک نئی زبان بن گئی اور خالص ہندو ذہنیت سے معمور ہو گئی جس میں سنسکرت الفاظ ہندو دیوتاؤں اور دیومالاؤں اور خیالات سے لبریز عناصر کار فرما ہیں اور اس طرح یہ اسلامیت سے بھی خالی ہو گئی۔ جب مسلمانوں نے تعلیم حاصل کی تو یہی سنسکرتی بنگالی زبان انھوں نے سیکھی اور پڑھی اور وہی فصاحت و انشار پردازی کا معیار بن گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالی کے مسلمان باقی ہندوستان سے کٹ گئے اور ان تحریکات و اصلاحات سے بیگانہ اور ناواقف رہ گئے جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل رہے تھے اور افسوس ہے کہ یہ صورتِ حال اب تک قائم ہے اور

> آج پاکستان کی تعمیر میں یہ اجنبیت اور بیگانگی حائل ہو رہی ہے۔
> میرے خیال میں بنگالی مسلمانوں کو سارے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر یک ملت بننے کے لئے ضروری ہے کہ سارے پاکستان کا ایک ہی خط ہو اور وہ عربی رسم الخط نسخ ہے جس میں پشتو، سندھی اور پنجابی لکھی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ان صوبائی زبانوں کے نہ جاننے والے عربی رسم الخط اور مشترک عربی و فارسی الفاظ کی بنا پر عبارت کا حاصل مطلب بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر بنگال کے مسلمان بنگالی رسم الخط بدلیں تو وہ سارا پاکستان ایک بنا سکتے ہیں اور اس طرح قرآن کے لئے عربی رسم الخط اور زبان کے لئے بنگالی رسم الخط سیکھنے میں بچے دوہری محنت سے بچ جائیں گے"۔ [1]

یہ تجویز اردو کی وسعت و جامعیت کے اعتبار سے نہایت اہم تھی اور بنگالیوں کے لئے نئی بھی۔ البتہ عربی اور مسلمانوں سے وابستہ اور مربوط کرنے کی وجہ سے شرکائے کانگریس کے ہندو طبقہ کو یہ بات ناگوار گذری ہو گی کیونکہ منقولہ اول اقتباس میں ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سید صاحب ہسٹری کانگریس کی صدارت نہیں بلکہ کسی مذہبی جلسہ میں تقریر کر رہے ہوں اور مسلمانوں کو ان کی دینی حمیت کا احساس و غیرت دلا رہے ہوں۔ سیاسی اور مصلحتی سطح پر تو اس میں کلام کی گنجائش ہے لیکن پاکستان نیشن اور اردو سے محبت کرنے والے جانباز سپاہی کی اس دلیری کا بہر حال اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ان خیالات میں تقسیم پاکستان ۱۹۷۱ء کے امکانات کی واضح نشاندہی موجود ہے۔ جانبازی کا انجام کسے معلوم نہیں۔ سید صاحب دریا میں لہروں کی آزمائش مقابلہ کرنے کے لئے اُترے تھے۔ اُن کا شکوہ کرنے کے لئے نہیں ورنہ اس سے بہتر تھا کہ وہ اترتے ہی نہیں۔ چنانچہ اس تقریر کا منفی ردِ عمل ہونا فطری تھا۔ جن اہم

---

[1] ریاض کراچی، اپریل ۱۹۵۳ء خطبۂ صدارت سید سلیمان ندوی

ذہنیتوں کو اس تجویز سے ٹھیس پہنچی تھی اور جنھیں اپنے ہوائی گھر ندوے ٹوٹ جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ان کے ورغلانے اور تقریر کا غلط اور حسب مراد بنگالی ترجمہ و مفہوم پیش کرنے کی وجہ سے اس جلسہ میں بدمزگی پیدا ہو گئی، شرپسند طلباء سید صاحب کے ساتھ تہذیب شکن مظاہرہ پر آمادہ ہو گئے، جلسہ کی کارروائی جو قریب الختم تھی مجبوراً جلد ختم کرنی پڑی اور جس گاڑی میں سید صاحب تنہا اپنی قیام گاہ کو جا رہے تھے اسے طلباء نے گھیر لیا، سخت سست کہا اور اپنی تجویز واپس پر مجبور کیا، سنجیدہ لوگوں کی کوششوں سے کسی نہ کسی طرح وہ قیام گاہ تک پہنچے۔

زمہ دارانِ کانگریس، یونیورسٹی کے وائس چانسلر، دیگر ارباب حل و عقد اور شہر کے معزز حضرات سبھی فوراً جائے قیام پر پہنچنے شروع ہو گئے اور اس ہنگامے پر اظہار افسوس کیا اس کی سخت سے سخت مذمت کرتے ہوئے سبھی لوگوں نے معافی مانگی۔ اس پر شرفاء کی روایت کے مطابق سید صاحب منفعل ہو گئے، نہ صرف خندہ پیشانی سے معاف کر دیا بلکہ اسے نادانوں کی نادانی پر محمول کیا۔

> "ان کے ظرف و تحمّل کا یہ حال تھا کہ ڈھاکہ کے ناخوشگوار واقعہ کے بعد جب میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے طلباء کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میرے معلوم کرنے پر صرف ان کی ناسمجھی پر افسوس کیا اور فرمایا "وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" علامہ کو قلب کی بیماری پہلے ہی سے تھی اس واقعہ نے اس کو اور بڑھا دیا۔ علاج کے بعد طبیعت سنبھل گئی تو کراچی آ گئے"..... ان نادان لڑکوں کو اس پر بڑا تعجب تھا کہ ایک مولوی ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں اس واقعہ سے بہت متاثر تھا اس تاثر میں ڈھاکہ کے مشہور اخبار "مارننگ نیوز" (انگریزی اخبار) میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "سید سلیمان ندوی کون ہیں" اس کو پڑھ کر طلبہ کو بڑی ندامت اور پشیمانی ہوئی کہ ایسے عظیم المرتبت اہل علم اور انسانیت و شرافت کے پیکر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ کس قدر نازیبا تھا۔ مشرقی پاکستان کے مشاہیر، علماء اور

عمائدین نے اس کی مذمت کی اور ڈھاکہ کے ارمنی میدان میں ایک بڑا جلسہ اس کے لئے منعقد کیا گیا جس میں ایک مشہور بنگالی عالم مولانا عبدالعلی فریدپوری نے بھی بڑے تاسف کا اظہار کیا۔"[1]

اس سانحہ کے ردِّ عمل سے سارا مشرقی پاکستان گونج اٹھا، ہر طرف مذمت کے جلسے اور سید صاحب کی تجویز کی تائید میں قرار دادیں پاس ہو ہو کر حکومت میں جانے لگیں اور اس طرح اس تجویز و تحریک کو بڑی تقویت و شہرت حاصل ہوئی۔ رشید صاحب نے بھی اپنے مضمون کے آخر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت بلیغ جملے لکھے ہیں:

"سید صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی، ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کے دوران ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی۔ بڑا قلق ہوا۔ سید صاحب کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی، کہاں جاکر، کس بنا پر رسوا ہوا اور طلبہ کے لئے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم میں اور کیا ہوگی۔ اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور گراں مایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہ آئی تھی۔[2]
اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہوگی۔"

ڈھاکہ سے واپسی میں سید صاحب اپنے داماد سید حسین ڈپٹی کلکٹر سے ملاقات کرنے

---

[1] معارف ستمبر، ۱۹۵۷ء "کچھ علامہ سید سلیمان ندوی کے متعلق" از سعید الحق

[2] معارف سلیمان نمبر ص ۱۲۲، مضمون پروفیسر رشید احمد صدیقی

کے لئے فتح پور آئے، چند روز وہاں قیام کیا اس کے بعد اپنی مادرِ علمی اور تربیت گاہ ندوہ بھی گئے۔ اہلِ ندوہ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سید صاحب اور ندوہ ایک روح دو قالب متصور کئے جاتے تھے۔ اگر دارالمصنفین کی پرورش انھوں نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی تو ندوہ کی یاد سے حرارت حاصل کئے بغیر موصوف کا خون دل کے نہاں خانوں سے گزرتے ہوئے کراہیت محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طویل عرصہ کے بعد جب اس موقع پر وہ خیر مقدمی جلسہ میں شرکت کے لئے ہال میں داخل ہو رہے تھے تو در میں قدم رکھتے وقت اُن پر کیف و اثر کی گھٹا چھائی ہوئی تھی جسے موصوف کے برجستہ شعر نے گریہ کے چھینٹے برسا کر صاف کر دیا۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

برسوں کی رفاقت اور سوز و اثر کی افزائش اس وقت مزید عروج پر پہنچ گئی جب اپنے بچھڑے ہوئے یوسف سے مل کر قاری صاحب نے جلسہ کا آغاز قرآنِ پاک کی ان آیتوں سے کیا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْھُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۔

یعنی جب قافلہ (حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کو لے کر شام سے مصر کی جانب چلا تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ کہو تو مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

اس یوسفِ ندوہ سے ملاقات، اس کی خوشبو اور ان آیات کی تلاوت نے پورے مجمع کو خاموش ماتم کدہ بنا دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے عربی میں سپاس نامہ پیش کیا۔ سید صاحب نے جواب میں بڑی شگفتہ و شائستہ، موثر اور دلدوز تقریر کی اور ندوہ یعنی مادرِ معنوی کے فرزندوں کو علامہ اقبال کی زبانی یہ ابدی پیغام سنا کر تقریر ختم کی۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اپریل کے آخر میں پاکستان واپسی پر سید صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کمیشن اور

مجوزہ قائد اعظم یونیورسٹی کے مشاورتی بورڈ کا رکن نامزد کیا گیا۔ اسی سال انھیں موتمر عالم اسلامی کا رکن بھی بنا لیا گیا۔

ابتداء میں جماعت اہل حدیث کے موئید یعنی غیر مقلد تھے۔ تھانہ بھون سے وابستگی کے بعد اعتدال آ گیا تھا اور جمہور کے مقلد ہو گئے تھے۔ کئی سال پہلے الہ آباد میں مولانا الیاس صاحبؒ بانی تبلیغی جماعت سے ملاقات ہوئی تھی اور سید صاحب نے اس جماعت کے کاموں کو سمجھا تھا اور اس میں تقریریں بھی کی تھیں۔ اس وقت سے وہ اس جماعت کے فوائد اور کارناموں سے بہت متاثر تھے، درمیان میں اس میں شرکت کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن پاکستان میں یہ سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ کراچی کی مرکزی جماعت کی تو ایک طرح سے سرپرستی ہی کرتے تھے۔ گاہ بگاہ جلسوں میں شرکت کر کے تقریر بھی کیا کرتے اور کارکنوں کی مساعی کو سراہ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ گھر پر عصر کے بعد احسانی مجلسیں اور فجر کے بعد انھیں کے نام سے منسوب جامعہ سلیمانیہ میں درس قرآن پاک، شرح بیضاوی کے ساتھ بڑی پابندی اور اہتمام سے ہوتا تھا۔

سید صاحب کی زندگی جہاں قدیم و جدید کا سنگم اور توازن و اعتدال سے عبارت تھی وہیں ان کی زندگی میں صبر و شکر کا بھی حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ شخصیت اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی ہے جب تک وہ مسرتوں، کامرانیوں اور خوشیوں کے ساتھ ساتھ تکلیفوں، پریشانیوں اور غموں کی بھٹی میں تپ کر نہ نکلے، موخر الذکر کی کسوٹی پرکھے جانے کے بعد ہی سونے کے اصلی اور خالص ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہی اس میں تابناکی بھی آتی ہے۔ جو حضرات زندگی کے ایک ہی رخ سے واقف ہوتے ہیں عموماً ان کی شخصیت کی تکمیل مشتبہ ہوتی ہے۔ سید صاحب کوہ تحمل تھے کسی بھی پریشانی کو زبان پر لانا کسر شان سمجھتے تھے۔ نہ جانے کتنے صدمے اور دکھ جھیلے ہوں گے مگر اپنے خاص لوگ اس سے لاعلم رہتے تھے۔ اس کے باوجود اضطراری طور پر بعض باتیں عیاں ہو گئیں اور وہ ضبط نہ کر سکے۔ ان سطور میں ان کی جھلک دیکھنے سے پوری زندگی کی صابریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس سے ان کی شخصیت زیادہ پرکشش

اور زیادہ جاذب توجہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں ہر طرح کے ناز و نعم، خوشیوں اور آسائشوں اور اعزازوں کے پہلو بہ پہلو سید صاحب جن صبر آزما مراحل سے گزرے اس کے نتیجہ میں وہ صبر و شکر کا جامع بن گئے تھے، ان حالات کا تذکرہ مناسب موقع پر آچکا ہے۔ پاکستان جاکر جہاں انھیں شاندار عہدے اور اعزازات ملے وہیں ہجرت کے بعض شدائد و مصائب اور امتحانات کو بھی موصوف نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ سید صاحب ہندوستان سے عارضی طور پر گئے تھے اور وہاں مستقل قیام کی صورت نکل آئی، بہت کوشش کی اور نہ آسکے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کے وطن دیسنہ میں ان کے نام ایک سو بیگہ زمین اور ایک اچھے قسم کا نیا مکان تھا جسے بمجبوری چھوڑ دینے کی وجہ سے مستقل قیام کے بعد معاشی فکر دامن گیر ہوئی۔ عہدوں اور لالچ و حرص و ہوس سے بے نیاز ہو کر مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی دوکان کھولی اور اس پر گزارہ کرتے رہے۔

علمی شخص کی شکایت بھی علمی ہی ہوتی ہے۔ اس میدان میں بھی ان کی آزمائش ہوئی۔ اگرچہ وہ بوڑھے تھے لیکن ان کا ذوقِ مطالعہ اسی طرح جوان تھا مگر وہاں نہ کوئی لائبریری اور کتب خانہ تھا نہ باذوق احباب کی مجلسیں۔ پھر رہنے کے لئے تین کمروں کا جو مکان تھا اس میں دو کمروں میں مستورات تھیں۔ بقیہ ایک کمرہ سید صاحب کے سونے کے لئے بھی تھا، مہمان نوازی کے لئے بھی، کھانے کا بھی وہی کمرہ تھا اور مطالعہ کا بھی۔ اس میں مطالعہ کرنا کس طرح ممکن تھا۔ ہر لکھنے والے کو یکسوئی درکار ہوتی ہے اور سید صاحب جیسے ہمہ جہت کتابی شخص کو بڑھاپے میں یہ یکسوئی مفقود ہو کر اس تنگ دامانی کا شکار ہونا سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی اور اپنے محبوب مشغلہ، مطالعہ سے بے نیاز رہ کر ان کے لئے زندگی گزارنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایسی حالت میں مکمل تصنیف تو درکنار ایک مضمون لکھنا بھی محال تھا۔ اس لئے اس دور میں صرف وفیات، دو شذرات اور چند خطباتِ صدارت (کہ جن کا وجود میں آجانا واقعی غیر معمولی بات تھی ان) کے علاوہ اور کوئی تحریر نظر نہیں آتی۔ جمع القرآن کے نام سے ایک مضمون اور مفتی کفایت اللہؒ کی وفات پر مضمون چند نامکمل تحریریں ہیں جو وفات کے بعد رسالہ "مستقبل" کراچی میں شائع ہوئیں۔ بعض کتابوں

پر نظرِ ثانی کر کے انھیں دوبارہ شائع کیا۔ یہی اسباب یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ پاکستان کے دورانِ قیام سید صاحب کا کوئی مستقل کتاب نہ لکھ سکنا فطرت کے عین مطابق تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظِ نظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اگر وہ پاکستان نہ جاتے تو یہاں بھی اپنی صحت اور دارالمصنفین کے تلخ تر حالات کے سبب کوئی کتاب نہیں لکھ سکتے تھے۔

ڈھاکہ ہسٹری کانگریس کا حادثہ سید صاحب کی زندگی کا اس قسم کا پہلا اور آخری حادثہ تھا۔ وہ تنفس کے پرانے مریض تھے۔ اس حادثہ نے قلب پر اثر ڈالا اور اس مرض کا شدید دورہ پڑا۔

دارالمصنفین کی فکر وہاں بھی دامن گیر رہی اور وہ شاہ معین الدین احمد صاحب کو برابر مشورے دیتے اور اطمینان دلاتے رہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی پوری توانائی دارالمصنفین پر صرف ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ قیامِ بھوپال کو اس کا نتیجہ اور قیامِ پاکستان کو اس کا "تتمہ" کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اعصاب اور اعضاء میں کمزوری بڑھتی جاتی تھی۔ تنفس کے متعدد دورے پڑ چکے تھے۔ دارالمصنفین میں استسقائے قلبی کا دورہ پڑا اور اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں لا کمیشن کے سفر کے دوران مری میں (جو سردی و گرمی کے لحاظ سے غیر معتدل جگہ ہے) تنفس کا دورہ ہوا۔ ڈھاکہ میں بھی یہی زبردست دورہ ہوا، اپریل ۱۹۵۳ء کے آخر میں ہندوستان سے پاکستان واپسی پر لقوہ کا خفیف سا حملہ ہوا جو جلد ہی دور ہو گیا۔ دل بڑھ اور پھیل چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے پڑھنے لکھنے یا کسی بھی دماغی و جسمانی محنت کے کام کرنے کو سختی سے منع کر دیا اور مکمل سکون کا مشورہ دیا تھا۔ یہ ہدایت سید صاحب کے مزاج کے خلاف تھی، اس لئے اس پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا۔ باقی سب چیزیں ان کی اختیاری نہیں۔

ان حالات کے سلسلے میں تنفس اور قلبی پھیلاؤ کے راولپنڈی کے فوجی ہسپتال میں تقریباً ایک ماہ زیرِ علاج رہے۔ ٹھیک ہو گئے لیکن اتار چڑھاؤ باقی رہا۔

اگست ۱۹۵۳ء میں پھر غیر معمولی حملہ ہوا۔ استسقائے قلبی نے مرض سے تعاون کیا، دورے بار بار پڑنے شروع ہو گئے اور نیند کافور ہو گئی۔ ڈاکٹر کرنل رحمٰن اور ڈاکٹر عبدالصمد جونپوری کے مشترکہ علاج سے طبیعت سنبھل گئی۔ ملنے جلنے کی سخت سے سخت

ممانعت کر دی گئی لیکن موصوف سب سے ملتے رہے اگر کسی کو منع کر دیا جاتا اور انھیں اس کا علم ہو جاتا تو بہت ناگواری کا اظہار کرتے اور کہتے کہ "ایک شخص محبت میں ہمارے پاس آیا ہے یہ تو اسے بھی معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے ملنے جلنے سے منع کر دیا ہے لیکن اس کا دل نہیں مانا ہو گا تبھی تو وہ چلا آیا اور ہم اس کو ملنے سے منع کر دیں، یہ کیا انسانیت ہوئی"۔

ملاقاتی حضرات بھی کبھی کبھی ضد پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مریض کی حالت کی پروا نہیں کرتے۔ سید صاحب کے پاس مسائل لے کر عام لوگ، یونیورسٹیوں اور سفارت خانوں کے لوگ اس زمانے میں بھی آتے رہے۔ بعض لوگ کسی مسئلہ کی خاطر سید صاحب کے جواب میں بات میں بات نکال کر اسے طویل تر کر دیتے تھے۔ یہ سید صاحب کو ناگوار نہیں ہوتا تھا لیکن ان کی صحت کے لئے بہت مضر تھا۔ کبھی سید صاحب خود بھی سلسلۂ کلام کو بے تکان ایک ایک گھنٹہ طول دیتے اور جب تک اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر سیر حاصل بحث نہیں کر لیتے خاموش نہیں ہوتے تھے، یہ حالات نومبر ۱۹۵۳ کے شروع سے ۱۸ر نومبر تک رہے۔

سید صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی اب وہ مستقل بیمار رہنے لگے تھے اور فکر آخرت میں تنہا اور خاموش لیٹے رہتے۔ چند روز قبل جب مرض کی نزاکت اور حیثیت کا خود بھی احساس ہو گیا تو ایک دن باری باری اپنے مرحوم اعزہ کی عمر پوچھی پھر فرمایا کہ خاندان میں سب سے زیادہ عمر میں نے پائی۔ بات ٹالنے کے لئے انھیں بتایا گیا کہ نہیں، آپ کے والد کی عمر بیاسی برس تھی لیکن وہ تو اب ستاروں کے آگے کے جہانوں کی خبر لا رہے تھے دوائیں بھی اپنے عجز کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ جمعہ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی۔[1] ۲۲ر نومبر کی شب میں تنفس کا شدید دورہ پڑا جو صبح تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اپنے بعد اپنے گھر کے نظام کے متعلق جو غور و فکر جاری تھا اس کا اظہار بھی

---

[1] ریاض سلیمان نمبر "سید صاحب علالت سے وفات تک"، از سید ابو عاصم۔

ہونے لگا۔ اپنے داماد ابو عاصم صاحب کو تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ "کیا آپ نے اپنے والد اور والدہ کی خدمت کی تھی؟ انھوں نے جواب دیا کہ بچپن اور تعلیم کی وجہ سے نہیں کر سکا تھا تو فرمایا خیر، ان کی جگہ آپ نے میری خدمت کر لی۔

اس کے بعد اسی دن شام کو اہلیہ محترمہ کو بلایا۔ (اہلیہ کو دونوں دامادوں سید حسین فتح پور (ہندوستان) ور ابو عاصم کراچی میں سے کسی ایک کے پاس رہنا طے کرنا تھا۔ اس وقت تین سال سے کراچی میں سید ابو عاصم صاحب کے یہاں مقیم تھے) اہلیہ سے پوچھا کہ کیا آپ عاصم میاں کے ساتھ مطمئن ہیں" مقصد یہ تھا کہ میرے بعد کہاں رہنا پسند کریں گی انھوں نے جواب کو ٹالنے کی پوری کوشش کی لیکن سید صاحب نے مصر ہو کر جواب طلب کیا پھر جواب ملا "بے شک" اس پر سید صاحب نے خود بھی اطمینان کا اظہار کیا۔ گھریلو حالات کی طرف سے اس اطمینان سے متعلق ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے غلام محمد صاحب نے لکھا ہے کہ

> " اطمینان و سکون کے ساتھ اہل و عیال سے یہ آخری گفتگو خود ایک اعلیٰ کرامت ہے جو اتباعِ سنت کے صدقہ میں کسی کو مل جاتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی ایک حسی کرامت کا ظہور ہو گیا جس میں رخصت ہونے والے کو دکھایا گیا کہ اس کے غیاب میں قدرت کا دستِ کرم اس کے پسماندگان کا دستگیر رہیگا۔
>
> ہوا یہ کہ اس آخری دن نمازِ ظہر کے بعد حضرت پیرانی صاحبہ (اہلیہ سید صاحب) حسب معمول حضرت کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک کہ ایک سفید پوش ہستی دفعتہً نمودار ہو گئ اور اس نے دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کے خدمت میں پیش کیا۔ محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے اور پیچھے مڑ کر حضرتِ والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا " آپ نے کچھ دیکھا۔ جواب "ملا کیا ہوا"، پیرانی صاحبہ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا تو خلافِ عادت اس کی تصدیق فرمائی اور پورے اطمینان سے ارشاد فرمایا۔
>
> "یہ آپکی تسکین کا سامان کیا گیا ہے"۔"

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ بندہ اپنے رب سے کوچ کا اشارہ پا چکا تھا۔ اب اندازہ لگائیے کہ کس راحت و سکون سے، کس یکسوئی اور اشتیاق سے بندہ کی روح اپنے رب کی طرف پرواز کر گئی ہو گی"۔ [1]

دورے پڑنے کے بعد کے یہ تمام واقعات ۲۲ نومبر ہی کے ہیں۔ اس دن شام کو عصر کے قریب اور دنوں کے مقابلے میں نسبتاً طبیعت بہتر اور ہشاش بشاش دیکھ کر اہلیہ صاحبہ نے کچھ دیر کے لئے اپنے ایک عزیز کے یہاں جانے کی اجازت چاہی۔ بہت دنوں سے جانا چاہتی تھیں لیکن سید صاحب کو سکون نہیں تھا اس لئے آج بہتری دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ جب انھوں نے اجازت چاہی تو سید صاحب نے فرمایا۔

"ضرور جائیے، مگر جلد واپس آئیے، ایک گھنٹے کا وقت ہے"۔

اس جواب کے آخری حصہ پر اس وقت کسی نے توجہ نہیں کی اور اہلیہ صاحبہ اپنی صاحبزادیوں کے ساتھ گھر سے چلی گئیں۔ اب گھر میں صرف صاحبزادہ سید سلمان اور داماد سید ابو عاصم ہی تھے، مغرب کا وقت آ گیا تو سلمان صاحب نے ضروری اہتمام کیا اور سید صاحب نے دو زانو بیٹھ کر سامنے دو تکیے رکھ کر بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی اور اس کے بعد متبسم ہو کر فرمایا "آج میں نے شوکت علی مرحوم کی سی نماز پڑھی ہے"۔ سلمان صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا تو انھوں نے وضاحت چاہی، فرمایا آخر میں وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے"۔

اس کے بعد سعادت مند صاحبزادے نے عرض کی کہ ابا سو جائیے، آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا "بہت اچھا"۔ یہ سید صاحب کے آخری کلمات تھے عین اسی وقت غلام محمد صاحب بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ اس کے بعد کی کیفیت کو وقت پر موجود قیام پاکستان کے مسلسل تین سالہ خدمت گزار غلام محمد صاحب کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

" اس کے بعد داہنی کروٹ قبلہ رخ، داہنے ہاتھ کو گال کے نیچے دبائے اور

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۲۶۸

پاؤں سکیڑے حضرت عین مطابقِ سنت لیٹ گئے اور آنکھیں بند فرمالیں
ایسے میں راقم عاجز بھی پہنچ گیا۔ دیکھا کہ مشتاق صاحب اور عاصم صاحب کمرے کے باہر چبوترے پر باتیں کر رہے تھے، میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا خیریت پوچھی تو عاصم صاحب نے فرمایا کہ رات کو تکلیف بڑھ گئی تھی دن اچھا گزرا ابھی لیٹے ہیں۔ جی بہت چاہا کہ کمرے میں جاکر دیکھ لوں لیکن اس خیال سے کہ کہیں آہٹ پاکر آنکھ نہ کھل جائے میں باہر ہی ٹھہرا رہا۔

ہم تینوں بالکل مطمئن اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ سلمان میاں کچھ پریشان سے باہر آئے اور مجھ سے فرمایا ذرا جلد آکر دیکھئے میں مضطربانہ کمرے میں داخل ہوا اور عاصم و مشتاق صاحب بھی لپک آئے، میں نے نبض دیکھی چہرہ مبارک کو دیکھا خطرہ کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ نہ تنفس ہی کچھ تیز تھا نہ اضطراب کی کوئی کیفیت البتہ نبض ضرور کمزور تھی مگر یہ ضعف تو مدتوں سے قائم تھا مگر سلمان نے بتایا کہ چند ہی لمحے گزرے کہ ان پر شدتِ ضبط کے آثار پیدا ہو گئے اور مٹھیاں بھنچ گئیں تھیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کو فوراً بلالیا جائے۔

اب میں حضرتِ والا کے مواجہہ میں اس طرح بیٹھ گیا کہ ان کا دستِ مبارک میرے ہاتھ میں تھا، میری انگلیاں ان کی نبض پر اور نظریں چہرۂ پُر جمال پر جمی ہوئی تھیں مگر ہوش وحواس اڑے جارہے تھے، پاس ہی سلمان میاں تصویرِ وحشت بنے کھڑے تھے۔

عاصم صاحب نے فوراً ڈاکٹر عبدالصمد کو ٹیلیفون کیا مگر انھوں نے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا تو پھر کسی اور ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑ نکلے، ان کے جاتے ہی سلمان میاں کرنل رحمٰن وغیرہ سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر بے سود ہوئی۔

میں اپنی جگہ ایک حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہلکا سا جھٹکا تنفس

میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہچکی آگئی ہو، چہرہ پر خون کی لہر دوڑ گئی اور بس طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا تھا۔ اتنا کٹھن مرحلہ اس آسانی اور سکینت و سرعت کے ساتھ طے ہو گیا کہ گویا گرہ کھل گئی۔ اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے، سلمان میاں نے آبدیدہ ہو کر پوچھنا شروع کیا۔ ”کیوں غلام محمد صاحب کیا بات ہے؟ کہیئے کیا بات ہے؟ میں کیا عرض کرتا جو ہونا تھا ہو چکا۔ سلمان میاں بے تابانہ ڈاکٹر کرنل رحمٰن کو بلانے کے لئے گھر سے نکل گئے عاصم صاحب بھی اب تک واپس نہ آسکے تھے۔ اس خادم حقیر نے اپنے مخدوم قدس سرہٗ کو چت لٹا کر ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے۔ نورانی پیشانی پر بوسہ دے کر پاؤں سے سر تک چادر اڑھا دی اور پیرانی صاحبہ اور عاصم صاحب کی واپسی کا منتظر ہی تھا کہ عاصم صاحب تشریف لے آئے۔ مجھ کو مغموم دیکھ کر وجہ پوچھی، بے زبانی نے ماجرا سنا دیا۔ ان کی حالت دفعتاً متغیر ہو گئی دل بیٹھنے لگا، ایسے میں پیرانی صاحبہ مع صاحبزادیوں کے لوٹ آئیں، ایک کہرام مچ گیا۔ اتنے میں سلمان میاں بھی ڈاکٹر رحمٰن کو لے کر آپہنچے۔ مگر اب ڈاکٹر کا کام ہی کیا تھا ایک نظر دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا۔ سلمان میاں کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی۔ بے تحاشا رونے لگے۔

ہم لوگوں کو اس کا ہوش نہ تھا کہ اس سانحہ کی اطلاع عام کا فکر کرتے مگر کسی ذریعہ سے نشرگاہ والوں کو یہ خبر مل گئی اور آٹھ بجے شب کی خبروں میں نشر کر دی گئی۔ پھر کیا تھا مختلف اخباروں کے دفاتر سے ٹیلیفون آنا شروع ہوئے کہ کب انتقال ہوا، انتقال کے وقت مولانا کے پاس کون تھا، کیا تفصیل رہی، مولانا کا سن پیدائش کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ کبھی میں نے اور کبھی عاصم صاحب نے جوابات دیئے۔ رات ۹ بجے تک زبردست مجمع جمع ہو گیا۔ بچیاں، سلمان والدہ پلنگ کے چاروں طرف کلام پاک لے کر

بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کردی"۔[1]

صبح کو آٹھ بجے غسل دیا گیا۔ نیوٹاؤن کی جامع مسجد جامعہ سلیمانیہ جہاں سید صاحب آخری دور میں نمازِ جمعہ پڑھاتے اور قرآن پاک کا درس دیتے تھے وہاں جنازہ رکھ دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعد میں دیر تک زیارت ہوتی رہی، زیارت کرنے والوں میں عوام سے لے کر پاکستانی کابینہ کے وزراء، اور بیرونی ممالک کے سفراء اور بعض امراء سب ہی شریک تھے۔ زیارت کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی کے قبرستان کی طرف جنازہ چل دیا۔ راستہ کا منظر بڑا ہی دل گداز تھا لمبے لمبے بانس جنازے کی مسہری میں باندھ دیئے گئے تھے اس کے باوجود شائقین کو موقع نہیں مل رہا تھا۔

قبرستان پہنچے، قبر تیار ہونے میں کچھ دیر تھی۔ غالباً اسی لئے وہاں مائیکروفون لگا دیا گیا تھا۔ شاہی سفارت خانے کے ایک کلچرل آفیسر اور شعلہ بار خطیب ابوالخیر عرقسوسی نے ایک ترجمان کو ساتھ لے کر از خود جوشِ عقیدت و حزن میں تقریر شروع کردی اور مجمع کو ماتم کدہ بنا دیا۔ اس تقریر کا ایک جملہ یہ تھا" اے سلیمان تیری مفارقت کا ایسا رنج نہیں، مگر آہ غم اس کا ہے کہ ایک گنجینۂ علم و عرفان آج اپنے ہاتھوں سے دفن کردیا جا رہا ہے"۔[2] مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے انتہائی ضعف کے باوجود عربی کے ایک شعر سے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ" ہم ابھی غم عثمانی (مولانا شبیر احمد عثمانی) کو نہ بھلا پائے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نشانی حضرت سید سلیمان رحمۃ اللہ بھی ہم سے کھو گئی"۔[3] پرسوز تقریر سے خود مقرر اور سامعین کے گلے رندھ گئے تو تقریر ختم کردی گئی۔ ادھر قبر بھی تیار ہو گئی تھی۔ ۲۳، نومبر ۱۹۵۳ء بروز جمعہ صبح گیارہ بجے سیرت نگار رسول کو سپردِ خاک کردیا گیا۔

سید صاحب کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع سن کر کسی نہ کسی درجہ تعلق

---

[1] تذکرۂ سلیمان ص ۲۷۲-۲۷۰

[2] و [3] تذکرہ سلیمان ص ۲۸۲

رکھنے والے ہر طبقہ کے لوگوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اظہارِ تعزیت کیا۔ تعزیتی پیغامات بھیجے، ایصالِ ثواب کئے اور کرائے۔ تعزیتی مجلسیں اور ان کی یاد میں ادبی نشستیں منعقد کیں۔ کراچی میں سلیمان اکیڈمی، جامعہ سلیمانیہ اور سید سلیمان ندوی روڈ وغیرہ کا انتساب عمل میں آیا۔

ہندوستان و پاکستان کے وزراءِ اعظم اور صدور نے تعزیتی پیغامات میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے گہرے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ سربراہانِ ممالکِ اسلامیہ کے تعزیت نامے موصول ہوئے جس میں وفات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے ان کی بے مثال خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ غمزدہ حضرات کی کوششوں سے سید صاحب کی بیشتر تصانیف کا عربی، فارسی و ترکی میں ترجمہ کا انتظام و اہتمام کیا گیا۔ سید صاحب کے عربی دیوان کی اشاعت بھی ایک عربی سفیر عمر بہاء الامیری (سفیر شام) نے اپنے ذمہ لی تھی لیکن نامعلوم وجہ سے وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔

شعرائے کرام نے اپنے اپنے ذوق اور علم و استعداد اور معلومات کے مطابق موصوف کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بعض نے تاریخیں اور تاریخی قطعات کے واسطے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ طویل نظمیں اور مرثیے لکھے۔ بعض لوگوں نے اپنے مخصوص انداز میں تاریخی مادے تخلیق کئے۔ غرض جتنا بڑا شخص اتنے ہی خصائص ان تاریخی مادوں اور قطعات میں بیان کئے گئے ہیں صرف چند تاریخی مادے اور قطعات مثال میں نمونہ کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں۔

جانشینِ خاص، جادو کلک مولانا شبلی مرحوم

۱۹۵۳ء

مردِ میدانِ تحقیق مورخ فلک اوج

۱۹۵۳ء

فاضل بلیغ

۱۹۵۳ھ

آہ مرد حکیم سخن سید سلیمان ندوی

۱۳۷۳ھ

جادو قلم، سیف قلم، علامہ استاد الکل

۱۳۷۳ھ

غریق حقایق و معارف آگاہ

۱۹۵۳ء

کشودہ پر بہ تمنائے عالمِ باقی او
زخاکدان فنا رخت زندگی بربست او
نشان صاحب عرفاں زیرِ خاک مجو
ببین کہ "تخت سلیمان با اوج فردوس" است

۱۹۵۲ء

(حفیظ ہوشیارپوری)

امجد حیدرآبادی نے ایک عرفانی قطعہ لکھا۔

سلیمان سریرِ علم و حکمت
رواں شد سوئے ربِّ علی
بآب دیدۂ سالش نوشتم
علیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

۱۳۷۳ھ

محقق مدقق سلیماں شکوہ
خوشا کشورِ علم کا تاجور
وہ چرغ معارف کا مہرِ منیر
وہ عالم وہ سنجیدہ و نکتہ ور
جھلکتے تھے چہرے پہ انوارِ فضل
چھلکتی تھی آنکھوں سے فکر و نظر
قلم تھا جو تیغِ صفاہان و ہند
تو خود مردِ میدانِ علم و ہنر
جہاں سے بہشتِ بریں کی طرف
گیا باندھ کر آج رختِ سفر
یہ تاریخِ رحلت ہے صابر لکھو
"مورخ سلیمانِ عالی گہر"

۱۳۷۳ھ

* * *

لہ یہ محض چند مادے اور قطعے ریاض و معارف کے سلیمان نمبر، تذکرہ سلیمان اور حیاتِ سلیمان کے بہت سے مادوں اور قطعات سے منتخب کئے گئے ہیں جو سید صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

خانگی زندگی

گزشتہ اوراق میں مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات اور شخصیت کے وہ پہلو سامنے آچکے ہیں جن کی بنیاد پر موصوف کا کوئی مقام اور مرتبہ متعین کیا جا سکتا ہے ان کا وطن، خاندان، ولادت، بچپن، تعلیم و تربیت کے مختلف ادارے، شخصیت کی نشو و نما میں ان اداروں اور اہم شخصیتوں کا رول، ان کی مذہبی حیثیت و مسلک، طالب علمی کا دور، علمی زندگی، ندوہ کی معلمی اور مصروفیات، پونہ کالج کی ملازمت، دار المصنفین میں ان کی خدمات، مذہبی، علمی، تحقیقی، تاریخی، تنقیدی، خطیبانہ صحافتی اور ادبی رنگ، سیاسی و غیر سیاسی زندگی، تصنیفات سے ان کی دلچسپی اردو کے لئے جاں سپاری، خالص ندویت اور خالص سلوک والی زندگی، زندگی برتنے کا طریقہ اور سلیقہ، کامرانیوں اور پریشانیوں میں صبر و شکر کا مظاہرہ، آداب و اطوار، دلچسپیاں گفتار، کردار، اخلاق، متانت و سنجیدگی، حلم و بردباری، عفو و درگزر، شائستگی و نفاست، ذوقِ مطالعہ و ذوقِ ادب، مختلف طبقات کے لوگوں سے تعلقات وغیرہ وغیرہ پر اس انداز سے گفتگو کی گئی ہے کہ منتشر اجزاء کے علیحدہ علیحدہ مطالعے کے بجائے پوری شخصیت ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے اور یہی وہ اکائی ہے جس کو لوگ سید سلیمان ندوی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔

لیکن سید صاحب کی زندگی کا خانگی پہلو جس کے بغیر ان کی زندگی نامکمل رہتی ہے اس پر عمداً لیکن مختصر طور پر علیحدہ کلام کیا جا رہا ہے۔ دوسرے بعض اسباب

کے علاوہ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ پوری شخصیت سامنے آنے کے بعد اس حیوانِ ناطق جسے حضرتِ انسان (THE CHRONIC CASE) کی فطری دورنگی شخصیت کے اس نازک پہلو پر فیصلہ کرنے کا زیادہ تر موقع فراہم ہو جائے کہ باہر کے "علامۂ دہر" اندرونِ خانہ کس مقام و مرتبہ کے حامل تھے۔ اس کے لئے صرف معاصر شہادتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اندرونِ خانہ بھی جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بعض لطیف و نازک گوشے مزید منوّر ہو سکیں۔

سید صاحب کی شادی بیس سال کی عمر میں ندوہ کے زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کے چچا ابو یوسف صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ موصوفہ ایک نیک خصال اور بلند اخلاق خاتون تھیں، چچازاد بہن ہونے اور قریب رہنے کے سبب اخلاق و کردار اور دوسرے حالات سے دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے بھی دونوں کے درمیان غیر معمولی محبت تھی۔ ان سے کئی بچے پیدا ہوئے لیکن ایک صاحبزادہ سید ابو سہیل اور صاحبزادی سیدہ ہی زندہ رہ کر جوان ہو سکے صاحبزادے سید ابو سہیل نے اسکول میں تعلیم پائی اور مختلف سرکاری ملازمتیں اختیار کرتے رہے پاکستان بننے کے بعد وہاں چلے گئے، اسٹیٹ بینک میں ملازم ہو گئے پھر ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں کسٹم آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، بحمداللہ بقید حیات ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ سیدہ کی شادی سید نجیب اشرف کے چھوٹے بھائی نواب اشرف سے ہوئی تھی۔ لیکن نواب صاحب کا عالم شباب ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک بیٹا نقی اشرف یادگار چھوڑا۔ کچھ ہی دن کے بعد سیدہ کی نوجوان وفات کا غم بھی سید صاحب کو سہنا پڑا۔

سید صاحب کی اہلیہ شادی کے تین سال بعد مختلف قسم کی عمومی اور خصوصی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھیں اور یہ علالت دس سال جاری رہی۔ کبھی خفیف کبھی شدید، لیکن صحت یاب نہ ہو سکیں۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں تیرہ سالہ رفاقت کے بعد دائمی مفارقت کا غم دے گئیں۔ سید صاحب پر ان کی وفات کا زبردست اثر ہوا، کسی طرح چین نہیں

پڑتا تھا لوگوں کے تعزیتی خطوط[1] مئے دو آتشہ کا کام کر رہے تھے۔ اسی مہینہ کے معارف میں سید صاحب نے اس سلسلے میں ایک شذرہ اور مرگ یار کے عنوان سے ان کا دلسوز مرثیہ لکھا۔ شذرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال تک رفیقۂ حیات کی بیماری کی مسلسل پریشانیاں ان کے علم و تحقیق کے انہماک اور دار المصنفین کے پودے کی پرورش میں کبھی حائل نہیں ہوئیں یہی نہیں بلکہ اس شہسوار علم و ادب اور مفکرِ دین و مذہب نے اس حادثۂ فاجعہ کے بعد بھی اسی وضع و شان کے ساتھ دار المصنفین کی خدمت اور دوسری سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اہلیہ کی وفات سے ماقبل و مابعد کے حالات کے پس و پیش منظر میں اس اداریہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "آخر خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی۔ دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ستائیس سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کیا۔ استاد مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا حادثہ ہے جس نے میرے سکونِ خاطر کو درہم کر دیا۔ اپنے ایک سالہ صغیر السن بچہ کو چھوڑ کر بڑی بے کسی میں جان دے دی۔ یہ ۱۲ر اپریل ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے لیکن اب تک حواس برجا نہیں ہوئے ہیں۔

---

[1] اکبر الہ آبادی سید صاحب کے گہرے دوست تھے، انھوں نے بھی غم کو ہلکا کرنے، تسلّی دینے اور دلجوئی کے لئے مختلف خطوط میں حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے تھے۔

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا　　مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

صدیوں فلاسفہ کی چناں اور چنیں رہی　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

ساتھی جو تھے رنج و راحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے
اب یاس گرائے دیتی ہے سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مر چکا اور رونے والا رو چکا　　وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

مرحومہ نے تیرہ سال تک میری زندگی کی رفاقت کی، دس برس سے صحت خراب تھی اور کبھی کامل صحت اس عرصہ میں اس کے تنِ زار کو میسر نہ آئی۔ علاج کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہوا۔ پچھلے دس برس میں اس انتشارِ حالی اور پراگندگیٔ خاطر کے باوجود مجھ سے جو کچھ قوم و ملّت کی خدمتیں انجام پا سکیں وہ بجائے خود تعجب انگیز ہیں کہ اس طویل عرصہ میں کبھی میرے دل و دماغ نے فراغِ خاطر نہ پایا۔ میں مرحومہ کی زندگی میں غالب مغفور کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

میں بھی بتاؤں تم کو کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اس پیکرِ وفا نے اپنی جان دے کر مجھے علم و ملت کی خدمت گزاری کے لئے کشاکشِ غمِ پنہاں سے فرصت عطا کی لیکن ایسا کانٹا دل میں چبھ کر رہ گیا جو شاید عمر بھر نہ نکلے۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

اس سے زیادہ غم انگیز اظہارِ خیال "مرگِ یار" کے عنوان سے ایک مرثیہ میں کیا ہے[1] اس مرثیہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ہم سفر وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا — شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا
تیر جو آئے فلک سے ہدف ان کا میں تھا — ظلم کہیے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا

---

[1] معارف اپریل ۱۹۱۷ء

درد اُٹھ اُٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے　　کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
کس سے کیجے دلِ شیدا کا گلہ تنہائی　　مسند آرا مرے پہلو میں وہ دلبر نہ ہوا
تیرے جلنے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا　　تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا
حیف اس خون کی قسمت جو مژہ سے ٹپکے　　قطرۂ اشک ہوا بادۂ احمر نہ ہوا
گر قضایائے جہاں قابلِ تغییر نہیں　　کیوں نہ کہیے کہ مرے واسطے داور نہ ہوا
قہر آلود نظر میں نگہِ لطف بھی تھی　　لطف فرما نہ رہا جب وہ ستمگر نہ ہوا
باعثِ رنج ہے امید کا پیدا ہونا　　یارب اس خرمنِ امید میں اخگر نہ ہوا"

یہ اثر بہت دن تک رہا والد اور چچا (خسر) نے دوسری شادی کی طرف رغبت دلائی، سید صاحب نے اس کو منظور نہیں کیا اور بچوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ سنا دیا۔ مکتوباتِ سلیمانی میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اس زمانے کے لکھے ہوئے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کا اصرار سید صاحب کے شادی نہ کرنے کے فیصلے پر غالب آ گیا اور وفدِ خلافت کے ساتھ لندن جاتے وقت ۱۹۲۰ء میں دوسری شادی کر لی۔ ان اہلیہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی یہ بیوی بھی داغِ مفارقت دے گئیں اور ان کے لئے پرانا غم تازہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی غموں کا مجموعہ بن گئی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی اور میرے احساس کو صدمہ پہنچتا رہتا ہے۔"[1]

سید صاحب مستقل غم زدہ رہنے لگے، علمی کاموں اور سیاسی باتوں سے اپنا دل بہلاتے رہتے لیکن یاد آنے پر پھر پریشان ہو جاتے اور یہ غیر معمولی غم ان کے لئے مضرِ صحت بھی ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اب موصوف کی گوناگوں مصروفیات اور مختلف قسم کی خانگی ذمہ داریوں نے انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] مکتوباتِ سلیمانی جلد اول ص ۱۷۶

مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری کا اصرار رہا کہ شادی کرلیں لیکن طبیعت کا آمادہ ہونا مشکل ہو رہا تھا دو سال اسی میں گزر گئے بالآخر گھر کی ذمہ داریوں کے تقاضے اور مخلصین کی ہمدردیوں اور پیہم اصرار سے مجبور ہو کر ۱۹۲۳ء میں تیسری شادی کرلی۔[1] یہ اہلیہ سادات بہار ہی کی ایک کمسن بیوہ اور مشہور سیاسی لیڈر مولوی محمد شفیع کی عزیزہ تھیں۔ ان کی پہلی شادی ہوئے دس ماہ گزرے تھے کہ شوہر وفات پا گئے۔ سید صاحب نے نہایت خاموشی سے ان کے ساتھ یہ شادی کرلی۔

> "یقین جانیے کہ پہلی شادی کے بعد تمام دوسری شادیوں کو میں نے ایک رسمی تقریب سمجھا، انتہائی سادگی، خاموشی اور سکوت کے ساتھ یہ کار خیر انجام پایا۔ طرف ثانی سے بھی میں نے یہ شرط کی تھی اور انھوں نے پوری طرح وفا کیا یہاں تک کہ ایک جوڑا کپڑا ساتھ نہیں لے گیا۔ ۷ر جنوری کو نکاح ہوا، ۹ر کو رخصت ہوئی اعظم گڑھ سیدھے لے آیا۔ دستور زمانہ کے مطابق وطن بھی نہیں لے گیا کہ وہاں کچھ مراسم مسرت نہ ظاہر ہوں اور میری پچھلی غمناک مسرتوں کی یاد تازہ نہ ہو۔"[2]

---

[1] سید صاحب کی اس عمر میں اور تیسری شادی کے لئے بھی لڑکی والوں نے از خود ہی رشتے بھیجنے شروع کر دیئے۔ ان میں ایک قابل ذکر رشتہ خواجہ حسن نظامی کا بھیجا ہوا تھا۔ یہ رشتہ سکندرآباد (دکن) کے سب سے بڑے اور کروڑپتی تاجر احمد نواز جنگ احمد علاء الدین کی صاحبزادی کا تھا۔ ان کی نیکی اور خدا ترسی اور تبحر بھی شک و شبہ سے بالاتر تھا لیکن سید صاحب ماحول کی یگانگت و یکسانیت اور ذہن و فکر کی مطابقت کے مقابلہ میں زر و مال کو ہیچ گردانتے تھے اس لئے انکار کرتے رہے جب خواجہ صاحب نے اصرار کیا تو سید صاحب نے یہی ایک جملہ لکھ بھیجا کہ "سکندرآباد کے سب سے بڑے امیر کی صاحبزادی اعظم گڑھ کے سب سے بڑے فقیر کے گھر کیسے آسکتی ہے۔ (بحوالہ تذکرہ سلیمان صفحہ ۱۹۵)

[2] مکتوبات سلیمانی ص ۱۹۵۔

یہی زمانہ سید صاحب کی ملک گیر علمی و سیاسی اہمیت اور بین الاقوامی شہرت کا زمانہ تھا، قومی، ملی اور ملکی کاموں کے ساتھ ساتھ علمی انہماک کے لئے سید صاحب کو جس مستقل سہارے کی ضرورت تھی وہ ہاتھ آچکا تھا اور ان کے حزنِ مسلسل کو شگفتگی میں بدلنے اور بگڑتے گھر کو پھر سے بسانے اور بنانے میں ان کی اہلیہ نے توقع سے زیادہ مدد کی۔ شرافت، مروّت، حیا، پاک دامنی، تواضع اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ جام محبت سے سرشار نصف بہتر نے غم ہائے ماضی کو فسانۂ پارینہ بنا دیا اور سید صاحب کو سکون کی زندگی میسر آگئی۔ سید صاحب کی وفات (۱۹۵۳ء) کے بعد موصوفہ تقریباً ۳۵ سال حیات رہیں جس میں پچیس سال سے زائد ابوعاصم صاحب کے پاس اور زندگی کا آخری حصہ تیسری بیٹی یعنی ڈاکٹر عطاء اللہ کے ساتھ گذار کر غالباً ۱۹۸۸ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ان اہلیہ سے ایک صاحبزادے سید سلمان اور چار صاحبزادیاں شمیمہ، شکیلہ، شمیمہ اور ثوبیہ چاروں لڑکیوں کی شادی سید صاحب کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی۔ بڑی، سید صاحب کے برادر زادہ سید ابوعاصم صاحب ایڈوکیٹ (کراچی) منسوب ہیں۔ منجھلی سید حسین الہ آبادی سابق کمشنر حکومت یوپی سے، تیسری کی شادی ڈاکٹر عطاء اللہ بہاری سے ہوئی جو کراچی میں ہیں اور سب سے چھوٹی کی پہلی شادی بہار ہی کے سید محی الدّین مقیم کراچی سے ہوئی تھی جن کا جواں عمری میں ہی انتقال ہو گیا تھا انھوں نے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑے۔ دوسرا نکاح بھی کراچی میں ہوا۔ اب وہ بھی وفات پا چکی ہیں۔ سید سلمان صاحب کی شادی (حیدرآباد سندھ) کی ایک میمن خاتون سے ہوئی۔

سید صاحب کی طبیعت کی فطری نرمی، مروّت، محبت اور شفقت ان کی خانگی زندگی میں بھی غالب رہی۔ تیسری شادی کے بعد کے جو حالات پیش کئے گئے ہیں ان سے بآسانی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان موانست و یگانگت کی مقابلہ آرائی تھی۔ ایک دوسرے کا لحاظ کرنے میں مسابقت ان دونوں کا وصف خاص تھا۔ سید

صاحب کو جبلی طور پر غصہ کم آتا تھا اور گذشتہ صفحات میں یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ وہ حلم وعفو کے بلند مقام پر فائز تھے۔ اس صفت نے دونوں کی زندگی کو مزید خوشگوار بنا دیا تھا۔ سید صاحب اس زمانے میں ہزاروں روپیہ کی تنخواہوں کو رد فرماتے رہتے تھے اور دن ورات محنت کر کے انھیں دارالمصنفین سے کل ڈھائی سو روپیہ ملتے تھے۔ اس کے علاوہ سال بھر میں تقریبًا ایک ہزار روپیہ کی آمدنی کا اوسط ان کی کتابوں وغیرہ سے نکل آتا تھا۔ اس طرح ساڑھے تین سو روپیہ میں اس نفیس ونازک بین الاقوامی شخصیت کا خوش اسلوبی اور صبر وشکر سے گزارا کر لینا سید صاحب سے زیادہ ان کی اہلیہ کی سلیقہ شعاری اور حسنِ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔

سید صاحب اپنی اہلیہ کا جس طرح خیال رکھتے تھے اس کی مثالیں بھی شاذ ہی ملتی ہیں گھر سے باہر کسی شخص کا معزز و محترم بننا اس کی صلاحیتوں پر زیادہ انحصار کرتا ہے لیکن اندرونِ خانہ اخلاق وعادات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور جب تک کوئی شخص خانگی امور میں بھی ان ہی صلاحیتوں اور حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کر کے اندرونی و بیرونی پوزیشن میں مطابقت پیدا نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کو قابلِ استناد کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب کی زندگی کے اس پہلو کے مطابق دوسرے اعزہ واحباب کے بیانات بھی تمام تر مثبت حیثیت رکھتے ہیں لیکن سب سے زیادہ معتبر و مستند شہادت خود ان کی اہلیہ سے ایک انٹرویو کے دوران سامنے آئی۔ وہ فرماتی ہیں۔

> ” میاں بیوی کے گھریلو اختیارات کے سلسلے میں سید صاحب کہتے تھے کہ دونوں کے اختیار برابر ہیں، دونوں کے ایک دوسرے پر برابر کے حقوق ہیں۔ البتہ شوہر کو اللہ نے افضل بنایا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل حاکم ہی بن بیٹھے۔
>
> علامہ نے اپنے گھریلو اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، بچوں کی تربیت میرے ذمہ تھی اور گھر کے معاملات میں مجھے مکمل آزادی تھی اور وہ میری رائے کو ترجیح دیتے تھے لیکن اکثر میں خود بھی اپنی رائے پر ان کی

> رائے کو ترجیح دیتی تھی کیونکہ وہ عالم تھے اور مجھ سے بہتر سوچ سکتے تھے اور ان کی رائے مناسب ہی ہوتی تھی۔ میری بڑی عزت کیا کرتے تھے اور اپنی والدہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے انتہائی فرمانبردار تھے ان کے ہر مشورہ کو حکم تصوّر کرتے تھے۔"[1]

اہلیہ محترمہ کی یہ محبت اور عظمت ان کے دل میں روز اوّل سے وقت آخر تک بدستور قائم رہی یہاں تک کہ عمر کی اس منزل میں جب انسان خود ایک کشمکش میں مبتلا رہتا ہے، سید صاحب نے بطور خاص اس پر توجہ کی۔ انھیں آخر میں یہ فکر رہتی تھی کہ وہ کہاں پر زیادہ سے زیادہ خوش و مطمئن رہ سکیں گی۔ صاحبزادہ ابوسہیل کے خانگی حالات اچھے نہیں تھے، سلمان ابھی زیر تعلیم تھے جب کہ دونوں دامادوں کا اصرار تھا کہ خوش دامن صاحبہ ان کے پاس رہیں۔ اس لئے موصوفہ کو اپنی دو صاحبزادیوں یعنی اہلیہ ابو عاصم (کراچی) یا اہلیہ سید حسین (فتح پور ہندوستان) میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرنا تھا اور رائے کراچی میں ہی قیام کی ہو گئی۔

ہر اہلیہ اس مسئلہ پر آخر عمر میں غور تو کر سکتی ہے لیکن یہ بات مقدر رہتی ہے۔ کوئی بھی عورت شوہر کے سامنے اس کا برملا اظہار کر دے یہ دشوار کام ہے۔ سید صاحب ان کی رائے جاننا چاہتے تھے کہ وہ جہاں کہیں رہیں اس کا اظہار کر دیں چنانچہ عین وفات کے روز ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو چار بجے اہلیہ کو تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ "آپ عاصم کے ساتھ مطمئن رہیں گی؟" اہلیہ نے یہ بات ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ بھی کوئی سوال ہے مگر وہاں

---

[1] مجلہ کراچی ۱۹۷۵ء بیگم سید سلیمان ندوی سے ایک ملاقات از سید جمال محسن

[2] سید حسین صاحب اس وقت فتحپور میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ریٹائر ہو کر انھوں نے علی گڑھ میں دودھ پور کی ایک مینار مسجد علاقہ میں اپنا مکان بنا لیا تھا وہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے خلیفۂ مجاز تھے چنانچہ ان کی عرفانی مجلسیں باقاعدگی سے جاری رہتی تھیں افسوس کہ چند سال قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے دو صاحبزادے سید احسن اور سید حامد علی مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تو اطمینان آخر مقصود تھا۔ اصرار ہوا کہ

"میرے سوال کا جواب دیجئے فضول باتوں میں نہ الجھائیے"۔

تب اہلیہ کو کہنا پڑا "بیشک"، اس جواب سے سید صاحب بھی خوش ہوئے اور کہا "الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے۔

بچوں کی تربیت ان کی خاص ذمہ داری نہ تھی لیکن جہاں تک مذہبی مزاج بنانے اور آداب سکھانے کا تعلق ہے ان کے گھر نے اچھا نمونہ پیش کیا۔ خود سید صاحب کی تربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہوئی تھی۔ وہ بچوں کی اسی طرح کی تربیت کے ... خواہاں تھے۔ سید ابو سہیل صاحب ترقی کرتے کرتے کسٹم آفیسر کے عہدے تک پہنچے، سید سلیمان صاحب نے ایم اے پی ایچ ڈی کیا اور اس وقت وہ ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہیں۔ صاحبزادیاں بھی سب ہی اپنی جگہ خوش اور اپنے بچوں کی بہترین نگہداشت کا نمونہ پیش کر رہی ہیں۔

دار المصنفین کے فارغ اوقات میں سید صاحب کا سارا وقت اہل و عیال میں گزرتا، بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے اور سب سے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر باہر آجاتے۔ اگر چلنے کے قابل ہوتا تو اسے انگلی پکڑ کر دار المصنفین کی سڑک پر ٹہلاتے۔ طبیعت کی انتہائی نرمی کی وجہ سے بچوں کو کبھی تعمیل حکم کے لئے بھی ڈانٹتے یا جھڑکتے نہ تھے۔ بہت غصہ آتا تو یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ "مجھے یہ طاغوتی حرکت پسند نہیں" البتہ بچوں کے نماز میں تساہل پر لہجہ کبھی ترش ہو جاتا تھا۔ ورنہ ہر وقت پیار و محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ بچوں کو آداب سکھانے میں بھی اسی پیار، نرم گفتاری، خوش مزاجی اور بچگانہ و معصومانہ زبان سے کام لیتے تھے۔

اہل و عیال سے یہ محبت پاکستان میں بھی اسی طرح برقرار رہی۔ بعض اعزہ ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا پاکستان میں اعزہ کی تعداد محدود ہو گئی تھی اس تقلیل و تحدید نے ان سے محبت مزید بڑھا دی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے اعزہ و متعلقین کے ساتھ جو معاملہ کرتے تھے، موروثی صفت کے طور پر خود ان ہی کا مندرجہ ذیل قول ان

پر سو فیصد صادق آتا ہے۔

> "میں نے اپنے والد ماجد اور حضرت تھانویؒ سے زیادہ باہمہ اور بے ہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں۔ بے ہمہ تو ایسے تھے کہ اپنے ذاتی معاملہ میں ان کو کسی سے کوئی تعلق نہ تھا اور باہمہ ایسے کہ دور دور کے عزیز و اقارب کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کی ادائیگی پر بھی نظر رہتی تھی اور اس میں تاخیر گوارا نہ فرماتے تھے"[1]

سادگی اور نفاست کے ساتھ بڑی شائستہ زندگی گزارتے تھے۔[2] لباس انتہائی صاف رکھتے۔ گھر میں کھانا بہت خوش ذائقہ پکتا تھا اس پر شکر ادا کرتے اور کسی خاص چیز کا اہتمام لازمی نہیں سمجھتے تھے۔ خوراک کم تھی، دو چپاتی سے زیادہ نہیں کھاتے تھے، آخر میں اس میں بھی کمی ہو گئی تھی۔ کھانے میں بھی بڑی ہی نفاست پر عامل رہتے اور اس کی تلقین کرتے۔ دار المصنفین میں ان کے پرانے رفیق مولانا عبد السلام صاحب ندوی طبعاً آداب کے پابند نہ تھے۔ کھانے کے بعد ڈکار زور زور سے لیتے اور پانی غٹ غٹ کر کے پیتے تھے۔ سید صاحب پریشان ہو جاتے اور فرماتے کہ "مولانا آپکے حلق اور معدہ میں کوئی خرابی ہو گئی ہے، اس کا علاج کرائیے"[3]

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۲۸

[2] رشید احمد صدیقی سے مجلّی و مصفّٰی پروفیسر (اہل تجربہ، ان کی نفاست و نزاکت اور لطافت طبع سے واقف ہیں) انھوں نے معارف سلیمان نمبر میں جو تاثراتی مضمون لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آداب معاشرت، حسن محبت اور تواضع میں سید صاحب کی نظیر بہت کم ملتی ہے کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی کیا ہے۔ مولانا ابو ظفر ندوی اور مولانا عبد الباری ندوی جن کا بچپن سے وفات تک مسلسل سید صاحب کا ساتھ رہا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے مضامین معارف مذکور میں سید صاحب کی نفاست و شائستگی کے علاوہ ان کی متانت، کم سخنی، بردباری، عفو، حلم، منکسر المزاجی، استغنا ذوق مطالعہ، وسعت معلومات، محنت، بے ریائی و ژرف نگاہی وغیرہ کے متعلق اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی مثالیں گزشتہ اوراق میں موقع بہ موقع پیش کی جاتی رہی ہیں۔

[3] بحوالہ حیات سلیمان ص ۲۰۲

ادبی کارنامے

سید صاحب کی تحقیقی کاوشیں

تحقیق، عرفان حقیقت کا دوسرا نام ہے، ادب و تاریخ اور دیگر علوم میں بھی تحقیق ودیافت کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جن علوم کی ماضی سے وابستگی ہوتی ہے، ان کے ارتقاء کی تلاش صحیح تحقیق کے بغیر ممکن ہی نہیں اسی سے اس کو روشنی اور جلا ملتی ہے، بہت سی دیانت دارانہ ومخلصانہ تحقیقی کوششیں نتیجہ کے اعتبار سے دائمی نہ ہو کر عارضی ثابت ہو سکتی ہیں، اس تحقیق کے بعد جلد ہی کوئی دوسرا محقق نئی دریافت پیش کر کے پہلے نتیجہ کو غلط ثابت کر سکتا ہے یا یہ کام خود پہلا ہی محقق سرانجام دے سکتا ہے لیکن اس سے تحقیق کی ماہیئت پر کوئی حرف نہیں آتا، جس وقت تحقیق کی گئی ہے اس وقت تک کے تمام وسائل و ذرائع اور محقق کے مطالعے کی روشنی میں عرصہ تک تلاش و تحقیق کے بعد ایک نتیجہ نکالا گیا تھا۔ نئے وسائل کی دریافت و جستجو کے نتیجہ میں نئی تحقیق سامنے آگئی تو بعد کی تحقیق ماقبل کی تحقیق کا رد نہیں ارتقائی کوشش ہے، سائنس کی مختلف شاخوں کے نظریات آئے دن تبدیل ہوئے اور نئی تحقیقات نے سابقہ کو غلط ثابت کیا تو اس سے تحقیق کی حیثیت مجروح نہیں ہوئی۔ نہ پہلا کام بیکار اور بے نتیجہ کہا جا سکتا ہے، بلکہ یہ پہلی تحقیق پر اضافہ کہا جائے گا، خواہ بادی النظر میں کچھ ہی ہو۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے خیام کو لیا جا سکتا ہے کہ اس شخص پر مغرب میں بہت کچھ لکھا گیا، مشرق میں اس کی شخصیت کو دوسرے زاویے سے دیکھا جاتا تھا اس لئے اس کا جواب اور پھر اس کا جواب الجواب لکھا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اس موضوع پر ایک وقیع کتاب "خیام" پیش کی، یہ سب تحقیقی کوششیں ہیں۔ اسی طرح بعض کتابوں

کے سلسلے میں بہت ممکن ہے کہ ان میں سے پہل کے بغیر دوسری وجود ہی میں نہ آتی۔ کسی ادبی شخصیت یا ادب پارے کی دیانتدارانہ تحسین یا صحیح تفہیم و تنقید اسی وقت معتبر کہی جائے گی جب اس کے بارے میں تمام حقائق موجود و معلوم ہوں، اگر اس سلسلے میں صحیح معلومات کا فقدان ہے یا حقائق سے چشم پوشی کی گئی ہے تو درست نتائج کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ نام یا تخلص کی یکسانیت و مشابہت۔ یا موضوع کی باہمی مماثلت و مشارکت محقق کے لئے مہمیز کا کام کرتی ہے، میر تقی میر، میر سوز اور میر درد، میر اور سراج، میر اور فانی یا سودا او آتش وغیرہ کی موضوعی و اسلوبی مماثلتیں اور الحاق کلام محقق کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں، وہ فکری، موضوعاتی اور اسلوبیاتی ہر سطح پر تحقیق سے کام لیتا ہے صداقت کی تلاش اس کا مسلک، عقل و ذہن اس کے رہنما فکر و نظر اس کے ہم شانہ اور معقول دلائل اس کا سہارا ہوتے ہیں۔ قوی دلائل خواہ اس کے موافق ہوں یا مخالف اس کے لئے قابلِ غور اور بشرط صحت قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ اچھا محقق وہی ہے جو تمام ضروری علوم پر دسترس رکھتا ہو، تاریخ، تحقیق، تنقید لسانیات اور نفسیات پر اس کی گہری نظر ہو۔ اس کے اندر قوت آخذہ، قوت ممیزہ، قوت مفسرہ اور فکر کی مرکزیت کے ساتھ ذہن کی لامرکزیت کی کافی صلاحیت ہونا بھی ضروری ہے اس کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہیے، خاکساری، خود فراموشی، جفاکشی، خلوص و ایثار، دیانتداری اس کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس کی علمی و اخلاقی تربیت بھی بہت اعلیٰ معیار کی ہو۔ بصورتِ دیگر وہ محقق بدترین سارق بھی ہو سکتا ہے۔ مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ محقق کو زبان کی نزاکتوں کا رمز شناس اور اس کے استعمال کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے تحقیق کی زبان بالعموم سادہ ہونی چاہیے۔ ایجاز بیانی ادب کی دوسری اصناف کی طرح تحقیق کا بھی حسن ہے لیکن اس میں ابہام پیدا نہ ہو جائے۔ اسلوب بیان غیر مبہم، قطعی و واضح اور شگفتہ ہو اور جو بات کہی جا رہی ہے قاری اس کے علاوہ کوئی دوسرا مطلب نہ نکال سکے۔

علامہ سید سلیمان ندوی تقریباً ان سبھی تحقیقی اصولوں اور محققانہ صلاحیتوں کے حامل تھے اور ان کی حیات و تصنیفات اس کی بہترین مظہر ہیں اگرچہ موصوف انشا پردازی میں محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر اور ابوالکلام آزاد سے بھی متاثر ہوئے لیکن انھیں شبلی

کی بہترین تربیت کے ساتھ ان کا تحقیقی ذہن اور ایک سائنس داں کا دماغ بھی ودیعت ہوا تھا۔ البتہ اپنے تحقیقی طریقۂ کار میں وہ شبلی کے مقابلے میں سرسید کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ سرسید کی طرح ان کی تحقیق میں بھی تشکیک کی لہر حقیقت کی تلاش اور ثانوی ماخذ کے مقابلے میں بنیادی مآخذ کی جستجو کو ترجیح رہی ہے تو مزید برآں زبان و اسلوب کی سادگی کے اعتبار سے بھی علامہ شبلی کے پُر بہار اسلوب کا اثر کم اور سرسید اسکول کے طرزِ نگارش کا اثر کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات عربوں کی جہاز رانی خیام وغیرہ کے علاوہ موصوف کے تمام ہی تحقیقی مقالات و مضامین بھی مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں۔

ارض القرآن

دو جلدوں پر مشتمل "ارض القرآن" ایک ایسی تحقیقی تصنیف ہے جس کا موضوع اور عنوان بظاہر مذہبی اور جذباتی لیکن اس کا طریقۂ کار، طرزِ استدلال، اسلوب بیان اور منزل مقصود خالص تحقیقی ہے۔ مصنف کے پیشِ نظر بنیادی طور پر تو یہی بات رہی ہے کہ قرآن مجید میں پیش کیے گئے حوالوں اور اشاروں سے ان اقوام و بلاد کی تعیین و تطبیق کی جاسکے اور اس میں محقق عالم دین کے لئے کامیابی سے ہم کنار ہونا تعجب خیز بھی نہیں لیکن سرزمین عرب کے قدیم شہروں کے جغرافیہ کی پیش کش، وہاں رہنے والے قبیلوں اور قوموں کی پوری تاریخ کے بیان اور مبہم یا متنازعہ فیہ امور پر بصیرت افروز محاکمے نے جہاں موضوع میں کافی وسعت پیدا کردی اور کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا وہیں اردو میں تحقیق کا ایک قابل قدر اور گرانمایہ نمونہ بھی پیش کردیا ہے۔

اس تحقیق کے لئے مصنف نے خصوصاً انگریزی اور عبرانی زبانوں کو سیکھ کر ان میں ہونے والے کاموں پر دسترس حاصل کی، فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ کے مآخذ کے تراجم سے

استفادہ کیا اور تاریخ، اثریات، جغرافیہ، لسانیات جیسے مضامین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، توریت، انجیل و قرآن کے ہم عصر مآخذ کے علاوہ عرب قدیم سے متعلق مختلف تاریخوں تک ممکنہ رسائی حاصل کی گئی ہے۔ اثری تحقیقات کے قدیم و جدید ماہرین پر مصنف کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ یہ مآخذ جہاں رہنما ثابت ہوتے رہے انھیں قبول کیا گیا اور جہاں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے اور راہِ راست سے ہٹاتے ہیں۔ قوی دلائل کے ساتھ ان کی تردید و اصلاح کی گئی ہے اور کتاب کے یہ سبھی مآخذ بہت متنوع اور ہمہ رنگ ہو گئے ہیں، حوالہ کا ہر جگہ اہتمام کیا گیا ہے۔

"ارض القرآن" کے صفحات کی مجموعی تعداد ساڑھے پانچ سو ہے جس میں ۴۱ صفحات طویل و مفصل مقدمہ ہے۔ اس میں "سرمایۂ ارض القرآن" کے عنوان سے پس منظر کے طور پر مختلف مآخذ کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی روشنی میں عرب قدیم سے متعلق تمام بیانات و خیالات کا جائزہ لے کر ان پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان مآخذ میں ادبیاتِ اسلامیہ (بشمول قرآن مجید، روایات تفسیر اور اسرائیلیات، تاریخ عرب و جغرافیہ عرب) ادبیات اسرائیلیہ (بشمول سفر تکوین، سفر خروج، سفر الاخبار، سفر العدد وغیرہ کے علاوہ بنیم، ترگوم، مدراش اور تالمود کو خاص اہمیت حاصل ہے) ادبیاتِ یونانیہ و رومانیہ (جس میں ان ممالک کے مورخوں سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات شامل ہیں) اور اکتشافات اثریہ (قدیم و جدید) پر بطورِ خاص گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں قدیم عناصر کی تعیین کی گئی ہے اس لئے "تاریخ کے بعض اصول" کا عنوان قائم کر کے اصول تعیین زمانہ اور اصولِ تطبیق اسماء پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

اصول تعیین زمانہ: عموماً کسی مجہول العہد قوم کی تعیین زمانہ کی یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ اس کے معاصر معلوم العہد قوم یا شخص کے زمانے سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ عموماً چار پشتوں کی ایک صدی فرض کر کے پشتوں کے شمار سے زمانہ کی تعیین کر لی جاتی ہے۔

اصول تطبیق اسماء: ایک اور چیز جس سے کسی قدیم قوم کی جائے سکونت اور قومیت کی نوعیت کی تحقیق میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اشخاص تاریخی اور ان کے مقامات سکونت، کارناموں کا یا دو قوموں کی زبان، اشخاص اور دیوتاؤں کا باہمی تطابق ہے۔

اشخاص و مقامات کے ناموں کا باہمی تطابق ان اشخاص کے مقامات و سکونت کا پتہ دیتا ہے اور دو قوموں کی زبان اور اس کے باہمی اسمار کی مطابقت ان کے اتحاد قومیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پہلا طریقہ تحقیق تمام ممالک عالم سے زیادہ بلاد سامیہ کے جغرافیۂ قدیم میں کارآمد ہے کیونکہ سامی اقوام کا یہ خاص مذاق ہے کہ وہ مقامات سکونت کے نام بعینہٖ باشندوں کے نام رکھ دیتے ہیں جن سے نہایت آسانی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان اقوام کا کہاں مسکن تھا اور ان کی اولادیں کہاں کہاں پھیلیں۔

لیکن اس اصول کے اجرا میں دو بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ زمانے کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زمانہ کے تغیرات سے نام کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اس لئے مقامات اور باشندوں کے ناموں سے تطابق کے بجائے کبھی صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ دوسری دقت جو پہلے سے سہل تر یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور یونانی زبان میں جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے[1] تو بعض حروف کا خصوصیت زبان کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے مثلاً

آجر، ہاجر، امورا۔ حمورا، شیت، شیث، تمود، ثمود وغیرہ۔ یہ تغیر تو صاف ہیں۔ کہیں کہیں اول میں یا وسط میں یا آخر میں حروف کی زیادتی یا کمی ہو جاتی ہے خصوصاً الف کی زیادتی اور کمی تو بہت عام ہے مثلاً حصارموت، حضرموت، ابی رہام، ابراہیم وغیرہ۔

اصول اتحاد اسماء و السنہ: ہر قوم کے ناموں کی ایک خاص نوعیت اور ترکیب ہوتی ہے جس

---

[1] یہ مذکورہ زبانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، ہر زبان کی یہی فطرت ہے۔ جسے لسانیات میں صوتی تغیرات کہتے ہیں۔

ہیں اس کی قومیت کا امتیاز مضمر ہوتا ہے۔ اقوام موجودہ میں ہندوؤں، مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے ناموں کی اور پھر ان مذاہب مختلفہ میں سے مختلف ملکوں کے باشندوں کے ناموں کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے جس سے ان کی قومیت کا نشان ملتا ہے۔ اس بنا پر اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو دونوں قوموں کو متحد الاصل کہا جا سکتا ہے اسی طرح مذہبی اعتقادات کا تشابہ اور الفاظ زبان کی مماثلت و مشاکلت بھی باہمی اقوام کے اتحاد کی ایک مبہم دلیل ہے۔"[1]

زمانہ قدیم کے مآخذ کی تحقیق میں یہ اصول آج بھی کسی نہ کسی حد تک رہنمائی کرتے ہیں، نئی دریافتیں اس کی مظہر ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سید صاحب نے یہ سب اصول خود ہی وضع نہیں کئے ہیں بلکہ متعدد جرمن و فرنچ تحقیقی نمونوں سے بھی مدد لی ہے۔

اس کے علاوہ اس مقدمہ میں "جغرافیہ عرب" کے عنوان سے لفظ "عرب" کی ماہیئت و اصلیت پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ لفظ عرب کی تحقیق کے لئے کئی سامی زبانوں بالخصوص عبرانی کے حوالے پیش کر کے لفظی تحقیق کا اچھا نمونہ فراہم کیا ہے۔

عرب کی اصل وہاں کی بادیہ نشینی اور صحرا نوردی اور بدویت کے سبب "عربہ" اور "عربا" کو قرار دیا ہے۔ اور عہد جاہلیت کے شعراء کو سند مانا ہے۔ اس بحث کے آخر میں اس لفظ کی تاریخی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "...... لفظ عرب سب سے پہلے ۱۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت سلیمان کے عہد میں سننے میں آتا ہے اور پھر اس کے بعد عام طور سے اس کا استعمال عبرانی، یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔ اسیریا (عراق) کے کتبات میخی میں ۸۰۰ ق م میں عرب کا نام "عربی" لیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے یہ لفظ پورے ملک کو جو یمن سے شام تک وسیع ہے، محیط تھا۔"[2]

---

[1] ارض القرآن جلد ۱ ص ۵۱-۵۲

[2] ارض القرآن ص ۵۹

اس کے بعد توراۃ، مصنفین یونان وروما اور خود اہلِ عرب کے بیانات کی روشنی میں جغرافیہ عرب کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے عرب کی حدود متعین کی گئی ہیں اور حسب ضرورت بعض شہروں کا علیحدہ علیحدہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مقدمہ کی آخری بحث "اقوام ارض القرآن" ہے۔ پہلے اس میں اقوامِ عالم کی تمام تقسیموں (ماہرین علم الاقوام وعلم الاسنہ کی تقسیم، علم الالوان یعنی اختلاف رنگ کی بنا پر کی ہوئی تقسیم یا توراۃ میں پیش کی ہوئی نسلِ نوح کی تقسیم۔ ان سب) کا جائزہ لیا گیا ہے، پھر عرب کی قدیم ترین قوم اُمم سامیہ کو زیرِ بحث لا کر ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا مسکن اول عرب تھا اور یہاں سے وہ بابل، کنعان، مصر وغیرہ کو ہجرت کر کے باہر پھیلتے گئے۔ اس کے بعد اُمم سامیہ کے انساب اور توراۃ سے مطابقت دکھا کر اقوامِ ارض القرآن کا ایک شجرہ پیش کیا گیا ہے اور یہیں مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔

یوں تو یہ پوری کتاب اپنے جلو میں جواہر پاروں کا خزانہ رکھتی ہے لیکن مقدمہ کے یہ صفحات تحقیقی کاوش، تنقیدی بصیرت، پیش کش کی جامعیت اور دائرہ کی وسعت کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ اہم اور دلکش ہیں۔ مآخذ کی ہمہ رنگی، حوالوں کے التزام اور حاشیوں کا اہتمام ہر جگہ نمایاں ہے۔ مختلف مسائل پر آئی ہوئی بحثیں تاریخ جغرافیہ، آرکیالوجی اور لسانیات کے ماہرین کے لئے موجبِ دلچسپی بن گئی ہیں اور چند موقعوں کے علاوہ زبان بھی تحقیقی ہی رہی ہے۔

اقوام ارض القرآن تین طبقات پر مشتمل ہیں اور پوری کتاب انھیں طبقات کے گرد گھومتی ہے۔

طبقۂ اولی۔ اُمم سامیہ سے متعلق ہے جس میں قومِ عاد، قوم ہود وثمود پر بڑی تفصیلی بحثیں شامل ہیں۔

طبقۂ ثانیہ۔ بنو قحطان۔ اس میں قوم سبا، اس کی تمام تفصیلات وجزئیات، حمیر تبع، حبش وغیرہ کا تذکرہ، یمن کا آخری سقوط اور ابرہہ کی تفصیلات کے علاوہ واقعۂ فیل کا سیاق وسباق بھی شامل ہے۔

طبقۂ ثالثہ۔ بنو ابراہیم و اسمٰعیل سے شروع ہوتا ہے اور اس میں محمد رسول اللہؐ کے خاندان قریش تک کی مفصّل تاریخ اور تمام نشیب و فراز بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں اسلام سے قبل تک عربوں کے مذاہب، مشاغل، السنہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں اور پوری دوسری جلد اسی طبقہ کو محیط ہے۔

طبقۂ اولیٰ میں قومِ عاد اُمم سامیہ کی اولین قوم قرار دی گئی ہے۔ لفظِ عاد کی تحقیق، اس کے عربی، عبرانی، قرآنی اور عمومی معنیٰ پر گفتگو کرنے کے بعد اس عام غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ "عاد" کسی شخص یا پیغمبر کا نام تھا، سید صاحب نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے لکھا کہ "عاد، ثمود، سبا، جرہم وغیرہ اکثر شخصی نام سمجھے گئے ہیں لیکن دراصل ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوموں اور قبیلوں کے نام ہیں اور "عاد" صرف ایک محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا۔ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو عرب ہی نہیں بلکہ دُنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی، ایشیاؔ و افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور و قوت کا تماشا گاہ تھا۔۔۔۔ یہ لوگ یونان و کریٹ پر بھی حاکم و متمدن تھے"۔

قومِ عاد کے زمانے اور دائرہ حکومت کا تعین تحقیقی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عرب قدیم کی تاریخ کے اس دور میں جہاں دھندلکوں اور ابہام کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا ہو، محض قیاسات کی بنیاد پر کچھ ٹھوس اور مفید نتائج برآمد کر لینا خاصا مشکل کام ہے۔ سید صاحب نے قرآن سے روشنی حاصل کر کے عرب کی قومِ عاد کے بعض تاریک پہلوؤں کو بڑے تحقیقی ڈھنگ سے اجاگر کیا ہے۔ عاد کے مقام اور حدود سلطنت پر بھی بصیرت افروز اظہار خیال کیا گیا ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ ۴۰۰۰ ق م سے ۱۹۰۰ ق م تک یہ لوگ کب اور کس طرح بیرونِ عرب بابل، مصر اور دیگر ممالک میں پھیلتے رہے اور یہ بھی کہ انھیں فتح و شکست کا سامنا بھی مختلف جگہوں پر کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں صرف بابل سے متعلق سید صاحب کی تحقیق کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے کہ موضوع زیر بحث سے متعلق تمام موجود کتبات کا جائزہ لے کر وہ کس طرح ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

"ارضِ بابل کے اس عہد کے تمام کتبات بہ ترتیب رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے

کہ ۴۰۰۰ ق م کی ابتداء میں قدیم سومری الفاظ کے بجائے ان میں سامی الفاظ کی آمیزش شروع ہوتی ہے اور یہ آمیزش و اختلاط رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے تاآنکہ الفاظ، خط، خیالات بالکل سامی ہو جاتے ہیں اور ایک مدت تک کتبات بالکل سامی رہتے ہیں پھر ایک زمانے کے بعد سومری کتبات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس کا خاتمہ ایک اور تورانی النسل زبان عیلام پر ہوتا ہے جس کا وطن خلیج فارس کا فارسی ساحل تھا۔ پھر ایک زمانے کے بعد ۲۵۰۰ ق م میں زبان بالکل سامی ہو جاتی ہے اور بعد ازاں ایک مرکب و متحد زبان کی صورت نظر آتی ہے۔ اس طرح ان دونوں قوموں کے عروج و زوال ہوتے رہنے کے بعد آخر میں مشترک وطنی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے"۔ (جلد اول ص ۱۲۶)

ہر عروج را زوالے، ایک وقت آیا جب عاد کو اپنی قوت و جبروت پر کبر و زعم ہو گیا اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃ کہتے رہے۔[1] ظلم و جور اور نکیر الٰہی پر اتر آئے، تمام برائیاں اور اخلاقی تنزل شدید تر ہو گیا تو ان کے پیغمبر نے وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا کی وعید سنائی لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوا اور وہ، اس حد تک گر چکے تھے جہاں پہنچ کر خدا کا غضب قوموں پر بھڑکتا ہے اور خدا ان کو نیست و نابود کر دیتا ہے"۔ بالآخر خدا نے انھیں سخت سزا دی۔

> "ہم نے ان پر منحوس دنوں میں بادِ صرصر بھیجا تاکہ ہم ان کو عذاب ذلت کا اسی زندگی میں چکھائیں اور عذاب اخروی سب سے زیادہ ذلت والا ہے"۔[2]

جب ان کو بادِ صرصر کا عذاب ایک بادل کی صورت میں جس کا رخ اُن وادیوں کی طرف تھا، نظر آیا۔ بولے یہ ہم کو سیراب کرنے والا بادل ہے، نہیں بلکہ یہ وہ ہے جس

---

[1] اور اپنے زعم میں یہ بھول گئے اولم یروا ان اللہ الذی خلقہم ھو اشد منہم قوۃ (کیا وہ یہ نہ سمجھے کہ خدا نے ان کو پیدا کیا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ قوی ہے)

[2] حم السجدہ

> کی اے گنہگارو تم کو جلدی تھی، یہ ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے، اپنے خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے پھر وہ ایسے نیست و نابود کر دیئے گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ باقی نہ رہا!![1]

> لیکن عاد تو وہ تند باد صرصر سے برباد کر دیئے گئے خدا نے جڑ کاٹنے والی سات رات اور آٹھ دن تک ان پر اس ہوا کو لگا دیا۔ تم دیکھتے ہو اس ہوا میں اس قوم کو افتادہ جیسے وہ کھوکھلے درخت کی جڑ تھے کیا اب ان میں کا کوئی تم کو زندہ نظر آتا ہے۔"[2]

قوم عاد عام طور سے تباہ ہو گئی لیکن وہ لوگ جو اس کے پیغمبر ہود پر ایمان لائے وہ اس عذاب سے محفوظ رہے اور انھوں نے ترقی کرتے کرتے ایک عرصہ کے بعد دوبارہ حکومت قائم کر لی۔ انھیں نیک بادشاہوں میں سے ایک کا نام "لقمان" تھا۔

سید صاحب نے ایک کتبہ کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ لقمان اور مشہور عام حکیم لقمان ایک ہی شخص کا نام ہے۔ وہ افریقی الاصل نہیں بلکہ عرب تھا۔ ایک خاص قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ، نیک و منصف بادشاہ اور عظمت و شوکت میں سبا کا مدِمقابل تھا۔ اس کا صحیفۂ حکمت مشہور تھا جسے لوگ کچھ سیکھنے کے لئے بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ اس کتبہ میں وہاں کی رعایا کی زبانی یہ الفاظ۔

> "ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔" (ص ۱۸۰)

دیکھ کر اور لقمان سے متعلق دوسرے ذرائع کی معلومات سے یہ باور کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے اور سید صاحب نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ یہ اچھے فیصلے "مجلہ لقمان" ہی میں لکھے جاتے تھے

---

[1] قرآن احقاف

[2] الحاقہ

[3] عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈر سے ایک انگریز ولسٹڈ نے ۱۸۳۴ء میں اسے دریافت کیا تھا۔

اور قرآن میں لقمان کے بیٹے کے لئے باپ کی جو نصیحتیں[1] بیان کی گئی ہیں وہ اسی صحیفۂ لقمان سے اخذ کی گئی ہوں گی۔

قوم عاد کے بعد ایک مثال قوم سبا سے بھی پیش کی جاتی ہے، اس کے دائرۂ حکومت کے متعلق سید صاحب نے لکھا ہے کہ

> «سبا کا اصلی مرکز حکومت جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ اس کا دار الحکومت شہر مارب تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا اور چونکہ یہ ایک باخبر قوم تھی اس لئے بہت سے بحری اور تجارتی راستوں پر بھی اس کو قبضہ کرنا پڑا تھا۔ اس سلسلے میں شمالی عرب میں سبا کی حکومت نظر آتی ہے اور افریقہ میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ حبشہ میں اذینہ کا ضلع سبا کے ماتحت تھا۔ اس ضلع پر معافر" کے لقب سے ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا۔ یمن سے براہِ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی راستہ تھا یہ بھی ان ہی کے قبضہ میں نظر آتا ہے اور اس پر جا بجا ان کی نو آبادیاں قائم معلوم ہوتی ہیں۔
>
> اسیریا (عراق) کے بادشاہ سرجون کے ایک کتبہ میں جو ۷۱۵ ق م کا ہے شمالی عرب کے چند قبائل کا ذکر ہے۔ ان میں ایک کا نام "یثمر سبائی" ہے۔ یہ سرجون کو خراج دیتا ہے، سرجون کا یمن تک آنا آثار سے ثابت نہیں ہے۔ اس لئے لامحالہ خود سبا کا گزر وہاں تک ہوا ہو گا اس واقعہ سے سبا کی حکومت کا رقبہ شمالی عرب میں عراق تک ثابت ہوتا ہے اور سبا کی حکومت کا ان اطراف میں بھی سراغ ملتا ہے۔»[2]

بنو ابراہیم کے سلسلے میں بھی سید صاحب نے ایک ابہام اور بڑی غلط فہمی کو دور کر کے بہت سادگی اصل نکتہ کر دیا ہے۔ بنو قحطان اور بنو اسمٰعیل میں مؤرخین

---

[1] سورۂ لقمان رکوع ۲

[2] ارض القرآن ص ۲۳۵

نے خلط مبحث کیا ہے، سید صاحب کی عادت ہے کہ ایک حقیقت پسند اور اولوالعزم محقق کی طرح اصل اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس سے کم پر مطمئن نہیں ہوتے یہ خصوصیت یہاں بھی برقرار رہی ہے۔ ان دونوں قبیلوں پر موافق اور مخالف مواد پیش کرکے اس کا پس منظر بیان کیا ہے اور بُعد زمانی کی تفصیل پیش کرنے کے بعد دونوں قبیلوں کی امتیازی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ” قحطانی اور اسمٰعیلی خاندانوں میں تمیز کرنا نہایت آسان ہے۔ جنوبی عرب عموماً بنو قحطان کا مسکن ہے اور شمالی بنو اسمٰعیل کا۔ بنو قحطان کی زبان سبائی و حمیری ہے، بنو اسمٰعیل کی عدنانی و نباتی اول کا خط تحریر مسند ہے اور ثانی کا نابتی دونوں کے نام کا طریقہ، مذہبی تخیل اور دیوتاؤں کے نام بالکل مختلف ہیں۔

اس اسمٰعیلی سلسلے کو آگے بڑھا کر رسولِ اکرمؐ کے قبیلہ قریش تک کی تمام ممکنہ جزئیات بیان کی گئی ہیں اور قریش میں حضور کے خاندان بنو ہاشم کے مقام کا تعین کیا ہے اسی ضمن میں یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ کعبہ کے بانی حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کے وارث و متولی قبیلۂ قریش کے بنو ہاشم اور ان کے بیٹے عبدالمطلب ہوئے۔ اسی وراثتِ ابراہیمی کو رسولِ اکرمؐ کے ہاتھوں دائمی افضلیت عطا ہوئی۔

” عربوں کی جہاز رانی “ اور عرب و ہند کے تعلقات میں سید صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ عرب اپنے طبعی و جغرافیائی حالات کے سبب تاجر اور بحری تاجر بننے پر مجبور تھے، تجارت ان کا اصل و معزز پیشہ تھا۔ قریش اور بنو ہاشم کا بھی پیشہ تھا خود حضور نے بھی ابتداءً یہی پیشہ اختیار کیا اس لئے قبل از اسلام عربوں کی تجارت پر تفصیلی اظہار خیال کیا گیا ہے اسی طرح عرب کی زبانوں کا جائزہ لیتے ہوئے عربی زبان کو سامی زبانوں کی ماں ” اُمّ الالسنۃ “ قرار دیا ہے اور دوسری جلد کی آخری بحث عرب میں اسلام سے قبل رائج مذاہب پر محققانہ تبصرہ اور قرآن سے ان کی مطابقت یا اختلاف دکھلانے کی کوشش پر مبنی ہے۔

سید صاحب نے اپنے اصول کے مطابق آنکھ بند کرکے نہ کسی چیز کو قبول کیا ہے اور

نہ ہی اس سے صرف نظر کیا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ تنقید سے نہیں چوکتے، خواہ کوئی موقع ہو قحطانی اور اسمٰعیلی قبیلوں کو اسمٰعیلی قبیلہ میں مدغم کرکے صرف ایک قبیلہ کی حیثیت تسلیم کرنے پر بڑے بڑے محققین اور مؤرخین متفق ہو گئے ہیں یہاں تک کہ امام بخاریؒ جیسے ثقہ و محدث بھی "باب نسبۃ الیمن الی بنی اسماعیل" قائم کرکے قحطانی و اسماعیلی میں زیادہ واضح نظر نہیں آتے ہیں۔ علمائے انساب میں زبیر بن بکار اور ابن اسحاق کی بھی یہی رائے ہے لیکن سید صاحب نے سب کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لے کر جہاں اصلاح کی ضرورت پڑی وہاں اصلاح کر دی اور بہت صاف ستھرے اور سادہ لہجہ میں اپنی بات واضح کر دی ہے۔

اس طرح بعض ان مافوق الفطرت باتوں کو جن کی صراحت قرآن مجید میں نہیں ہے، قبول کرنے میں سید صاحب نے تامل کیا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت (۱۹۱۶ء) سید صاحب پر تعقل پسندی کا غلبہ تھا اور وہ اسلام کے ہر مسئلہ کو عقل کی رو سے بہترین ثابت کرنے میں کوشاں تھے۔ اس جذبہ کی شدت نے ائمۂ فقہ و حدیث پر علمی تنقید کی بھی گنجائش نکال لی مذکورہ قحطانی و اسمٰعیلی قبائل کی بحث میں علامہ ابن حجرؒ ابن اسحاق اور زبیر بن بکار کے بیانات کو مبالغہ آمیز بتانے کے علاوہ امام بخاری سے بھی اختلاف رائے کیا ہے۔ ایک دوسری جگہ قوم ثمود کے پیغمبر حضرت صالح کے ذریعہ گناہگار، ظالم اور کافر قوم کو عذاب خداوندی سے ڈرانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کے تذکرہ کے دوران کتابوں کے اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر نے آخری بار پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور خدا کے حکم سے ایک اونٹنی چھوڑ دی کہ ایک حصّہ کا پانی یہ پیئے گی اور اپنے حصے میں سے قوم کے لوگ پیتے رہیں اس کو نہ پریشان کیا جائے نہ اس پر ظلم کیا جائے پھر بھی نوفادی باہر نکلے اور انھوں نے اونٹنی کی کونچلی کاٹ ڈالی، اس کے بعد بالآخر ان پر عذاب آگیا۔

اس اونٹنی کے متعلق یہ روایت ہے کہ یہ چٹان سے برآمد ہوئی تھی، سید صاحب

اس کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے فیصلہ پر قرآن سے ہی استدلال کرتے ہیں۔

> "عام روایات میں ہے کہ یہ اونٹنی مع اپنے بچہ کے کفار کے حسب طلب حضرت صالحؑ کے ایک معجزہ سے ایک پہاڑ چٹان سے پیدا ہوئی تھی لیکن صحیح طریقہ سے یہ روایت ثابت نہیں، قرآن مجید نے بھی اپنی تمام تفصیل میں اس خاص طریقۂ پیدائش کا ذکر نہیں کیا اس بنا پر وہ غیر مسلم ہیں۔"

اس کے برخلاف یہی صاحب "ارض القرآن" اس بات کو بہ اصرار تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس ہُدہُد پرندے کے بولنے کا ذکر ہے[1] اپنی صراحت کی وجہ سے وہ درست ہے اور جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہ کرکے اس پر تاویلیں کی ہیں، خصوصاً سر سید نے تہذیب الاخلاق میں ایک موضوع پر ہُدہُد پرندے کے بولنے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ کسی پرندہ کا نام نہیں بلکہ اس زمانے میں عام رواج کے مطابق ہُدہُد کسی شخص کا نام ہوگا جس نے ملکۂ سبا کی داستان حضرت سلیمان سے آکر بیان کی تھی لیکن سید صاحب کا کہنا ہے کہ

> "بلاشبہ اس زمانہ میں اشخاص کے یہ نام تھے لیکن قرآن کے لفظ تفقد الطیر (پرندوں کا جائزہ لیا) کا کیا جواب ہوگا۔ میری رائے میں اب جب کہ جانوروں کی عاقلیت کا مسلم ہوتا جاتا ہے، بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی ہے تو ہدہد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو؟ "طیر" کے معنی فوج کے لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سر سید کا سورۂ فیل کی تفسیر میں طیر سے فال بد لینا۔"

واقعۂ فیل کا ذکر آگیا ہے تو اس سلسلے میں بھی مصنف کے متوازن تبصرہ پر نظر ڈالنا غیر مناسب نہیں۔ لکھتے ہیں کہ ۵۷۰ء میں ابرہہ نے مکہ پر فوج کشی کی اور ایک موقع پر غصہ سے بپھر گیا اور چند ہاتھیوں کے ساتھ ایک بڑی فوج لے کر کعبۂ ابراہیمؑ کو

---

[1] سورہ نمل رکوع ۲ میں پوری تفصیل موجود ہے۔

ڈھانے نکلا راستے میں تمام مد مقابل فوجوں کو شکست دیتا ہوا وادیٔ مکہ کے قریب پہنچا۔

> "دفعتاً کسی سمت سے پرندوں کا غول در غول نمودار ہوا، ان کے منہ اور پنجوں میں کنکریاں تھیں، یہ کنکریاں جس پر گریں اس کا بدن پھوڑ کر نکل آئیں، اعضا سڑنے گلنے لگے۔ ہاتھی چنگھاڑ مار مار کر پیچھے ہٹ گئے۔ چند منٹ میں لشکر زیر و زبر ہو گیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ عرب میں چیچک کی بیماری اسی سال پیدا ہوئی"۔

اس کے بعد سورۂ فیل کا ترجمہ لکھا ہے اور موضوع زیر بحث (وارسل علیہم تا ماکول) کے متعلق ترجمہ میں لکھا ہے کہ "اس (خدا) نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے، وہ پرندے پتھر مارتے تھے پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی مانند کر دیا"۔ اس کی تفسیر کا استدلال اور معقولیت بھی قابل ذکر ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "پرندوں کا پتھر برسانا اور اس سے ایک فوج کا ہلاک ہو جانا تعجب انگیز واقعہ ہے لیکن محال نہیں۔ ممکن ہے کہ ان کنکریوں میں چیچک کے وبائی جراثیم ہوں۔ اس واقعہ کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ یہ سورۂ اس واقعہ کے تقریباً پچاس برس بعد نازل ہوئی۔ اس وقت بہت سے اشخاص حملہ حبش کے چشم دید گواہ موجود ہوں گے۔ بعض لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے بزرگوں سے اس واقعہ کو سنا ہوگا (اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑے بڑے کفار و مشرکین اور حضور کے دشمن موجود تھے) تاہم کسی نے اس وحی الٰہی کی تکذیب نہ کی۔

سرسید نے اس سورۃ کی جو تفسیر تہذیب الاخلاق میں لکھی تھی اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی وہ سرتاپا لغو اور اغلاط سے مملو ہے۔ عربی زبان میں طیر کا لفظ "بدفالی" اور کنایتہً "بلا" کے معنی میں کبھی نہیں آئے وہ طائر کا لفظ ہے اور ایسے مزعومات عرب کے مطابق "فال بد" مراد ہوتی ہے "فال بد" کے معنی میں ارسال کے ساتھ بھی اس

لفظ کا استعمال نہیں ہوا ہے"۔ (ص ۳۱۴)

ایک ہی واقعہ سے متعلق مختلف مقامات اور افراد کے ناموں اور مختلف طبقات کا باہمی مقابلہ و موازنہ کرکے تحقیقی پیش کش کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی مثالیں ہر جگہ موجود ہیں۔ کتاب کے صفحات میں متعدد مواقع پر بہ تقابلی چارٹ درج کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جانب داری اور یک طرفہ فیصلہ مصنف کی تحقیقی شان کے منافی ہے، توریت، زبور، انجیل وغیرہ کی تمام روایتوں کو نہ تو یک قلم رد کرتے ہیں اور نہ آسانی سے قبول کر لیتے ہیں بلکہ ان کی جغرافیائی اور اثری معلومات و اکتشافات کو ہر لحظہ قابلِ غور اور ان کی صحت کی صورت میں قابلِ تسلیم سمجھتے ہیں! البتہ اُن کے مذہبی مفکرین کی تحریف شدہ عبارت اور مبالغہ آرائی کو قابلِ استناد تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح قرآن پاک (پر ہی اگرچہ یہ کتاب لکھی ہے لیکن ہے کے سلسلے میں تاثراتی اور مبالغہ آمیز گفتگو سے احتراز اور محتاط انداز بیان اختیار کیا گیا ہے، اعتدال و توازن ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر استدلال کے نہ کوئی بات رد کی گئی ہے نہ قبول بلکہ بعض مسائل میں تو سولہ سترہ دلائل اور اس سے بھی زیادہ ممکنہ معلومات پیش کرکے کسی فیصلہ کے لئے خود قاری کے ذہن کو تیار کرتے ہیں، سطحیت کا کہیں گذر نہیں ہے، مزید برآں اپنے خیال کو زیادہ قوت اور طاقت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے حسب ضرورت جغرافیائی نقشوں کو بھی جزو کتاب بنایا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں مختلف شہروں اور علاقوں اور وہاں پر اقوام کی حکومت کا تعین کرنے کے لئے بھی نقشوں سے مدد لی گئی ہے۔

تحقیق میں ہمیشہ اختلاف رائے کی گنجائش رہتی ہے۔ سید صاحب بھی اس سے مبرا نہیں ہیں تشنگی اور ابہام کا بھی شکار ہوئے ہیں اور غیر ضروری جزئیات کی پیش کش سے بیان میں طوالت بھی پیدا ہوئی ہے لیکن کافی وزنی ثبوت و دلائل اور شستہ زبان کے استعمال کے بغیر سید صاحب کہیں بھی آگے نہیں بڑھتے اور اسی وجہ سے ان کی یہ تحقیق معتبر و مستند اور نادر کہی جا سکتی ہے۔

تحقیق، صاف، سادہ اور منطقی لیکن شستہ زبان کی متقاضی ہوتی ہے۔ ہمارے بعض محققین زبان کو اتنا زیادہ سپاٹ اور محض منطقی کر دیتے ہیں کہ ان کی تحقیق خشک

اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے، یہ مناسب نہیں ورنہ وہ تحقیق جو برسہا برس کی کاوش کا نتیجہ ہو اور پھیکی و منطقی زبان کا کشکول ہو، غیر مفید رہتی ہے اسی لئے زبان میں شستگی اور حسبِ ضرورت شیرینی ضروری ہے۔ سیّد صاحب کو زبان پر قدرت ہے اور اظہارِ خیال کا طریقہ معلوم ہے۔ ان کی تحقیقی زبان عموماً سادہ، شستہ و منطقی ہی ہوتی ہے، ارض القرآن کی زبان کا بھی یہی حال ہے البتہ جہاں جذبات کی فراوانی سے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں وہاں زورِ بیان، شوکتِ الفاظ اور بلند آہنگی بھی ان کی تحقیق میں جگہ پا لیتی ہے۔ مثلاً ارض القرآن کے مقدمہ کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے:

> "آج مسلمانوں کا وطن تمام دنیا ہے تاہم مولدِ اسلام، موطنِ رسالت مہبطِ قرآن دنیا کا صرف ایک ہی گوشہ ہے یعنی عرب، جس کو مادی زرخیزی کی محرومی نے گو "بن کھیتی کی زمین" (وادیٔ غیر ذی زرع) کا خطاب دیا ہے لیکن جس کی روحانی سیر حاصلی کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ آج دنیا میں جہاں بھی روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے اسی کشت زارِ الٰہی کے آخری کسان کی تخم ریزی و آب یسری کا نتیجہ ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں

> "تمام قوموں کی پچھلی تاریخ شاہد ہے کہ کبھی بدبختی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ایک جماعتِ قلیل کے سوا عموماً اس کی آواز ہر طبقہ میں غیر مسموع ہوتی ہے اور جو سنتے ہیں وہ سمجھتے نہیں اور جو سمجھتے ہیں وہ عامل نہیں اور نتائج صرف عمل پر موقوف ہیں۔ اس وقت خدا کا غضب تلواروں میں چمک کر، آسمان سے گرج کر یا زمین سے پھٹ کر ظاہر ہوتا ہے اور دوسری قوم کے لئے پہلی قوم کی جگہ صاف کر دیتا ہے۔"
>
> اب وہ وقت آگیا کہ اس عظیم الشان اور عظیم الجبروت قوم کو جس نے اپنے زورِ قوت سے دنیا کو ہلا دیا تھا۔ آخری دعوت دی جائے۔"

سید صاحب کی زبان بعض مباحث میں بڑی اصلاحی اور فلسفیانہ بھی ہو گئی ہے۔ دوسری زبانوں سے براہِ راست استفادہ کے علاوہ ان اجنبی زبانوں مثلاً عبرانی وغیرہ سے الفاظ

بھی کہیں کہیں اسی مخصوص رسم خط میں نقل کئے ہیں کہیں لفظی تحقیق سے ایسا ظاہر ہونے لگتا ہے جیسے قواعد زبان پر اظہارِ خیال کیا جا رہا ہو۔ مثلاً

> "بعض داستان گو مفسرین نے "ارم"، (ارم ذات العماد۔ الفجر) سے ایک عجیب الخلقت باغ مراد لیا ہے جس میں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں اور لعل و گوہر کی پچہ کاری تھی۔ عاد کے بادشاہ شداد نے اس کو بہشت کے مقابلہ میں بنوایا تھا لیکن یہ دانشمند یہ نہ سمجھے کہ اس حالت میں عاد اور ارم میں باہمی نحوی تعلق کیا ہو گا۔ مشہور قراۃ میں یہ بدل مبدل منہ ہیں۔ شاید وہ مضاف و مضاف الیہ کی ترکیب قرار دیتے ہوں لیکن اس حالت میں قراۃ شاذہ کے لزوم کے علاوہ قافیہ جس کا نظم قرآن مقتضی ہے، باطل ہوتا ہے"!

بعض جگہ خطیبانہ استفہامیہ کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں اور وہ فیصلہ کن جملے ہوتے جو سادگی کے بجائے قصداً" استفہامی لہجہ لئے ہوتے ہیں"۔ کیا بہ بجز حقیقت کچھ اور ہے۔"[۲]

> "نہر فرات سے بحر ہند تک عرب کے سوا کوئی اور ملک ہے؟"

> "کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے، یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ "صحیفۂ لقمان"، لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے" وغیرہ۔

یہ دراصل خطابت کے ساتھ ساتھ قرآن کے اس استفہامیہ انداز سے استفادہ و تقلید کی بھی کوشش ہے جو وہ تمام باتیں اور نشانیاں بیان کرنے کے بعد آخر میں کہتا ہے افلا تعقلون، افلا تبصرون، افلا تذکرون!

عرب و ہند کے تعلقات

ہندوستان کی تاریخ نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس وقت سے انگریزوں کی حکومت تک بیشتر ادوار میں ہم یہاں غیر ملکی حملہ آوروں کو حکومت کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہاں کے اصل باشندے دراوڑ اور ان کے سابقین تھے۔ وسط ایشیا کے میدانوں سے اُٹھنے والے آریہ حملہ آوروں نے دراوڑوں کو شکست دے کر جنوب میں دھکیل دیا اور یہاں حاکم و قابض بن بیٹھے۔ تاریخ کے اوراق پلٹتے چلے جائیں، ہر نیا موڑ اس کے مماثل واقعہ کا نتیجہ یا پیش خیمہ ہوتا ہے یہاں تک کہ عربوں کا حملہ، غزنوی کے حملے و فتوحات، غوریوں کے مقبوضات، افغانیوں کی بالادستیاں، مغلوں کی سلطنت اور سب سے آخر میں انگریزوں کی غلامی تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس سیاق و سباق میں ہندوستان کی موجودہ حکومتوں کو بھی غیر ملکیوں کی مشترک حکومت کہنا غلط نہ ہوگا کیوں کہ اس کا خمیر بھی آریہ اور مسلمانوں کی ترکیب اور انگریزی مزاج سے تیار ہوا ہے۔ اگر فی الوقت یہ اربابِ اقتدار دیسی ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں تو عہدِ ماضی میں بھی کبھی اس دعوٰی سے انحراف نہیں کیا گیا، اگر مثال کے لئے صرف مغلوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عملی طور پر انھوں نے اس ملک کی جو خدمات انجام دیں وہ اپنے کو ودیشی سمجھنے والی کسی بھی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہے۔

عہدِ حاضر کے ہندوستانی مزاج کو بدلنے میں سب سے اہم کردار انگریزوں کا رہا ہے ورنہ گذشتہ آٹھ صدیوں کی تاریخ و واقعات کو اٹھا کر دیکھا جائے تو سمندروں کے راستے

ہندوستان کے سب سے زیادہ اور سب سے اچھے تعلقات عربوں سے رہے ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سراندیپ (لنکا) جو ماضی میں ہندوستان کا حصّہ تھا۔ اس پر حضرت آدم کو جنت سے اتارے جانے اور یہاں ان کے نقشِ قدم کی موجودگی کے تصوّر کے باعث مسلمان اس کو اپنا "پدری وطن" سمجھتے رہے ہیں، اسی جذبۂ وطنیت نے انھیں ہندوستان سے بہترین تعلقات استوار رکھنے پر ہمیشہ مجبور رکھا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل دونوں خطوں میں تجارتی سطح پر تعلقات زیادہ مستحکم تھے، طلوعِ اسلام کے بعد ان میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔ اسی تجارتی سلسلہ میں مختلف مواقع پر انھوں نے سندھ اور جنوبی سواحل پر حملے و قبضے کئے اور چار سو سال تک ہندوستان کے متعدد صوبوں میں حاکم و محکوم دونوں صورتوں میں وہ امتیازی حیثیت سے رہتے تھے جس کے ثبوت میں عصری تاریخ کے صفحات بلکہ دفتر موجود ہیں۔ محمود غزنوی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ کا آغاز محمود کے حملوں سے دکھانا تاریخ کے ساتھ ناانصافی اور بدنیتی ہے۔ ہندوستانی مؤرخین کی یہی وہ ذہنیت و مزاج ہے جس کو اپنے خاص مقاصد کے تحت، انگریزوں نے بڑی محنت اور سلیقہ سے تیار کیا تھا اور ہندوستان میں ہندو مسلم اختلاف و نفرت اور نفاق کو فروغ دینے کی اتنی کامیاب کوشش کی کہ ہر آئندہ نسل کا ذہن سابقہ نسل سے زیادہ مسموم ہو رہا ہے۔ بڑے سائز کے ۳۰۴ صفحات کی ضخیم کتاب "عرب اور ہند کے تعلقات"، عربوں اور مسلمانوں کے ہندوستان سے روابط کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک اہم کوشش ہے۔ یہ مولانا سلیمان ندوی کے ان پانچ خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۲۲۔ ۲۳ ر مارچ، ۱۹۲۹ء کو ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد میں پیش کئے تھے۔ اکیڈیمی نے اسے ۱۹۳۰ء میں عنوان بالا کے ساتھ ٹائپ میں طبع کر کے شائع کیا تھا۔

تمہید میں مصنف نے اس کتاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "ایک علمی حقیقت کے اثبات کے علاوہ اس سے یہ بھی غرض تھی کہ ملک کے ہندو مسلمان دونوں عنصروں کو ان کا وہ زرین عہد یاد دلاؤں جب دونوں گوناگوں اتحاد کے رابطوں اور سلسلوں سے جکڑے تھے۔

> ہمارا یقین ہے کہ ملک کی نفاق انگیز صورتِ حال کی سب سے بڑی ذمہ داری ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تاریخ پر ہے اس لئے ہمارے قومی مورخوں کا فرض سب سے بڑا اور سب سے اہم ہے۔"

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش میں انگریز سب سے پہلے کامیاب ہوئے تھے اس کے بعد اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا لیکن ۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کے واقعہ کے بعد تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک نے ہندو مسلم اتحاد کی وہ فضا پیدا کر دی تھی جس سے انگریزی حکومت بڑی حد تک خوفزدہ ہو گئی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی انھوں نے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں تاریخ کی ایسی کتابیں لکھوا کر شامل کی تھیں جن کے مطالعہ کے بعد ہندو اور مسلمان بچوں کے درمیان نفرت کی دیواروں کا کھڑا ہو جانا لازمی تھا اس کے باوجود ۱۹۲۰ء میں ہندو مسلمانوں کا انگریزوں کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر خون بہانے کا عزم ان کے لئے باعثِ حیرت تھا لیکن اس حیرت نے ان کی مذکورہ بالا تاریخی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کے بجائے ایک متحرک قوم کی طرح مزید محنت و مشقت پر آمادہ کیا۔ ہندو مسلم اختلافات کی ان کی کوششیں مضاعف ہوتی گئیں اور تین سال کے بعد ہی ۱۹۲۲ء میں بھائی چارگی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا یہ شیرازہ منتشر ہو گیا، ترکِ موالات ختم ہو گئی انگریزوں کی کوششیں بار آور ہوئیں، ہندو مسلم اختلافات منافرت کی حدوں سے گزرنے لگے اور انگریزوں کو قدرے سکون کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع مل گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی خلافت کے روزِ اول سے میدانِ سیاست میں امتیازی حیثیت کے ساتھ نمودار ہو گئے تھے۔ تاریخِ ہند اور تاریخِ اسلامیہ پر وہ حَکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ اس شعبہ کے کنوینر بھی رہ چکے تھے جو اسکولوں کی تاریخ کی کتابوں میں انگریزوں کی پیش کی ہوئی غلطیوں اور گمراہ کن انکشافات کا راز فاش کرنے اور ان کی تصحیح کے لئے ندوہ میں قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کے ان عزائم سے وہ شروع سے ہی بہت قریب سے واقف تھے۔ وفدِ خلافت کے ساتھ لندن جا کر بھی انھوں نے یہی برتاؤ دیکھا اور تحریکِ خلافت

کے زمانے میں انگریزوں کی اس طرح کی کوششوں اور بعد میں ان کے نتائج سے بھی وہ با خبر ہی نہیں تھے بلکہ خصوصی دلچسپی بھی لیتے رہے اسی لئے معارف میں ہندو مسلم اختلافات پر گفتگو کرتے ہوئے "مرض کی تشخیص اور علاج" کے عنوان سے ۱۹۲۴ء میں انھوں نے ایک اہم مضمون لکھا تھا جس میں اختلافات کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ان نصابی کتابوں کو اس کا موجب قرار دیا تھا۔ اس کے بعد سے برابر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی بھی صورت سے ہندو یہ سمجھ لیں کہ مسلمان ہمیشہ سے حملہ آور اور ظالم کی حیثیت سے ہندوستان پر مسلط نہیں ہوئے ہیں بلکہ عرب و ہندوستان کے تعلقات تو اسلام سے پہلے بھی خوشگوار تھے اور اسلام کی آمد کے بعد جن مسلم حکمرانوں نے سندھ وغیرہ پر حکومت کی تو شبہ اہل کتا کی حیثیت دے کر محض جزیہ کی بنیاد پر ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا ہے۔

۱۹۲۹ء میں سید صاحب کو اس کا موقع ملا کہ وہ اپنے ان خیالات کو مرتب و منظم شکل میں ہندوستان کے سامنے پیش کر سکیں یہی "عرب و ہند کے تعلقات" کی اصل روح ہے۔ یہ کتاب بہت کم جذباتی ہے، خالص علمی، تاریخی و تحقیقی رنگ لئے ہوئے ہے اور اس کا طریقۂ کار بھی سائنٹیفک ہے جس میں بالعموم موضوع سے لاتعلقیت خاص اہمیت رکھتی ہے اور بقول مصنف "تمام واقعات اور مواد عربی کی معتبر، نادر، مستند کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں"۔ اگرچہ اس کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس کا انڈیکس اور اشاریہ نہیں ہے تاہم ابواب کے آغاز میں ان اہم ماخذ کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے جن سے اس کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔

کتاب پانچ خطبات و ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عرب و ہند کے تعلقات کے آغاز پر گفتگو کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ تجارتی تعلقات تو بہت پہلے شروع ہو چکے تھے اور "عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر و شام کے ذریعہ یورپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان جزائر ہند اور جاپان و چین تک لے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی ابتدائی تحریریں سامی رسم خط کی طرح دائیں سے بائیں جانب کو لکھی جاتی تھیں، یاتی

زبان کے مذہبی احکام، اشوک کے کتبات (۲۵۳ ق م) میں اسی رسم خط میں ہیں جسے آرین پالی کہا جاتا ہے ایک اور ہندوستانی ماخذ سے ان تعلقات کی سند پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

> "سوامی دیانند نے "ستیارتھ پرکاش" میں مہابھارت کے زمانے میں عربی زبان جاننے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
>
> مہابھارت میں جب کوروں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو وروجی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو عربوں اور ہندوؤں کا رشتہ کتنا پرانا ثابت ہے۔" (عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۱)

عربوں سے پہلے ہندوستان کا بحیثیت ملک کوئی نام نہیں تھا، الگ الگ ریاستیں اور صوبے اپنے اپنے ناموں سے پکارے اور سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے اس کا نام "ہندو" رکھا جو بعد میں "ہند" ہوا۔ انھوں نے سندھ کو بعینہٖ رہنے دیا اور بقیہ صوبوں کے مجموعہ کا نام ہند قرار دیا اور "ھ" کا حرف الف ہو کر فرنچ میں "اند" اور انڈیا بن کر تمام دنیا میں مشہور ہوا۔ یہی نہیں بلکہ عربوں کو یہ لفظ "ہند" اتنا پیارا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنی عورتوں کا نام یہی رکھا اور اس کی حیثیت فارسی کی لیلیٰ و شیریں کی سی ہے۔"

الغرض ان دہرے تہرے تعلقات کے سبب اسلام کے بعد ہندوستان کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ ان کو اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان کے کسی ساحل، بندرگاہ کی بھی تلاش تھی۔ چنانچہ انھوں نے تھانہ، سندھ، ملتان وغیرہ پر حملے کر کے قبضہ کر لیا اور محمد بن قاسم نے پورے سندھ میں نہایت عدل و انصاف کی سلطنت قائم کر دی۔ اس کے عدل کا اتنا سکہ بیٹھ چکا تھا کہ جب اس کو واپس بلایا گیا تو یہاں کے لوگ اس کے جانے پر روئے اور اس کی یاد میں بت بنا کر بھی کھڑا کیا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے تعلقات مزید مستحکم ہو گئے۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے ہندوستان آنے والے مورخوں، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی تصانیف اور سفرناموں میں ہندوستان کے مختلف حالات

پر جس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سب کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ ان میں ابن خرداذبہ ۲۵۰ھ کی کتاب المسالک والممالک، سلیمان تاجر کا سفرنامہ سلسلۃ التواریخ (۲۳۷ھ) ابو زید حسن سیرافی (۲۶۴ھ) بزرگ بن شہریار کی عجائب الہند (۳۰۰ھ) مسعودی کی تاریخ مروج الذہب (۳۰۳ھ) اصطخری کی جغرافیہ کی کتاب الاقالیم (۳۴۰ھ) ابن حوقل (۳۳۱ھ) بشاری مقدسی کی احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم (۳۷۵ھ) البیرونی کی کتاب الہند (۴۰۰ھ) ابن بطوطہ کا سفرنامہ عجائب الاسفار (۷۷۹ھ) وغیرہ غیر ملکی سیاحوں، مؤرخوں اور دانشوروں نے یہاں آکر اپنے مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں یہاں کے حالات قلم بند کئے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے یہاں آئے بغیر ہی دوسری معلومات کی بنیاد پر اپنی کتابوں میں ہندوستان کے حالات لکھے ہیں ان میں قدامہ ابن جعفر (۲۹۶ھ) بلاذری مصنف فتوح البلدان (۲۸۹ھ) ابن ندیم مصنف کتاب الفہرست (۳۸۰ھ) اور متاخرین میں عجائب البر والبحر کا مصنف دمشقی (۷۲۸ھ)، سسلی کا عرب جغرافیہ نویس ادریسی (۵۶۰ھ) ایران کا زکریا باقر (۶۸۲ھ) ابو الفدا مصنف تقویم البلدان (۷۳۲ھ)، یاقوت ۶۲۷ھ (مصنف معجم البلدان) مصر کا نویری ۷۳۳ھ (مصنف نہایت الادب فی فنون الادب' اور مسالک الابصار وممالک الامصار کا مصنف شہاب الدین عمری ۷۴۸ھ وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات کے عروج کمال پر روشنی ڈالی ہے۔ ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک جزیرہ نما اور صحرا ہونے کے سبب عرب کے لوگ بحری تجارت کے لئے ہمیشہ سے مجبور رہے ہیں، ان کے اس پیشہ کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد حضرت یوسف کو ہندوستان کے راستے مصر پہنچانے والے عرب تاجر ہی تھے یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچانے والا بھی عرب ملاح احمد بن ماجد تھا۔ عربوں کے بحری کمالات کی تفصیل اس باب کے علاوہ "عربوں کی جہاز رانی" میں بھی موجود ہے اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہاں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اہلِ عرب موتی، جواہرات، خوشبو صندل، کافور، لونگ، جائے پھل، کباب چینی، ناریل، سیاہ مرچ، زنجبیل، تیزپات اور دوسرے مسالے، کافور، مشک

زہر ("بیش") سیسہ، فولاد، تلوار، سن کے کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے، یہاں کے پھل، جانوروں میں مور، گینڈا، ہاتھی وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے مختلف جنوبی و شمالی شہروں سے خرید کر عرب لے جاتے تھے اور ہندوستان میں درآمد کے طور پر اشرفی، مصر سے زمرد کی انگوٹھی، مرجان، شراب، ریشمی کپڑے، پوستین کی تلواریں، فارس سے عرقِ گلاب، بصرہ سے کھجوریں اور دوسرے شہروں سے جنوبی ہند میں گھوڑے لائے جاتے تھے۔ یہ تمام تفصیل عہدِ قدیم کے مصنفین کے بیانات کی شہادت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ بعض چیزوں کو توریت اور قرآن سے بھی ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندی النسل عربی الفاظ کی فہرست پیش کی ہے جو ہندوستان کی اشیا کے نام تھے اور ان کی تعریب ہوگئی ہے۔ غرض بحری راستوں کے ذریعہ بیش قیمت سامان کی تجارت سے دونوں ملکوں کے پاس دولت کی غیر معمولی آمد و رفت تھی۔

تاریخی تحقیق کا ایک کارنامہ کتاب میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ سید صاحب نے مختلف و منتشر مقامات پر ہندوؤں کی موجودگی دکھا کر معتبر مآخذ کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس فن میں انھیں بہت کمال تو حاصل نہیں تھا لیکن ہندوؤں میں بعض بہت اچھے جہاز راں موجود رہے ہیں، ہندوؤں کی جہاز رانی کے بارے میں کبھی کسی نے کچھ نہیں لکھا اس نقطۂ نظر سے یہ حصہ زیادہ اہم ہوجاتا ہے۔

تیسرا باب علمی تعلقات پر مبنی ہے۔ ان تعلقات کا آغاز بنی امیہ کے زمانے سے ہوچکا تھا لیکن عباسی دور میں یہ روابط اپنے عروج کو پہنچ گئے۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے جسے عربی علم و فن کا عہدِ زرین کہا جاسکتا ہے۔ سلطنتِ عباسیہ میں برمکی خاندان بطورِ خاص اس میدان میں زیادہ ترقیوں کا سبب بنا۔ برامکہ سلطنتِ عباسیہ کے تمام ہی اہم عہدوں پر فائز اور نہایت علم دوست و علم پرور تھے۔ ایرانی النسل اور بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ برامکہ سے متعلق سید صاحب نے بہت اہم تحقیقات پیش کی ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ انھیں لوگوں نے ہندوستان سے پنڈتوں کو عراق میں بلوا کر دربار میں جگہ دی تھی۔ بدھ عالموں اور طبیبوں کو بغداد کے دارالترجمہ اور دارالشفاء میں مقرر کیا

نیز ہندوستانیوں میں دواؤں اور مذہبوں کی تحقیقات کے لئے ایک وفد بھیجا جس کی رپورٹ کے اقتباسات کتاب میں نقل کئے گئے ہیں۔ ہارون رشید نے اپنے علاج کے لئے بھی ہندوستان سے وید بلوائے تھے۔

سنسکرت کی کتابوں کے عربی ترجمے عباسی دور میں ۱۵۰ھ کے بعد باقاعدہ شروع ہوئے، اسی زمانے میں ایک ریاضی داں پنڈت سنسکرت کے سدھانت لے کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے حکم سے ایک درباری کی مدد سے اس نے اس کا عربی ترجمہ کیا۔ اس کے بعد برامکہ کی سرپرستی میں طب، نجوم، ہیئت، جوتش، رمل، جفر، سانپوں کا علم، زہروں کا علم شطرنج، چوسر، موسیقی کے تمام اقسام پر تصانیف، سیاست، جنگ، کیمیا، منطق و معانی و بیان، منتر، کرتب، جادو کہانی، داستانیں، اخلاق و حکمت کی کتابیں اور تمثیلیں مہابھارت وغیرہ تمام موضوعات سے متعلق کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔

> "الغرض خلیفہ منصور اور ہارون رشید کی سرپرستیوں اور برامکہ کی قدردانیوں اور فیاضیوں کی بدولت ہندوستانیوں کے بیسیوں پنڈت وید اور دوسرے علماء بغداد پہنچے اور سلطنت کے طبی و علمی محکموں میں معروف ہوئے اور حساب، نجوم طب، ادب و اخلاق ..... وغیرہ کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور طبیبوں کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ہندوستان سے جڑی بوٹیاں لائیں۔
>
> اہل عرب کا صریحی بیان ہے کہ انھوں نے ایک سے نو تک حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا اور اسی لئے اہل عرب اس کو حساب ہندی یا ارقام ہندیہ کہتے ہیں۔"[1]

اس باب کے آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ تنوخی اور بیرونی دو عربی فاضل محض علم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان آئے تھے اور البیرونی کی علمی کاوشوں سے ہندوستان کو لافانی فائدہ پہنچا ہے، وہ مجسم انسائیکلوپیڈیا تھا اور اس نے ہندوستانی علوم پر اتنی

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۳۶

کتابیں تصنیف کر دی تھیں کہ کسی واحد ہندوستانی کے لئے بھی اتنا سرمایۂ علم جمع کر دینا مشکل ہے۔

چوتھے باب میں مذہبی تعلقات کی تحقیق و تنقید اور ان پر تبصرہ ہے۔ شروع میں معترضینِ اسلام کے دو جملوں کا اشارہ و حوالہ دیئے بغیر جواب دیا گیا ہے۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد ہندوؤں کی مذہبی حیثیت کو نیست و نابود کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی، ان کے معبدوں کو منہدم یا اسلامی عبادت گاہوں میں تبدیل کر لیا گیا، دوسرا اعتراض یہ کہ مسلمان حکمراں اسلام کے نمائندے اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے دعویدار ہونے کے باوجود ایک غیر مسلم رعایا پر بے جا مظالم ڈھاتے رہے۔ سید صاحب نے دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ غوری، ترک، افغان فاتح جو ہندوستان میں آئے، خاص خاص افسروں یا عہدہ داروں کو چھوڑ کر قوم کی مجموعی حیثیت سے وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے اور نہ اُن کے اُصولِ سلطنت و صلح و جنگ کو اسلام کے طرزِ حکومت و اصولِ فرمانروائی سے کوئی مناسبت تھی۔ اُن کے تُرک افسر زیادہ تر نومسلم غلام تھے جنھیں خرید کر ہزاروں کی تعداد میں فوج میں اضافہ کیا جاتا تھا، رفتہ رفتہ یہ لوگ ترقی کرتے رہتے عہدے و مناصب حاصل کرتے اور حکمراں تک بھی بن جاتے تھے، الپ تگین، سبکتگین، التمش وغیرہ ایسی ہی مثالیں ہیں۔ یہ لوگ صرف نومسلم ہوتے تھے، اسلامی قوانین و اصولوں سے نابلد، اسلام کے نام پر کچھ بھی کر لیتے تھے۔ اسلامی روح سے بیگانہ اپنی پُرانی خصوصیات پر قائم رہتے، ان اسباب سے ان قوموں کے اس وقت کے طور طریق، اصولِ جنگ اور طرزِ عمل کو اسلام نہیں کہا جا سکتا۔"

اس کے برخلاف عرب فاتح جن میں سے بعض رسولِ اکرمؐ کے صحبت یافتہ بزرگ بھی تھے اور بیشتر صحابہ سے مستفاد، جو اسلامی عہد کی پہلی صدی میں عرب سے باہر دور تک پھیل گئے۔ وہ جب کہیں حملہ، قبضہ اور حکومت کرتے تو ان کا عمل خالص اسلامی رہتا، وہ کسی بھی دوسری محکوم قوم کے معابد کو ہرگز نقصان نہیں پہنچاتے تھے، نہ ان کے مذہبی عقائد، مذہبی نظام یہاں تک کہ مذہبی رسم و رواج تک میں مداخلت نہیں کرتے تھے البتہ صلح یا معاہدے کے تحت جو

شرائط طے ہوتی ہیں اُن پر عمل درآمد کرنا کسی بھی قوم کے خلافِ شان نہیں ہوتا ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی فاتح ہوتے وہ وہاں کی رعایا پر اسلامی قوانین کی روشنی میں حکومت کرتے تھے۔ سید صاحب نے اس سلسلے میں اہلِ کتاب، شبہ اہلِ کتاب، کافر، مسلم، جزیہ وخراج کے اہم مباحث کو بھی بڑے تحقیقی سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ محمد بن قاسم نے خالص اسلامی اصولوں کے تحت سندھ کے پورے علاقے پر حکومت کی اور غیر مسلم رعایا کا دل جیتا، اس نے ہندوؤں کو مشابہ اہل کتاب سمجھ کر اور بتا کر یہ اعلان کر دیا۔

> "ہندوستان کا بُت خانہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوس کے آتش کدوں کی طرح محفوظ ہے۔ میری اس سلطنت میں سندھ کے لوگ اس حیثیت کے مالک ہیں جو عراق اور شام میں یہودیوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو حاصل ہے۔"

جب اس کے پاس برہمن، ہندوؤں کے دوسرے سبھی فرقوں پر اپنی برتری و افضلیت کے مذہبی حق کی عرضداشت لے کر پہنچے تو اس نے برہمنوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ پھر وہ گاؤں گاؤں اپنے حاکم کے گن گاتے اور داد و دہش کی تعریف کرتے پھرے، اور یہی سبب ہے کہ جب مسلمانوں کی حکومت سندھ سے ختم ہو گئی تو ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی مسجدوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور تمام ارکان کی ادائیگی کی پوری آزادی دی۔

عباسی عہد میں ہی یحییٰ برمکی (۱۸۰ھ تا ۱۹۰ء) نے ایک شخص کو ہندوستانی مذاہب کی تحقیقات کے لئے بھیجا، اس کے علاوہ بعض دوسرے مصنفین عرب نے بھی ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور ان کے مختلف ارکان و افعال اور مذہبی رسوم پر روشنی ڈالی، اسی سلسلے میں ہندوؤں کے دو فرقوں برہمن اور سمینہ پر محققانہ بحث کر کے سمینہ فرقہ کو مذہباً بودھ ثابت کیا ہے، یہ بھی نادر تحقیق ہے۔ اسی طرح "بدھ" اور "بت" کی تحقیق کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مہاتما بدھ کی مورتی کی پوجا ہوتی تھی اس کے فارسی معنی بُت کے ہیں لیکن عربوں اور ہندیوں کے میل جول سے لفظ بدھ ہی پہلے "بد" پھر "بت" بن گیا ورنہ دراصل دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔

اس عہد میں بغداد مذاہب کا مرکز تھا اور حکومتی سطح پر مناظرے منعقد کرائے جاتے تھے، غیر مسلموں کو اسلام پر اعتراض کا موقع دیا جاتا تھا اور پھر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے علما جواب دیتے تھے، انھیں مناظروں سے اسلام میں علم کلام کا باقاعدہ آغاز ہوا اور دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا جس نے مذہبی تعلقات کو زیادہ استحکام عطا کیا۔

اس باب کی آخری بحث کے طور پر یونانیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں فلسفۂ وحدت الوجود پر کلام کیا گیا ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کا وحدت الوجود ہندوؤں کے ویدانت سے متاثر نہیں ہے بلکہ اس میں یونانیوں کے نو افلاطونی فلسفے کے آثار عیاں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ منصور بن حلاج کا فلسفہ جو مسلم فلسفہ وحدت الوجود سمجھا جاتا ہے دراصل ہندوؤں کے اوتار کے مسئلہ میں مماثلت رکھتا ہے۔ اس کی تصنیف کتاب الطواسین سے یہ ثابت ہے اور یہ بھی کہ وہ ہندوستان کے جادو منتر اور کرتب سیکھنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ بعض ہندوؤں میں وحدت الوجود کا تصور کسی نہ کسی شکل میں پہلے بھی موجود تھا لیکن وحدت تنزیہی کا تخیل اور بت پرستی کے خلاف جذبۂ اسلام ہی کا اثر ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیمی مذہبی تعلقات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور سید صاحب کا آخری مقصدی جملہ بھی محل نظر ہے۔

"کیا جو پہلے گزر چکا وہ آئندہ نہیں ہو سکتا؟" (ص ۲۵۰)

آخری باب "ہندوستان میں مسلمان ـــــ فتوحات سے پہلے" دراصل باب اول کا تکملہ اور چاروں ابواب ومباحث کا حاصل ہے۔ اس میں سب سے پہلے اسکولوں کی نصابی تاریخ کی کتابوں اور اس کے مصنفین کی ناانصافی اور مورخانہ خیانت وتعصب کی نشاندہی وصراحت کی ہے۔ پھر محمود غزنوی سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود اور حاکم ومحکوم کی حیثیت سے ان کے امتیازات کا تذکرہ کیا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم ابتدائی مراکز ہیں سراندیپ "جزائر مالدیپ"، ملیبار، کولم، کارومنڈل، کاٹھیاواڑ، کوکن، سندھ، ملتان، منصورہ وغیرہ کا بیان بہت

دلچسپ اور غیر معمولی و مفید تحقیقات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور محمود کی فتوحات سے پہلے ہند و عرب کے ہمہ جہت تعلقات کی قدامت واضح کر کے صوبوں و شہروں میں مسلمانوں کی آبادی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس سلسلے میں ابن بطوطہ اور دوسرے سیاحوں کے سفرناموں سے بطور خاص مدد لی گئی ہے۔ ملتان وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ محمود سے پہلے بیسیوں علما و محدث سندھ و ملتان و منصور میں پیدا ہو چکے تھے۔ سندھ و ملتان کی قرون وسطیٰ کی تاریخوں میں وہاں کے حکمرانوں کا سلسلہ بڑے دھندلکے میں تھا۔ سید صاحب نے اپنی تحقیقات سے ایک ایک حاکم اُس کی اصلیت و مذہب اور اس کے حالات کا پتہ لگایا، ان سب کے زمانے کا تعین کر کے تاریخ سندھ میں اہم اور نادر مواد کا اضافہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں سومری اور سما قبیلوں کی حکومت پر بھی دقیق مباحث سامنے آئے ہیں۔

سندھ کے اطراف کے دوسرے پندرہ شہروں کا مختصر حال لکھ کر بتایا ہے کہ یہ چوتھی صدی ہجری یعنی محمود کے حملوں سے پہلے ہی موجود تھے اور بعد میں اس کی سلطنت میں شامل ہوئے غرض کہ محمود سے پہلے یہاں سندھی عربی ماحول نئی نسلوں کا جنم داتا بن چکا تھا۔ اسی طرح جنوبی ہند جو اگرچہ مسلمانوں کے حصولِ سلطنت کے لحاظ سے بہت بعد میں سامنے آتا ہے لیکن یہاں ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے مسلمان آبادیاں موجود تھیں اور عوام ہی نہیں بلکہ خواص اور راجہ تک مسلمان ہو رہے تھے یہ تبدیلیٔ مذہب کا سلسلہ مذہبی قرابت و میل جول اور اخلاقی اثرات کے نتیجہ میں آج تک جاری ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات اپنے موضوع پر پہلی کتاب، بڑے خلوص، محنت، انتھک لگن، تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اسلوب تحقیقی ہونے کے باوجود خاصا دلکش اور جاذب نظر ہے، بعض جگہ خطابت کا بھی زور ہے جس کا سبب یہی ہے کہ یہ مواد پہلے خطبات ہی کی شکل میں پیش کیا گیا تھا اس کے پس پشت جو مقصد تھا یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں کامیابی ہوئی، تاریخ کی کتابوں کا وہی رونا ہے، فرقہ وارانہ منافرت کی اس سے بھی زیادہ مسموم فضا موجود ہے البتہ عربوں سے ہند کے تعلقات دن بدن بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مقصد کے اعتبار سے یہ کتاب کسی حیثیت کی سہی، مواد کے اعتبار سے کام کرنے والوں کے لئے غیر معمولی مفید ہے۔

عربوں کی جہاز رانی

"عربوں کی جہاز رانی" مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک اور اہم تحقیقی کاوش ہے۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر یہ خطبات دیئے گئے تھے اور بعد میں انھیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں پیش کر دیا تھا۔ کتاب میں پس منظر کے طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ عرب اپنے تینوں طرف سمندروں خلیج فارس، بحرِ ہند، بحر احمر سے گھرا ہونے سے وجہ سے جزیرۃ العرب کہا جاتا تھا اور جغرافیائی مجبوری کے سبب تجارت وہاں کا خاص پیشہ تھا۔ تجارتی غرض سے بیرونی ممالک کے سمندری وبحری سفر ان کے لئے لازمی ہو گئے تھے جس کے لئے انھیں بحری سفر کی ضروریات وجزئیات ولوازمات سے مکمل واقفیت ضروری تھی۔ اس سلسلے میں عربوں نے اس فن میں ہنرمندی اور مہارت کا ثبوت دیا اور اس کی تحقیقات وریاضت کے نتیجہ میں ایسے گوشے واشگاف ہوئے کہ فنِ جہاز رانی میں عرب تقریباً سبھی ساحلی ممالک کے پیشوا اور رہنما بن گئے اور وہاں کی تجارت پر صدیوں ان کا غلبہ بھی رہا۔

طلوعِ اسلام سے قبل عربوں کو اپنی زبردست قوتِ حافظہ پر غیر معمولی اعتماد تھا اور یہ علم بھی سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا لیکن اس فن میں ان کے کارناموں کے مطالعہ کے سلسلے میں غور کرتے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ تحریر کا دستور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جہاز رانی کے متعلق تحریری مواد کا فقدان ہے۔ صرف تین ماخذ ایسے ہیں جن سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ ماخذ ہیں لغت، عہدِ جاہلیت کے شعرا کا کلام اور قرآن مجید۔ البتہ عروجِ اسلام کے بعد جہاں مختلف علوم وفنون تحریری صورت میں ترتیب دیئے گئے اور تصنیف وتالیف اور ترتیب و تدوین خاص فن بن گئے تھے، ہر فن پر کتابیں لکھی گئیں، فنِ جہاز رانی بھی اس سے محروم نہیں

رہا اور اس کے متعلق مختلف تاریخوں، سفرناموں اور خود اس فن پر لکھی گئی کتابوں میں کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی تصنیف ”عربوں کی جہاز رانی“ میں دورِ اول میں اس فن کی حیثیت کا محاکمہ کرنے کے لئے لغت، شعرائے جاہلیت کے اشعار اور قرآن کو بنیاد بنایا گیا ہے اور ان تینوں کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس دور میں بھی عرب اس فن پر کافی طبع آزمائی کر چکے تھے۔ کثرتِ استعمال کے سبب عربی لغات میں بحری ضروریات کی چیزوں میں سے ہر ایک کے متعدد نام و اقسام یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عربوں کو اس فن سے خاص شغف تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کے غیر عربی النسل ناموں کی اصلیت کا دوسرے ملکوں مثلاً روم، ہند و چین وغیرہ سے سراغ لگا کر سید صاحب نے بتایا ہے کہ عربوں کی تجارتی آمد و رفت کی وسعت کے سبب یہ نام داخل ہوئے ہیں اور ان سبھی ممالک سے عربوں کے بحری و تجارتی تعلقات استوار تھے، سید صاحب نے اپنی بات کے ثبوت کے لئے ایسے الفاظ کی طویل فہرست پیش کی ہے جو عربی میں جہاز رانی اور اس کے متعلقات کے لئے استعمال ہوتے تھے اور ہیں۔

جاہلیت کے شعرا نے جن تلمیحوں، تمثیلوں اور استعاروں کے طور پر بحریات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے چند کا انتخاب کر کے مصنف نے اسے دوسرے ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور قرآن پاک سے ۲۸ آیات صرف اسی موضوع سے متعلق تلاش کر کے درج کی ہیں اور سیاق و سباق بتلاتے ہوئے ان سبھی آیتوں سے وضاحتِ کلام میں مدد لی ہے۔ عہدِ نبوی میں بحری سفر کے بارے میں تشنگی کی حد تک مجمل اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

خلافتِ راشدہ میں جب اسلام نے عرب سے باہر قدم بڑھایا تو اس فن کو فروغ حاصل ہوا بالخصوص حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس پر باقاعدہ توجہ کی گئی، بحری بیڑہ تیار ہوا اور اتنا طاقتور ہو گیا کہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو جہازوں کے ساتھ سواحل شام پر حملہ کیا تو اس بیڑے نے اس کو پسپا کر کے رکھ دیا۔[1]

---

[1] عربوں کی جہاز رانی ص ۴۹

عہد بنی اُمیّہ میں یہ فن اپنے عروج کمال پر پہنچ گیا اور سلطنت کے دوسرے اجزاء کی طرح جہاز رانی کا بھی از سرِ نو جائزہ لے کر اس پر بھرپور توجہ کی گئی اور جہاز سازی کے کارخانوں کا بھی مختلف شہروں میں اضافہ کیا گیا، اُن کے بحری بیڑے نے کچھ ہی عرصہ میں بحر روم کے تمام جزیرے، سسلی، اسپین وغیرہ کو فتح کر لیا اور پرتگال و فرانس تک کے عازم فتح ہوئے عرب و ہند کے تجارتی تعلقات خاصے مستحکم تھے اور عربی جہاز بحرِ ہند میں سراندیپ تک آجاتے تھے لیکن انھیں جہازوں کو ہندوستانی ساحل کے بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا جس کی پاداش میں حجاج بن یوسف ثقفی نے سندھ پر بری و بحری دونوں طرف سے حملے کئے اور فتح کیا۔"

طلوعِ اسلام کے بعد عربوں کی کاوش کو سید صاحب نے عصری ماٰخذ کی مدد سے واضح کیا ہے تحقیقی مزاج اور حوالہ کا اظہار ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ بات میں وزن کے ساتھ ساتھ، زور پیدا کرنے کے لئے بھی عصری بیانات کا سہارا لیا ہے۔ چنانچہ جہاز رانی کے عروج و زوال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "آج اصطخری کے اس بیان کا کسے یقین آئے گا کہ بلال ابن ابی بردہ کے زمانہ امارت میں (۱۰۹ھ) بصرہ کے حدود میں ایک لاکھ بیس ہزار نہریں ایسی تھیں جن میں چھوٹی کشتیاں چلتی تھیں۔"

عربوں کے سمندر کے علم کی وسعت، تمام سمندروں کے سبھی راستوں سے واقفیت، سمندروں کی پیمائش پر عبور، ہر سمندر کے الگ الگ جہاز راں (مثلاً فوجی کمانڈر) جہاز رانوں کی اپنی اپنی جداگانہ اور انفرادی تحقیقات، ایجادات و اکتشافات، تجربات و مشاہدات اور دوسروں سے علمی اختلاف، بندرگاہوں کی تعمیر، مشرقی و مغربی ملکوں کے تجارتی حالات و جہاز رانی میں ان کی اہمیت و حیثیت اور بندرگاہوں کے حالات کو بھی بڑی تفصیلات اور تاریخی حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ایک خاص تاریخی و جغرافیائی پس منظر بیان کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ مشہور پرتگالی سیاح واسکوڈی گاما کو، ہندوستان پہنچانے والا شخص عرب ہی تھا[1]

---

[1] عربوں کی جہاز رانی ص ۱۱۴

جہاز رانی کے سامان و آلات کے سلسلہ میں بھی عربوں کو مہارت و فضیلت حاصل رہی ہے۔ سید صاحب نے ان کے بحری نقشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب ملاح و جہاز راں اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے نقشوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے اور اپنے نئے تجربوں سے ان میں نت نئے اضافے اور سہولتیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح مختلف لائٹ ہاؤسیز کی تعمیر، میل کے نشانات اور ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں اور قطب نما کی ایجاد، اس کی مختلف شکلوں و ارتقار کی داستان بیان کرتے ہوئے ضمناً جہازوں میں لوہے کی کیلیں نہ لگانے اور سمندر کی مقناطیسی کشش کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ سید صاحب نے جہاز سازی کے کارخانوں (دارالصناعہ) کا ذکر کیا ہے۔ جن شہروں میں جس جس زمانے میں یہ کارخانے قائم ہوئے ان کی تفصیل بیان کرنے کے بعد عربی جہازوں کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ جہاز تختوں میں سوراخ کر کے اور ڈوری سے سی کر جوڑے جاتے تھے پھر اُن پر روغن چڑھایا جاتا تھا۔ پھر بحر روم کے کارخانوں میں تختے لوہے کی کیلوں سے جوڑے جلتے تھے پھر اُن پر روغن چڑھایا جاتا تھا، حجاج کے حکم سے عربوں نے بھی رومی جہازوں کے طرز پر اپنے جہاز بنائے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہ چل سکا اور وہ پھر اپنے ڈگر پر لوٹ آئے۔ اس کے علاوہ عربوں کو سمندر میں ڈوبے ہوئے جہاز نکالنے میں جو مہارت حاصل تھی اس کی متعدد مثالیں بھی کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے بعد جہازوں کے دوسرے متعلقات اور عربوں کے مشہور جہاز سازوں اور جہاز رانوں کی تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور اس باب کے آخر میں عربوں کی بحری سربلندی کے خاتمہ کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "عربوں کی بحری ترقی کا خاتمہ دسویں صدی ہجری میں ہو جاتا ہے۔ اب بحر روم پر ترکوں کا عمل دخل تھا، یورپ کے تاجروں کو مشرق تک پہنچنے کے لئے اب ایک ایسے بحری رلستے کی تلاش تھی جس میں وہ بحر روم کے ترکی جہازوں سے بچ کر نکل سکیں اس کوشش میں کولمبس نے امریکہ اور واسکوڈی گاما نے افریقہ کی پشت

> پر سے ہندوستان کا راستہ نکالا اور پھر اس کے بعد پرتگالی، بعد ازیں ہولینڈی فرانسیسی اور انگریزی جہازوں نے مشرق کے بحری ساحلوں پر قبضہ جمانا شروع کیا۔ اب تک خلیجِ فارس، مصر، عرب، حبش، افریقہ، ہندوستان، چین اور جزائر ہند کی بحری تجارت پر تنہا عرب جہاز راں حکومت کر رہے تھے دفعتاً ان نووارد جہاز رانوں کے آنے سے عربوں کے ہزار سالہ نظام بحری کے شیرازے بکھرنے لگے خصوصاً پرتگالیوں نے اس ظلم و سفاکی کے ساتھ عرب ساحلوں اور جہازوں کو برباد کرنا شروع کیا کہ چند ہی سال کے بعد عرب ایک ایک ساحل اور جزیرہ سے بے دخل ہونے لگے...... کئی جنگیں ہوئیں لیکن مشرق کا یہ متحدہ بیڑہ مغربی حملہ آوروں سے شکست کھا کر ایسا غرق ہوا کہ پھر نہ ابھرا۔ اس کے بعد صرف مستثنیٰ تجارتی بادبانی جہاز مدراس و بنگال آتے رہے اور بس.... ملی بار کے عرب نوآباد موپلا جن کی دولت کا مدار مصر، عرب، عراق، مدراس اور جزائر ہند کی تجارت پر تھا ان کی بحری عزت کا خاتمہ ہو گیا۔" (عربوں کی جہاز رانی ص ۱۵۱-۱۵۲)

اس کتاب کا آخری باب عربوں کی بحری تصانیف پر ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ ابتداء میں تو یہ علم و فن تجرباتی اور موروثی طور پر منظوم شکل میں سینہ بہ سینہ چلتا رہا یہاں تک کہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری تک اس پر کوئی خاص تحریری مواد نہیں ملتا البتہ اس سلسلے کی تدوین و تالیف کی پہلی کوشش ان مختلف قسموں کے نقشوں کو قرار دیا جا سکتا ہے جو ماہرینِ فن ستاروں کی شناخت، ہواؤں کے رُخ کی دریافت، سمندر کی پیمائش اور دراز راستوں میں رہنمائی کے لئے اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے اس کے بعد بتدریج اس پر مواد تحریر میں آیا اور منتشر حالت میں پڑا رہا۔ اس فن کا سب سے پہلا باقاعدہ مدون احمد بن ماجد ہے جس نے نویں صدی ہجری میں نظم و نثر میں تقریباً پچیس کتابیں اپنے علم و تجربے کی بنیاد پر لکھیں، سید صاحب نے ان میں سے سولہ کا مختصر تعارف کرایا ہے اور بھی بعض نادر کتابوں کا تذکرہ ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے سید صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے علاوہ بھی بعض اہم کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو یا تو سید صاحب

نظر انداز کر گئے ہیں یا اُن سے لاعلم ہیں۔[1]

"عربوں کی جہاز رانی" تحقیق کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں مواد کی تلاش و تحقیق پیشکش و ترتیب کی جس آگہی و شعور کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے موضوع کی وسعت و ہمہ گیری کے اعتبار سے کم سے کم اردو میں اس فن پر یہ پہلی کتاب ہے، تبصرہ نگار ڈاکٹر حمید اللہ (ایم اے، پی ایچ ڈی) کی نشاندہی کی ہوئی کچھ مفید باتوں سے قطع نظر اس کی جامعیت اور تحقیقی استفادہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نقش اول اب تک اپنا نقش ثانی پیش نہیں کر سکا حالانکہ ہمیشہ ہی وقت کی صدا زمانہ کی ضرورت و تقاضا، تحقیق کی ترقی، علم کے اصول سبھی اس بات کے مقتضی ہوتے تھے کہ اہم کام کو آگے بڑھایا جائے۔

تحقیق کے میدان میں یہ ایک فالِ نیک تھا اور اس میں جتنے وافر حوالے موجود ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بنیاد پر دیگر اہم معلومات و اکتشافات حاضرہ کی روشنی میں مزید کام بھی کئے جا سکتے ہیں۔

اس کتاب میں بھی سید صاحب کے پیش نظر عرب و ہند کے درمیان تعلقات و محبت کی خوابیدہ روح کو بیدار کرنے کا مقصد رہا ہے اس لئے انھوں نے عرب و ہند کے بحری حالات کے ضمن میں زیادہ سے زیادہ جزئیات کا ذکر کیا ہے۔

خطبات ہونے کی وجہ سے خطیبانہ رنگ تحقیقی مزاج سے عدم مناسبت ظاہر کرتا ہے تاہم یہ بھی نظر آتا ہے کہ خطابت کے رنگ کو دور کرنے کی طرف سے بھی مصنف غافل نہیں ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

سید صاحب کی زبان شستہ و شائستہ اور منطقی ضرور ہے لیکن صنعتوں اور رعایتوں کے استعمال کی وجہ سے کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ خالص تحقیقی زبان سے انحراف کر گئے ہیں، بایں ہمہ مجموعی حیثیت سے "عربوں کی جہاز رانی" کی زبان سادہ اور صاف ستھری ہے اور اس کو تحقیق و تصنیف کی زبان کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۳۳ء "عربوں کی جہاز رانی پر استدراک" مضمون ڈاکٹر حمید اللہ

خیام

عمر خیام پر مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس کے باوجود خیام کی زندگی اور اس کے افکار کے بارے میں ہماری معلومات بڑی حد تک نامکمل اور تشنہ تھیں۔ خیام کی پیدائش کا سال اور مقام، زندگی کے مختلف ادوار میں خیام کے حالات، تعلیم، اساتذہ، سرپرست، تصانیف خصوصاً شاعری اور فارسی رباعیات۔ ان میں سے ایک بھی طے شدہ نہیں تھا۔ حیاتِ خیام کے بارے میں مآخذ کا مختلف زبانوں میں ہونا بھی شاید اس پر کام کرنے والوں کے لئے دشواری کا سبب بنا ہو۔ خیام کی تصانیف بیشتر عربی میں ہیں۔ ان کے بارے میں اطلاع بہم پہنچانے والے ابتدائی اور ہم عصر مآخذ بھی زیادہ تر عربی اور فارسی میں ہیں۔ جدید دور میں خیام پر کام کرنے والوں میں بیشتر یورپین مستشرقین ہیں جن کی تصانیف فرانسیسی، جرمنی، روسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں۔ ان کے علاوہ جن ہمعصر مشرقی مصنفین نے خیام کی زندگی کے کسی پہلو پر قلم اٹھایا ہے ان کے مضامین یا کتابیں اردو، فارسی اور ترکی میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص خلوص کے ساتھ خیام کے سلسلے میں کام کرنا چاہتا ہے اور اس کے بارے میں الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے اور طے کرنے کا خواہاں ہے تو ضروری ہے کہ وہ تمام مواد جو خیام سے متعلق ہے اس کے پیشِ نظر ہو یعنی وہ بھی جو خیام نے تصنیف کیا ہے، وہ بھی جو خیام پر تصنیف کیا گیا ہے تاکہ وہ اس تمام مواد پر تحقیقی نظر ڈال کر قابل وثوق اور غیر قابل وثوق مآخذ کی نشاندہی کر سکے اور صرف مکمل طور پر مستند اور قابل وثوق مآخذ پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھے اور تمام اطلاعات کو مستند داخلی اور خارجی

شواہد کی روشنی میں پرکھے اور ثابت کرے کہ کیا صحیح ہے اور کیوں۔ تب وہ اس قابل ہو سکے گا کہ نامعتبر روایتوں کا جو غبار خیام کی شخصیت کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اسے دور کرے اور اصلی خیام کو اس کے حقیقی خد و خال کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذکورہ بالا تمام زبانوں سے واقفیت بھی رکھتا ہو تاکہ ان تمام ماخذ تک اس کی رسائی ہو سکے، مغرب میں ایسی شخصیات موجود تھیں اور اتفاق سے خیام کی طرف توجہ بھی پہلے پہل مغرب ہی میں ہوئی چنانچہ وہاں کئی ایسے فضلا نے اپنی توجہ خیام شناسی کی طرف مبذول کی جو ان صلاحیتوں کے حامل تھے اور اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ مغرب میں چونکہ ابتداءً خیام کی طرف توجہ اس کی رباعیوں بالخصوص اس سے منسوب خمریات اور مخصوص نظریۂ زندگی کی وجہ سے ہوئی اس لئے وہاں سب سے زیادہ کوشش اس کی رباعیوں کی دریافت، ترجمہ اور تشریح پر ہوئی۔ اس سلسلے میں ان محققین نے عربی و فارسی کے بہت سے قدیم ماخذ دریافت کرلئے جن کے ذریعہ خیام اور اس کی رباعیوں کے سلسلے میں واقفیت ہو سکتی تھی، اسی ضمن میں خیام کی کئی اپنی تصانیف بھی سامنے آگئیں۔

مشرق میں خیام سے دلچسپی حقیقت میں مغرب ہی کی دین ہے لیکن یہاں جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا انھوں نے اول تو اس کے کسی ایک پہلو کو مد نظر رکھا ہے، مکمل خیّام پر کام کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا سکی ہے۔ دوسرے ان میں بیشتر مصنفین کے پیشِ نظر صرف عربی فارسی کے ماخذ تھے ان میں بھی بیشتر متاخرین تذکرہ نگاروں کی نیم تاریخی اور نامعتبر حکایتیں۔ مغربی محققین کی اکثر کوششوں اور خیام کے بارے میں تحقیقات اور دریافتوں سے ان میں سے بیشتر لوگ ناآشنا تھے چنانچہ تحقیق میں، حالات کا جیسا فرض تھا، ان سے ادا نہ ہو سکا۔

سید صاحب کی شخصیت یقیناً ایک استثنا ہے انھوں نے جب خیام پر قلم اٹھایا تو واقعی تحقیق کا حق ادا کر دیا اور خیام کے بارے میں جو مباحث خود مغربی محققین کے یہاں بھی تشنہ اور اس کی شخصیت کے جو خد و خال دھندلے اور مدھم رہ گئے تھے انھیں نہایت کامیابی کے ساتھ واضح اور روشن کر دیا ہے۔ فارسی رباعیات کے علاوہ جن کا مسئلہ آج بھی

اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا آج سے تقریباً ایک صدی قبل تھا جب یورپی مصنفین نے اس طرف توجہ کی تھی، حیات خیام کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جسے "خیام" میں سید صاحب نے اپنی تحقیق سے روشن واضح اور طے نہ کر دیا ہو۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ سید صاحب کا مخصوص علمی ذوق، تنقیدی نظر اور تحقیقی ذہن کے ساتھ یہ بھی ہے کہ سید صاحب کو خیام سے متعلق تمام مواد تک دسترس حاصل تھی۔ مشرق اور مغرب میں اُن کے زمانے تک جو کچھ خیام، اس کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں لکھا گیا تھا وہ ان کے پیشِ نظر تھا، خود خیام کی وہ تصانیف جن تک بیشتر مغربی ملکوں کی بھی رسائی نہ ہو سکی تھی سید صاحب کے مطالعہ میں تھیں۔ خیام کو اب تک لوگوں نے صرف اس کی رباعیوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی تھی جن کی تعیین خود مشکوک تھی۔ اس مشکوک اور غیر معتبر ماخذ کی روشنی میں خیام کی مبین، واضح اور معتبر تصویر کشی نہ ممکن تھی نہ ہو سکی۔ سید صاحب نے خیام کو اس کی فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ روشناس کرایا ہے۔ یہ تصانیف متفقہ طور پر خیام کی ملکیت ہیں لہٰذا ان کے پس منظر میں پیش کی جانے والی تصویر بھی بلاشبہ خیام کی اپنی اصلی تصویر ثابت ہوئی اور واقعی عمر خیام کی شخصیت کو اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش کی جانے والی تمام کوششوں میں سب سے زیادہ بھرپور اور کامیاب کوشش سید صاحب کی "خیام" ہے۔

سید صاحب نے تحقیق کے تمام اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اصلی و ثانوی ماخذ کی تلاش، مواد کی فراہمی، ماخذ کی نقد و تحقیق، دریافت شدہ ماخذ سے شخصیت کی تلاش اور حالات کی ترتیب وغیرہ کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور داخلی و خارجی تمام شواہد سے مدد لے کر اپنے خیال کو مستند و مستحکم کیا ہے۔

سید صاحب نے اصول کے مطابق کام کی ابتدا ماخذ کی تلاش و جستجو سے کی ہے چنانچہ اس سلسلے میں ان کی نظر سب سے پہلے مغربی مصنفین پر گئی ہے جنھوں نے خیام کی سوانح، حالات زندگی اور اس کی تصانیف کی تلاش اور قدیم ماخذ کی جستجو و تحقیق کے میدان میں قدم بڑھایا ہے۔ سید صاحب نے ان قدیم ماخذ کا ذکر ان کے دریافت کرنے والوں کی سعی و کوشش کے ذکر کے ساتھ کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے تحقیقی کارناموں اور اہم علمی دریافتوں پر محققانہ تبصرہ

بھی کیا ہے۔ ان محققین میں فرانسیسی مستشرق پروفیسر ہوٹسما، روسی مستشرق والنٹین زوکوووسکی، ڈینی سن راس، پروفیسر براؤن اور ایک ایرانی محقق عبدالوہاب قزوینی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں ان سب کی کوششوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا ہے اور خیام کے اصلی اور قدیم ماخذ کی حیثیت سے درج ذیل تیرہ کو بنیاد بنا کر ان سے استفادہ کیا ہے۔

۱۔ نزہتہ الارواح
۲۔ مرصاد العباد
۳۔ تاریخ الحکماء
۴۔ فردوس التواریخ
۵۔ تاریخ الفی
۶۔ جامع التواریخ
۷۔ چہار مقالہ
۸۔ آثار البلاد
۹۔ ریاض الشعراء
۱۰۔ ابن اثیر
۱۱۔ کشف الظنون
۱۲۔ خاقانی شروانی کا ایک شعر
۱۳۔ خریدۃ القصر

ان ماخذ کی چھان بین کے بعد چند نئے ماخذ بھی سامنے آئے ہیں۔ بہر حال ان تمام ماخذ کا مطالعہ کرنے کے بعد سید صاحب نے اندازہ لگایا ہے کہ خیام کی سوانح کے اصل اور ہمعصر ماخذ کل تین ہیں۔

۱۔ بیہقی کی تاریخ الحکماء جس کا مصنف بچپن میں خیام سے ملا تھا اس کا باپ خیام کا دوست تھا اور خیام کا داماد خود اس کا دوست اور خیام کے حالات کا راوی تھا۔

۲۔ چہار مقالہ۔ اس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی ۵۰۶ھ میں بلخ میں خیام سے ملا تھا۔

اور خیام کے انتقال کے بعد ۵۳۰ھ میں اس کے مزار کی زیارت کو بھی گیا تھا۔

۲۔ تیسری کتاب خریدۃ القصر ہے جس کا مصنف عماد کاتب اصفہانی خیام کی زندگی میں ۵۱۹ھ میں اصفہان میں پیدا ہو چکا تھا۔

ان تین اصل اور بنیادی مآخذ کے علاوہ جن کتابوں میں خیام کے حالات ملتے ہیں وہ بیشتر انھیں سے بعینہٖ یا کچھ کمی و بیشی کے ساتھ نقل کر دیئے گئے ہیں البتہ ان سے ہی بعض نئے مآخذ کا پتہ چلا ہے۔

خیام سے متعلق جتنے مآخذ دریافت ہوئے ان میں خود تصانیف خیام بھی شامل ہیں۔ خیام کی اکیس تصانیف کا تذکرہ ہے لیکن اس میں بعض مکرر ہیں اور بعض کی نسبت غیر مستند ہے۔ سید صاحب نے پوری تحقیقات کے بعد درج ذیل ۱۳ کتابوں کو خیام کی تصنیف مانا ہے جو داخلی شہادتوں کے طور پر بھی استعمال کی گئی ہیں۔

۱۔ رسالہ مکعبات جس کا حوالہ جبر و مقابلۂ خیام میں ہے۔
۲۔ رسالۂ جبر و مقابلہ جس کا ذکر چلپی کے یہاں موجود ہے۔
۳۔ رسالہ شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس۔ بروکلمن نے ذکر کیا ہے۔
۴۔ زیج ملکشاہی جس کا تذکرہ تحفۂ شاہی اور چلپی میں ہے۔
۵۔ رسالۂ مختصر در طبیعیات۔ جس کا ذکر بیہقی اور تاریخ الفی میں ہے۔
۶۔ میزان الحکم۔ بروکلمن میں مذکور ہے۔
۷۔ رسالہ کون و تکلیف و رسالہ اسئلۂ ثلاثہ۔ جس کا حوالہ بیہقی اور شہرزوری میں ہے۔
۸۔ رسالہ فی کلیات الوجود (فارسی) بروکلمن میں مذکور ہے۔
۹۔ رسالۂ موضوع علم کلی و وجود (عربی) بیہقی اور شہرزوری نے ذکر کیا ہے۔
۱۰۔ رسالۂ اوصاف یا رسالہ الوجود (عربی) بیہقی اور شہرزوری میں مذکور ہے
۱۱۔ بعض عربی اشعار جو شہرزوری، عماد وغیرہم کے یہاں مذکور ہے۔
۱۲۔ رباعیات فارسی۔ جو مشہور ہیں اور خیّام کی شہرت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔
۱۳۔ مکاتبات خیام (فارسی) جو حیدرآباد میں دریافت ہوا اور وہیں گم ہو گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خیام کے وہ مآخذ جو سید صاحب کو دریافت ہوکے انچاس[۴۹] ہیں جن میں سے ۱۲ خیام کی اپنی تصانیف ہیں اور سید صاحب کے یہاں بطور داخلی شہادت کے استعمال ہوئی ہیں اور ۳۶ دوسرے لوگوں کی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کلی طور پر خیام ہی سے متعلق ہیں اور بعض میں دوسرے لوگوں کے ساتھ خیام کے حالات مندرج ہیں یا کسی نہ کسی حیثیت سے خیام کا نام ان میں آیا ہے، یہ سب خارجی شواہد کے طور پر کام میں آئے ہیں۔

مآخذ کی تحقیق و دریافت اور مواد کی فراہمی اور چھان بین کے بعد سید صاحب نے اصل موضوع یعنی حالات خیام کی تحقیق کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ انھوں نے اصولِ تحقیق کے مطابق سوانح خیام کی تحقیق و تنقید کے لیے اس کی زندگی کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

۱- خیام کا سالِ ولادت۔ (چونکہ اس کے تعین کے بغیر سال ولادت کی تعیین ممکن نہ تھی۔

۲- خیام کی ولادت
۳- وطن
۴- نام و نسب
۵- اہل و عیال
۶- اخذ و استفادہ
۷- فضل و کمال
۸- خیام ابوطاہر کی تربیت میں
۹- ترکستان کے ایلک خانی دربار میں
۱۰- ملکشاہ سلجوقی کے دربار میں
۱۱- خیام ملکشاہی رصدخانے میں
۱۲- دیگر سلاطین سے تعلقات
۱۳- امراء و وزراء سے تعلقات
۱۴- معاصرین سے تعلقات
۱۵- وفات
۱۶- قبر
۱۷- تلامذہ
۱۸- تصنیفات
۱۹- شاعر خیام اور فارسی رباعیات
۲۰- عمر خیام کا مذہب
۲۱- خیام کا مشرب و مسلک
۲۲- خیام کی شراب

٢٣۔ جعلی خیام (یعنی خیام کے بارے میں جو غلط تصورات قائم کر لئے گئے ہیں ان کی تحقیق و تردید۔

اس کی تفصیلی بحث کا محل سوانح نگاری کا باب ہے۔ یہاں محض چند جملے اس کے علم و فضل کے بارے میں اور باقی گفتگو کتاب کی اہم ترین تحقیقی بحث خیام رباعی گو شاعر کی حیثیت سے موضوع پر کی جائے گی۔

فضل و کمال:

عمر خیام بحیثیت شاعر اور فلسفی، ریاضی داں اور ماہر ہیئت کے اتنی شہرت کا مالک ہے اور ان علوم میں اس کے فضل و کمال کا شہرہ اس قدر عام ہے کہ اس سلسلے میں کوئی نئی بات تلاش کر کے پیش کر دینا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے لیکن سید صاحب نے اس میں بھی تحقیق کے گھوڑے دوڑائے ہیں اور معلومات و دریافت کے بیش بہا خزانے لا کر اہل ذوق کے سامنے ڈھیر کر دیے ہیں۔ اب تک خیام کی شہرت شاعری میں تھی یا معقولات میں، فلسفہ، ریاضیات، ہیئت اور نجوم میں بقول بیہقی وہ یگانہ تھا۔ علم نجوم اور فلسفہ میں بقول قفطی خیام کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ حکمائے خراسان میں بقول شہرزوری وہ بحر ذخار اور سب سے بلند مرتبہ تھا اور بقول فردوس التواریخ اکثر علوم خاصۂ علم نجوم میں سرآمد زمان تھا۔ شاعری اور رباعیات میں تو وہ بہرحال لاجواب تھا ہی۔

لیکن منقولات سے اس کا تعلق لوگوں کو معلوم نہ تھا بلکہ شاید بیشتر اصحاب "خیام" کی تصنیف سے پہلے یہ بات سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ خیام جیسے فلسفی اور حکیم کو قرأت اور تفسیر جیسے علوم میں بھی دست رس ہی نہیں ید طولیٰ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی دریافت سید صاحب ہی کا حصہ ہے۔ خیام سے منسوب مشہور علوم ہیئت، نجوم، ریاضی اور فلسفہ تھے۔ سید صاحب نے اپنی تلاش و تحقیق سے ان میں متعدد مزید علوم کا اضافہ کر کے خیام کی شخصیت کو عظیم تر بنا دیا۔ یہ علوم ہیں طب، تجوید، تفسیر لغت، فقہ، تاریخ اور ہندوستانی ریاضی وغیرہ۔

خیام بحیثیت رباعی گو شاعر:

خیام بحیثیت شاعر اور رباعی گو اس قدر مشہور ہے کہ اس کی شاعری کے سلسلے میں کوئی نئی بات کہنا بہت ہی دشوار ہے لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس کی زندگی کے سب سے مستند مآخذ یعنی بیہقی اور چہار مقالہ کے مصنفوں نے اس کی شاعری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ سید صاحب نے ان اولین مآخذ کا ذکر کیا ہے جن میں خیام کو بحیثیت شاعر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا ماخذ عماد اصفہانی کی خریدۃ القصر ہے اس میں خیام کے عربی اشعار درج ہیں۔ اس کے بعد شہرزوری اور قفطی نے کچھ اشعار کا اضافہ کیا ہے ان میں بعض اشعار کو سید صاحب نے ثعالبی کی یتیمۃ الدہر میں موجود پاکر خیام سے ان کی نسبت غلط ٹھہرائی ہے کیونکہ یتیمۃ الدہر خیام کی پیدائش سے بھی پہلے تالیف ہوئی ہے۔ اسی طرح بعض جدید مصنفین نے جو نئے اشعار خیام سے منسوب کئے ہیں سید صاحب نے انھیں بے سند وحوالہ ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے۔

سید صاحب کو خیام کی فارسی رباعیات کے سلسلے میں سب سے زیادہ محنت کرنی پڑی ہے۔ خیام کی شہرت کا دار و مدار آج اس کے علم و حکمت پر اتنا نہیں جتنا اس کی رباعیات پر ہے۔ یورپ پر فٹز جیرالڈ کے انگریزی ترجمہ کی بدولت خیام سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں وہاں خیام شناسی پر نہایت کارآمد اور معلومات افزا تصانیف وجود میں آئیں۔ مغرب کے اس ذوق اور داد و تحسین ہی سے متاثر ہو کر مشرق میں خیام کی طرف توجہ ہوئی۔ اور یہاں بھی بہت سے مضامین اور کئی اہم کتابیں خیام کی شاعری اور شخصیت پر وجود میں آگئیں۔ فٹز جیرالڈ کے ترجمہ کے بعد فرانسیسی مستشرق ہوٹسما نے زبدۃ القصر کے دیباچہ میں خیام، حسن صباح اور نظام الملک کی ہمدرسی کے امکان کی تردید کر کے خیام شناسی پر ۱۸۸۹ء میں کام کی ابتدا کی۔ ہوٹسما سے ایران کے مشہور نقاد علی دشتی تک جنھوں نے اس صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر میں "دمی با خیام" تصنیف کی ہے، تقریباً پچیس تیس کتابیں خیام کے حالات اور شاعری پر لکھی جا چکی ہیں ان میں سے بیشتر کا موضوع خیام کی شاعری تک محدود ہے۔ لہٰذا ان کے مصنفین نے خیام کی رباعیات ہی کو اپنی تحقیق و تنقید کی بنیاد

بنایا ہے۔ بدقسمتی سے رباعیات خیام کا مسئلہ نہایت ہی پیچیدہ ہے، رباعیات خیام میں دوسرے شعراء کی رباعیوں کے الحاق نے مسئلہ کو اور بھی اُلجھا دیا ہے۔ آج تک یہ ہی طے نہیں ہوسکا کہ خیام کی اصلی رباعیات کونسی ہیں لہٰذا ان متنازعہ فیہ رباعیات پر اسی تحقیق کی بنیاد نہایت ہی کمزور ثابت ہوگی۔

زوکووسکی، ٹووورتھ فیلڈ، کریستن زن اور فریڈرک روزن نے سید صاحب سے پہلے اور علی دشتی نے "خیام" کی تصنیف کے چالیس سال بعد رباعیات خیام کے بارے میں بحث کی ہے اور ان رباعیات کی تعیین کے لئے کچھ اصول وضع کر کے اصل کو غیر اصل سے ممتاز و متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں کوئی بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی متعین کی ہوئی تمام رباعیات خیام کی اصل رباعیات ہیں یا یہ کہ خیام کی اصل رباعیات اسی قدر ہیں۔

سید صاحب نے بھی خیام کی اصل رباعیوں کی تلاش کی ہے اس سلسلے میں انھوں نے رباعیات خیام کے قدیم ترین حوالوں کو دریافت کیا ہے۔ چنانچہ قابوس نامہ، جہانگشائے جوینی، مرصاد العباد، قفطی اور شہرزوری سے ان رباعیات کو جمع کیا ہے۔

اس کے بعد رباعیات خیام کے تیرہ قدیم نسخے ملے ہیں جن میں قدیم ترین ۸۲۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔

سید صاحب نے رباعیات کی تحقیق کے لئے چند اصول وضع کئے ہیں یہ کچھ تو مغربی محققین کے یہاں مشترک ہیں اور کچھ سید صاحب کا اپنا نتیجۂ فکر ہیں جن سے عہدِ حاضر میں سب سے زیادہ فائدہ ایرانی فاضل علی دشتی نے اُٹھایا ہے اور سید صاحب نے رباعیات کے استناد کے تعین کے لئے جو اصول اور طریقۂ کار اختیار کیا ہے علی دشتی نے عملی طور پر اس سے فائدہ اٹھا کر بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ سید صاحب کے متعدد اصولوں میں سب سے زیادہ بہتر اصول اور طریقہ یہ رہا ہے کہ خیام کے فلسفیانہ خیالات کی تحقیق و تعیین کی جائے اور انھیں سے خیام کی اصل رباعیوں کی تشخیص اور تعیین میں مدد لی جائے۔

اس کے یہ خیالات اس کی محققہ فارسی رباعیات، عربی اشعار اور فلسفیانہ کتابوں میں نظر آتے ہیں، بیشتر یوروپی محققین نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اس بات کا خیال

سب سے پہلے فریڈرک روزن کو آیا لیکن اس کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ اسے خیام کی تصانیف میں صرف رسالہ کلیاتِ وجود کا آخری باب مل سکا تھا۔ بقیہ تصانیف کے بارے میں روزن اور کرسٹین زن دونوں کا یہ خیال تھا کہ خیام کی اور کوئی تصنیف موجود نہیں رہی ان سب مسائل سے سید صاحب بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے انھوں نے خیام کی اصل رباعیات کی تحقیق کی اور اس کی بنیاد پر نہ صرف غیر معمولی بلکہ حیرت انگیز نتائج برآمد کیے۔

یورپ میں خیام شرابی کی حیثیت سے مشہور تھا اور اس کی شراب نوشی کے بارے میں عجیب بے بنیاد قصے مشہور ہو گئے تھے یہاں تک کہ ایک متاخر تذکرہ نگار نے بے ثبوت اسے شارب خمر لکھ دیا ہے۔

سید صاحب نے خیام کی شراب کے عنوان سے ایک باب میں اس کی میخواری اور خمریات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی کسی تصنیف میں کوئی ایسا خیال تک بھی نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ وہ شراب کو پسند کرتا ہے جیسا کہ اس سے منسوب خیالات رباعیوں میں ملتے ہیں۔ رباعیات کا بھی یہ حال ہے کہ جو رباعیاں اس کے معاصر یا قریب العصر مآخذ سے دستیاب ہوئی ہیں اور جن کی نسبت خیام کے ساتھ بے شبہ اور یقینی ہے، اُن میں شراب سے متعلق شاید ہی کوئی رباعی پیش کی جا سکے۔ البتہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان سے منسوب خمریہ رباعیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں بہت سی رباعیاں دوسرے شعراء کے کلام میں شامل ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیام کی جودتِ طبع کا نتیجہ نہیں بلکہ بعد کا اضافہ اور الحاقی ہیں۔

اسی کے ساتھ خیام کے جتنے قدیم اور مستند سوانح نگار ہیں ان میں کسی نے خیام کی بادہ نوشی کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو خیام کی فکر کے مخالف تھے اور اس پر الحاد و بے دینی کا الزام لگا رہے تھے۔ انھوں نے بھی کہیں خیام کو شراب خوار یا رند نہیں کہا اس لئے محض مشکوک رباعیات کی بنیاد پر خیام کو بادہ نوش کہنا انصاف کے منافی ہے۔

اس کے بعد سید صاحب نے بتایا ہے کہ بالفرض اگر ان تمام رباعیات کو صحیح

تسلیم کر لیا جائے اور خیام ہی کی تصنیف سمجھا جائے تو بھی اسے صرف "شراب خانۂ خمار" نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ عملاً بادہ خوار نہ ہو کر اردو کے شاعر ریاض خیرآبادی کی طرح شاعری کی خاطر خمریات کا موضوع اختیار کرتا رہا۔ اسی لئے سید صاحب نے اس کی شراب کو چار قسموں میں تقسیم کر کے صرف برائے شاعری اور برائے مدارج فکر و حکمت ثابت کیا ہے۔

سید صاحب۔ بحیثیت سوانح نگار

اردو میں جدید طرز کی سوانح عمری لکھنے کا آغاز مولانا حالی اور مولانا شبلی سے ہوا، ان حضرات نے باقاعدگی کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اردو کو چند نہایت اہم اور مستقل تصانیف سے مالا مال کیا، حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید جیسی عظیم الشان سوانح عمریاں حالی کی فکر کا نتیجہ ہیں تو الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبیؐ کا نادر و بے بہا خزانہ شبلی نے جمع کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس میدان میں علامہ شبلیؒ کی روایت کو آگے بڑھایا اور دبستانِ حالی سے اس فن کی وہ صالح روایات بھی اپنے اندر جذب کر لیں جو ندکورہ دونوں اساتذہ کے اختلافِ فکر کے سبب شبلی کے فن کا حصہ نہیں تھیں۔ عہدِ جدید میں اردو سوانح نگاری میں بے باکی اور ... حقیقت پسندی حالی سے زیادہ شبلی کے فن کی ارتقائی شکل ہے۔ مولانا حالی کی طرح شبلی کے یہاں موضوع کی کمزوریوں پر خاموشی یا تاویلوں کی کثرت نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی اور ان کے دبستان میں موضوع سے حقیقی ہمدردی ہوتی ہے "دبستانِ حالی" (بہ استثنائے ذاتِ حالی) اس کمال ہمدردی سے عاری و خالی ہے۔ شبلی کے یہاں اگر کہیں بے باکی اور حقیقت پسندی ہے تو وہ ہمدردانہ ہے۔ دبستانِ حالی میں موضوع سے لاتعلقیت بیشتر مواقع پر غالب ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالی کے متبعین روحِ حالی سے دور ہو گئے اور شبلی کے مقلدین اپنی ڈگر پر

قائم ہیں۔ دبستانِ شبلی کا ایک اہم امتیاز تاریخی ذوق و شعور اور تاریخیت کا ارتکاز بھی ہے۔ ان تمام خصائص سے معمور مولانا سید سلیمان ندوی، شبلی کے لائق ترین شاگرد اور سچے جانشین ثابت ہوئے۔ اور اس فن میں ان کی نمایاں ادبی کاوشیں سامنے آئیں۔

سید صاحب نے سوانح کے لئے جن شخصیات کا انتخاب کیا ان میں جذباتی عقیدت سے معمور موضوعات مثلاً پیغمبر اسلامؐ کی سوانح سے متعلق تین کتابیں ہیں، سیرۃ النبی، خطباتِ مدراس اور رحمتِ عالم، سیرتِ عائشہؓ حضورؐ کی اہلیہ کی سوانح عمری ہے۔ حیاتِ مالک کا تعلق ایک مذہبی اور علمی ذات سے ہے جو مذہب اسلام میں ایک دبستان (جدید فقہ) کے بانی بھی ہیں۔ "خیام"، ایک متنازعہ فیہ تاریخی علمی و ادبی شخصیت کی سوانح ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا اور ایک مخصوص زاویۂ نظر سے اس پر جو کچھ (بہت کافی) لکھا گیا، یہ کتاب ان سبھی غلط بیانیوں کی تردید کرنے اور صحیح حقایق پیش کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی اور بلاشبہ اس نے خیام سے متعلق ماضی کے تمام نظریات کو بدل ڈالا۔ تحقیق کے علاوہ یہ کتاب خیام کی سوانح کو بھی ایک ایسے نئے جامع اور مربوط ڈھنگ سے پیش کرتی ہے جو دوسری جگہ نایاب ہے۔

"حیاتِ شبلی"، ایک بزرگ معاصر اور شفیق ترین استاد کی سوانح ہے جس میں اس فن کے اصولوں کو برتنے کی پوری پوری گنجائش اور ضرورت تھی۔ ان سوانحی تصانیف کے آداب اور تقاضوں سے سید صاحب کس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں، زیرِ نظر باب میں اسی پر گفتگو کی جائے گی۔

پیغمبر اسلام کی سیرت و سوانح

"خطباتِ مدراس" اور "رحمتِ عالم"

مولانا شبلی نے متعدد جلدوں میں حضور کی سیرت لکھنے کا پروگرام بنایا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ سیرت کے جلو میں اسلام کا مکمل نظامِ زندگی پیش کیا جائے۔ یہ خواب سید صاحب کے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ پہلا حصہ بڑی حد تک مکمل اور دوسرا بڑی

حدتک نامکمل شبلی کی تزئینِ فکر کا نتیجہ ہے باقی پانچ جلدیں تمام وکمال سید صاحب کی کاوشِ فکر کی مظہر ہیں لیکن سوانح نگاری اور سیرت نگاری کا فن جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے وہ اولین دو جلدوں میں ہی دستیاب ہو جاتی ہے۔

البتہ دو۲ باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ اول یہ کہ سیرت کے بنیادی یعنی عربی ماخذ قرآن وحدیث وغیرہ سے سید صاحب نے ہی مواد اکٹھا کیا تھا، پھر دوسرے فراہم شدہ مواد اور سید صاحب کے مواد سے مرتب کر کے شبلی نے سیرت کو اپنے اسلوب میں تیار کر دیا اس کے بعد ایک بار پھر سید صاحب نے ہی شبلی کے اصرار پر اس کی نظرِ ثانی کی اور اس طرح سیرت جلد اول کی تالیف میں سید صاحب کو بہت دخل رہا ہے لیکن شبلی اسے اپنے سامنے شائع نہ کر سکے اور وفات کے بعد جہاں اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی، قوسین میں اضافے کر کے شبلی کے مسودہ کو سید صاحب نے حرف بہ حرف شائع کیا، دوسری جلد میں اسی طرح کے اضافوں کے علاوہ متعدد ابواب ہی سید صاحب کے تحریر کردہ ہیں اور اس طرح سیرۃ النبی کی اولین دونوں جلدوں میں سید صاحب کی حیثیت کسی طرح بھی مؤلف سے کم نہیں رہتی۔[1] بایں ہمہ چونکہ ان دو جلدوں پر مصنف کا نام شبلی موجود ہے اور منشا اور منصوبہ کے اعتبار سے بھی شبلی ہی کا حصہ اس میں غالب ہے۔ اس لئے سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری کے تحت اس پر یہاں گفتگو سے گریز کیا جا رہا ہے۔

سیرت پر سید صاحب کی کوششیں یہیں پر بس نہیں ہو جاتیں بلکہ اس تسلسل میں مزید پانچ جلدیں لکھنے کے علاوہ "خطباتِ مدراس" اور "رحمتِ عالم" کے نام سے بھی دو۲ کتابیں تصنیف کیں۔

"خطباتِ مدراس" سیرت کے موضوع پر انوکھی کتاب ہے۔ اس میں سیرت پر

---

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکلنے والے ماہنامہ "تہذیب الاخلاق کے شمارہ نومبر ۱۹۸۴ء میں اس موضوع پر نسبتاً تفصیل سے کلام کیا گیا ہے

جس ڈھنگ سے گفتگو کی گئی ہے سید صاحب سے ماقبل اور مابعد کی تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں بلاشبہ شخصیت کا تاریخی ارتقاء و تدریج نہیں ہے لیکن سیرت نبوی کا کوئی گوشہ بھی اس میں تشنہ نہیں رہا ہے۔ تمہید کے طور پر اس میں پہلا خطبہ (یا باب) "انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے جس میں انسانوں کے لئے نبیوں اور پیغمبروں کی بعثت کی ناگزیریت ثابت کی گئی ہے اور دوسرا خطبہ بہ عنوان عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہ کی سیرت ہے۔ حضورؐ کی پوری سیرت بالخصوص اس کا اہم ترین جزو یعنی عملی زندگی کا اس میں ایک مرقع پیش کر دیا گیا ہے، بیان واضح اور دلائل محکم ہیں، مناظرانہ پہلو نہیں بلکہ علمی ہے البتہ مصنف ہر ہر قدم پر علم کلام کی مدد لیتا ہوا نظر آتا ہے جو اظہار مقصد میں خارج نہیں، معاون ثابت ہوتا ہے۔ حضورؐ کے سیرت کے اس پہلو کی وضاحت کے لئے علیحدہ علیحدہ خطبے (یا ابواب) پیش کر کے زندگی کا ہر رخ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ اس کے بعد کے خطبات میں سیرت محمدی کا تاریخی پہلو، تکمیلی پہلو، سیرت محمدی کی جامعیت، سیرت محمدی کا عملی پہلو، پیغمبر اسلام کا پیغام اور جدید عہد میں پیغام محمدی کی تفہیم شامل ہیں۔

یہ آٹھوں خطبات اپنے نئے طرز، مستحکم استدلال، تاریخی مآخذ سے استنباط، منفرد اسلوب، اور بیان کی شائستگی و پاکیزگی کے لحاظ سے سید صاحب کی تصانیف امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ لفظی بازیگری، خطیبانہ ساحری اور غیر ضروری تفصیلات پر اعتدال، سند اور تاثیر کو ترجیح دی گئی ہے اور اس تاثیر کی خاطر کبھی کبھی ایسی روانی اور جوش پیدا ہو جاتا ہے کہ دربیان کے تمام مواقع خس و خاشاک کی طرح بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ یہ خطبات ہیں لیکن خطیبانہ القاب کے علاوہ ہر جگہ تصنیف کا رنگ موجود رہتا ہے۔ مثالوں اور دلیلوں کے دوران کبھی کبھی کوئی برمحل مکالمہ پیش کر دیتے ہیں تو تاثیر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ایجاز و اختصار اس کتاب کی جان ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ دوسرے مقررین و مصنفین جہاں ایک صفحہ کی گنجائش بے تکان اور آسانی سے نکال سکتے ہیں، سید صاحب اس سے احتراز کرتے ہوئے صرف ایک جملہ اور کبھی

کبھی ایک سطر سے کام نکال لیتے ہیں۔ اس کتاب کی ان خوبیوں سے متاثر ہو کر ہی رشید احمد صدیقی نے لکھا تھا کہ

> "سید صاحب کی تصانیف میں مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر جس تصنیف نے کیا وہ ان کے خطبات مدراس ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید سب سے پہلے میں نے سید صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان خطبات کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے تو بہت مفید ہو گا... مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد و شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی"۔

"رحمتِ عالم" بھی پیغمبر اسلام کی سوانح و سیرت پر سید صاحب کی ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے۔ یہ اس وقت لکھی جب وہ ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور سیرتِ رسول پر "اتھارٹی" سمجھے جاتے تھے۔ سیرت کی چھ جلدیں اور خطبات مدراس بہت پہلے منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ لیکن "سیرۃ النبی" واضح اور دلکش ہونے کے باوجود ایسی کتاب نہیں تھی جس سے ہر کس و ناکس استفادہ کر سکے بلکہ وہ سبک اذہان پر گراں بار ہو سکتی تھی۔ دوسرے کہ وہ بہت مفصل اور ضخیم تھی جس سے استفادہ کے لئے کافی وقت فارغ کرنا ضروری تھا۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لئے سید صاحب نے "رحمتِ عالم" کے نام سے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ایک نئی کتاب ترتیب دی جو سیرت پر معلوماتی کتاب ہونے کے علاوہ کچھ دیگر خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ چنانچہ دیباچہ میں مصنف نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ۔

> "ایک زمانہ سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے آسان ہو اور اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے دوستوں کی اس فرمائش کی تعمیل میں یہ مختصر سی سیرت لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں عبارت کی سادگی، طرزِ ادا کی سہولت اور

واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔"

رحمتِ عالم کی ایک ایک سطر سید صاحب کے اس بیان کی مظہر ہے۔ دراصل اسے سیرۃ النبی (اول و دوم) کی تلخیص کہا جا سکتا ہے وہاں بھی مقدمہ کے طور پر کتاب کا آغاز عرب و حجاز کے جغرافیہ و تاریخ سے ہوا ہے یہاں بھی ضرورتاً اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پیغمبر کی اہمیت و ضرورت، پیغمبروں کا سلسلہ، نسل ابراہیمی و اسمٰعیلی کا مجمل ارتقاء، اسی نسل میں قبیلۂ قریش کے ایک معزز خاندان بنو ہاشم میں حضور کی ولادت کو بڑی منطقی اور تاریخی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اختصار ہر لمحہ مصنف کے پیش نظر ہے اس لئے طویل بحثوں میں اُلجھنے کے بجائے سُلجھے ہوئے انداز میں نفس مطلب واضح کئے گئے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش، ابتدائی حالات، کعبہ کی تعمیر میں ان کا اہم کردار مشغلۂ تجارت اور پہلی شادی کے حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد نزول وحی اور نبوت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ان کو جو دُشواریاں پیش آئیں اور وہ جس طرح عہدہ برآ ہوئے، نیز جب دوسرے صحابہ ایمان لانے لگے اور ان کو اپنے قبیلے والوں کے ہاتھوں جو ذلتیں اور اذیتیں برداشت کرنا پڑی تھیں، حضور کا ان کے ساتھ کیا طرز عمل اور سلوک رہتا تھا، خود حضور دوسرے قبیلوں میں جاکر اسلام کی دعوت و تبلیغ کے مثبت و منفی نتائج کی روشنی میں آئندہ کا لائحۂ عمل طے کرتے، معاہدہ و صلح کی ضرورت ہوتی تو اس میں پیش قدمی کرتے یا جنگ ناگزیر ہو جاتی تو منصوبے کے ساتھ از اول تا آخر اس میں ان کا جو کردار رہتا، سید صاحب نے ان سبھی باتوں کو بڑے اختصار کے ساتھ دلنشیں پیرائے میں بیان کیا ہے اور ان واقعات و حالات سے بلا ارادہ ہی رسولِ اکرم کی سیرت کے بعض منفرد و بے نظیر پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا ایفاء عہد راست گفتاری، حق پرستی، انصاف پروری معاملہ کی صفائی، دیانتداری، استقامت و استحکام اور اولوالعزمی، شجاعت و مردانگی کے علاوہ انکسار، رقیق القلبی، رحم دلی، نرم گفتاری، لینت و مروت، شفقت و محبت حلم و عفو و درگزر، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت وغیرہ کے بنیادی اوصاف ارتقائی شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔

واقعات کا انتخاب، زبان کی سادگی، بیان کی دلکشی، اور ترتیب کا حسن اس مختصر سیرت کا وصف خاص ہیں۔ سید صاحب ہر جگہ معمولی معمولی جزئیات کو بیان کرنے کے عادی ہیں لیکن یہاں صرف وہی جزئیات پیش کی گئی ہیں جو نفس واقعہ کی وضاحت میں معاون ہوتی ہیں اور بس۔ اس کے علاوہ مسائل کی پیچیدگی میں اُلجھنے کی سخت احتیاط کی گئی ہے۔ کسی پس منظر کے بغیر (جس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں تھی) وحی و معجزات کا تذکرہ بے سود بلکہ ابہام کا سبب بن سکتا تھا اس لئے ان کے بیان سے گریز کیا گیا ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام اور مکمل نظام زندگی بچوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے کام کی چیز نہیں اس لئے وہ بھی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح پہلے نکاح کے علاوہ حضور کے باقی آٹھ نکاح کا (جو جزو زندگی ہیں) تذکرہ تک نہیں کیا صرف آخر میں بیویوں کی نام شماری کرا دی گئی ہے اگر ان کی مختصر تفصیل بھی بیان کی جاتی تو حضورؐ کی سیرت کے بعض دوسرے اہم پہلوؤں پر یقیناً روشنی پڑتی اس لحاظ سے یہ تشنگی تشنگی ہی رہتی ہے۔

سیرت عائشہؓ

عورت کی سوانح پر مرد کے لئے قلم اٹھانا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ایک خاص عمر اور تصنیف کی مختصر مدت میں عورت کی زندگی کی تمام جزئیات کو روشنی میں لے آنا بھی ہر سوانح نگار کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے مغربی اصول سوانح نگاری کی روشنی میں عام خواتین کی سوانح عمری لکھ دینا نسبتاً آسان ہے لیکن اسی راستے پر چل کر ایسی مذہبی شخصیت پر قلم اٹھانا اور پوری طرح غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرنا، جس کا مواد بھی محض ذخیرۂ احادیث پر مبنی ہو، ایک عقیدت مند کے لئے دُشوار کام ہے۔ تیسرے موضوع اور سوانح کی زبان و بیان کے درمیان عدم مناسبت کی خلیج کو دلکشیٔ اسلوب سے پُر کرنا بھی ایک صاحب اسلوب کے لئے ہی ممکن ہے۔ "سیرت عائشہؓ" کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو ان سبھی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ کام اس وقت مزید اہم ہو جاتا ہے جب خواتینِ سلف کی سوانح نگاری کی طرف یہ پہلا ہی قدم ہو۔

حضرت عائشہؓ کی زندگی مسلمانوں کی قابل صد احترام ماں کی سیرت وحیات ہے یہ ایک طرف مُسلم خواتین کی مذہبی رہنمائی میں معاون ہے تو دوسری طرف دُنیا کی کسی بھی عورت کو زندگی کے جن اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا نمونہ اس زندگی میں موجود ہے۔ خاندان، گھر کا ماحول، ولادت، بچپن، تعلیم وتربیت، شباب، شادی، شوہر سے تعلقات سوکنوں کے ساتھ معاملات، بچوں کی تربیت، دوسرے لوگوں کے ساتھ برتاؤ اور سلوک امور خانہ داری، شوہر کی وفات اور بیوگی، عام حالات، اخلاق وعادات جن میں عفت و عصمت، لینت ومروت، ایثار وہمدردی، محنت ومشقت، جود وسخا، علم وعدل، زہد وتقویٰ فہم وفراست، عاجزی وخودداری، عفو ودرگذر اور شجاعت وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ میں فوج کی قیادت اور علم میں بلند پایہ علما کی اصلاح وغیرہ سیرتِ عائشہ کے اہم خصائص ومباحث ہیں۔

سوانح نگار کے پیش نظر دو باتیں خاص طور پر رہی ہیں۔ اول یہ کہ ان کا موضوع زندگی کا رہنما ہے دوسرے یہ کہ یہ سوانح بیسویں صدی میں لکھی جارہی ہے اور سوانحی ادب کا تقاضا ہے کہ موضوع کو مافوق فطرت بنانے کے بجائے عوام سے قریب کرکے پیش کیا جائے۔ چنانچہ وہ ہر جگہ عقلی دلائل کے استعمال، عقلی کسوٹی پر کسنے اور پرکھنے کے ساتھ ساتھ اس دوسرے مقصد کی طرف بار بار قاری کو متوجہ کرتا ہے ساتھ ہی وہ سوانح لکھنے کے مقصد سے بھی قاری کو بے خبر نہیں رکھنا چاہتا۔

> "ایک مسلمان عورت کے لئے سیرتِ عائشہ میں اس کی زندگی کے تمام تغیرات، انقلابات اور مسائل ومصائب، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، سوکن، بیوگی، غربت، خانہ داری، رشک وحسد غرض اس کے ہر موقع اور ہر حالت کے لئے تقلید کے قابل نمونے موجود ہیں، پھر علمی، عملی، اخلاقی ہر قسم کے گرانمایہ جواہر سے یہ پاک زندگی مالامال ہے اس لئے سیرتِ عائشہ اس کے لئے

ایک آئینہ خانہ ہے جس میں صاف طور سے نظر آئے گا کہ ایک مسلمان عورت
کی زندگی کی حقیقی تصویر کیا ہے۔"[1]

سوانح کے مآخذ میں ذاتی مواد کے علاوہ معاصر شہادتوں اور ہم عصر لوگوں کے تاثرات مخالفوں اور حریفوں کے بیانات، بعد کے لوگوں کی اطلاعات و آراء، کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سیرتِ عائشہ کے مآخذ اگرچہ ذخیرۂ احادیث اور اسماء الرجال کی کتابیں ہیں اور یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد صحیح بخاری سے زیادہ مستند اور ثقہ متن دنیا میں کسی دوسری کتاب کا نہیں ہے۔ سید صاحب نے بیشتر فائدہ اسی سے اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مآخذ کا غور و دقت سے مطالعہ کر کے احتیاط اور سلیقے کے ساتھ حضرت عائشہ کی سوانح ترتیب دی گئی ہے۔ انداز نظر تحقیقی اور اسلوب بیان شگفتہ ہے۔ کمال احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی روایت بغیر حوالے کے نقل نہیں ہوئی ہے یہاں تک کہ بعض سطور میں ایک سے زیادہ حوالے بھی موجود ہیں۔ اختلافی مسائل پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اگر ان میں سے کسی کی ثقاہت میں شبہ ہے تو اس سے استفادہ کرنے کے باوجود اس کی حقیقت متعین کر دی گئی ہے۔

موضوع کی سیرت کے صرف مذہبی، رہنمایانہ اور قابل فخر پہلوؤں کو پیش کرنے پر ہی پوری توانائی صرف نہیں کر دی گئی بلکہ حضرت عائشہ امت مسلمہ کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ جن فطری و بشری کمزوریوں کی حامل ہیں ان کی پیش کش میں بہ شرط ادب دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

حضرت عائشہ کا بچپن ان سوانحی موضوعات کا بچپن ہے جن کی زندگی کا ایک ایک واقعہ محفوظ رہتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ۶ سال کی عمر میں ہی رسول اکرمؐ کے نکاح میں داخل ہو گئی تھیں اور خود یہی پہلو کہ حضرت عائشہ کا نکاح چھ برس کی عمر میں کیوں اور کیسے ہو گیا، اسلام میں اس کی اجازت سے متعلق سید صاحب کسی قسم کی لچک یا تاویلوں

---

[1] سیرت عائشہ ص ۲-۳۔

کاشکار نہیں ہوئے بلکہ اس سلسلے میں معترضین کا باحوالہ یا بلاحوالہ مسکت جواب دیا ہے اور ان مسلمانوں کی بھی صحیح رہنمائی کی گئی ہے جنھوں نے مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں یہ تاویل اختیار کی ہے کہ اس وقت حضرتِ عائشہ کی عمر چھ برس نہیں سولہ برس تھی۔ ان تمام مباحث کے بعد نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ برس ہی متعین کی ہے۔ رخصتی البتہ نو برس کی عمر میں ہوئی اور بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ عرب کے اس مخصوص ماحول میں لڑکی کی غیر معمولی نشو و نما ہوتی ہے اور حضرتِ عائشہ نو برس کی عمر میں جوان ہو چکی تھیں[1]۔

حضرت عائشہ بچی ہوں، جوان ہوں یا بوڑھی، ان کے اندر جو بھی انسانی و نسوانی خصوصیات موجود تھیں اور مستفادہ ماخذ میں جتنا بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان سے بھرپور مدد لی گئی ہے اور ان تمام باتوں کو بے کم و کاست بیان کیا گیا ہے۔ بچپن کے کھیل کود میں گڑیوں اور جھولا جھولنے کا شوق، لغزشوں اور خطاؤں پر سزا وغیرہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

حضرت عائشہ کی باقاعدہ تعلیم و تربیت شادی کے بعد رسول اکرم کی نگرانی میں ہوئی۔ اس تعلیم و تربیت اور امورِ خانہ داری سے ان کی واقفیت کا بھی سوانح میں جائزہ لیا گیا ہے۔ کم سنی میں خانہ داری سے کم واقفیت اور کم تجربہ داری کی مثالیں عام عورتوں کی طرح حضرت عائشہ کی زندگی میں بھی ملتی ہیں وہ علم و فضل کے اعتبار سے بلند سہی، حضور کی صحبت سے متاثر سہی، لیکن وہ ایک عورت ہی تو تھیں۔ خانہ داری میں ان سے بہتر عورتیں خود ان کے گھر میں موجود تھیں اور حق یہ ہے کہ دوسری تمام سوکنیں اس معاملہ میں ان سے بہتر تھیں۔ بیویوں میں حضور کو حضرت عائشہ سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ سید صاحب نے شوہر سے ان کے تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، محبوب بیوی کے ناز نخروں کی طرح ان کے بھی وہی ناز نخرے تھے اور وہ اس معاملہ میں بھی دائرۂ نسوانیت سے باہر نہیں تھیں۔ اسی طرح سوکن اور سوتیلی ماں کی حیثیت سے ان کی شخصیت کے تجزیے کے دوران زیادہ سے

---

[1] سیرت عائشہ ص ۱۲

زیادہ غیر جانب داری اور ”لا تعلقیت“ کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ جہاں رسول اکرم کی سب سے پیاری بیوی اور شوہر کی اطاعت گزار، بات کا پاس و لحاظ رکھنے والی عورت تھیں، شوہر کی تنبیہ کی بھی غیر محتاج نہیں تھیں“، اس کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

سید صاحب کی تصنیفات کے ابتدائی دس سال میں ان پر مذہبی عقلیت پسندی کا غلبہ رہا اور اس معاملہ میں وہ شبلی سے زیادہ سرسید کے قریب نظر آتے ہیں۔ قوتِ استدلال کے ساتھ اظہار کی بے باکی و آزادی اس زمانہ میں ان کا خاص وصف رہا ہے اور سیرتِ عائشہ میں بھی یہ منعکس ہوا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت عائشہ کی جتنی نمائندہ خصوصیات موجود مواد سے فراہم ہو سکیں سید صاحب نے ایک ایک کر کے سب کو بیان کیا ہے۔ ان کی خاندانی شرافت و نجابت، بہترین تربیت اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کے علاوہ حصولِ علم میں انتہائی کوشش و لگن، سمجھ میں نہ آنے پر بار بار پوچھنا، پیچیدہ مسئلوں میں حضور سے بے جھجک جرح کر کے مطمئن ہونا وغیرہ۔ فطرت میں داخل تھا، ایک مسلمان عورت جن حالات سے دوچار ہو سکتی ہے اس کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے، وہ سوچ سوچ کر حضور سے معلوم کرتیں تاکہ کوئی پہلو تشنہ و تاریک نہ رہ جائے۔

شعر، تاریخ اور انساب سے موروثی مناسبت تھی۔ رسولِ اکرم جب کبھی بیمار ہو جاتے اور عرب اطبا مختلف مواقع پر جو دوائیں بتاتے حضرت عائشہ ان کو یاد کر لیتی تھیں اور اس طرح انھیں فنِ طب میں بھی درک پیدا ہو گیا تھا۔

اخلاق و عادات میں حضرت عائشہ بے شمار عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔ عورتوں میں قناعت کا عام فقدان اور معاشی کمزوری کا عام گلہ رہتا ہے، حضرت عائشہ قناعت کی پیکر تھیں اور جب حضور کو یہ حکم ہوا کہ جو ازواج مطہرات معاشی آسودگی حاصل کرنے کی خواہاں ہوں اگر وہ چاہیں تو آپ ان کو علیحدہ کر دیجیے تو اس سلسلے میں شوہر کی اور قناعت کی حمایت کرنے میں بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ نے سبقت کی تھی۔

اگرچہ وہ خود دار تھیں لیکن خود ستائی سے متنفر تھیں، اگر انھیں یہ اندازہ ہو جاتا کہ

جو شخص ان سے ملاقات کے لئے آیا ہے وہ ان کی تعریف کرے گا تو مناسب حیلہ سے اس سے کنارہ کش ہو جائیں۔ حضرت عائشہ کی عصمت وعفت پر بھی ایک بار انگشت نمائی ہوئی اس سلسلے میں ان سے رشک ورقابت رکھنے والی دوسری عورتوں اور خود سوکنوں کی بھی شہادت لی گئی اور جب انھوں نے بھی ان کی پاکیٔ عفت کا برملا اعلان کیا تو پھر قرآن کی آیتوں نے بھی ان کی پاکیٔ دامانی کی تصدیق کی[1] اس پورے عرصہ میں ایک باحیا لڑکی پر جو کچھ گزرتی ہے ان پر اس سے کہیں زیادہ بیتی، سید صاحب نے ان سب کیفیات وجذبات کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔

اس کے علاوہ علم اجتہاد میں بہ استثنائے چند صحابہ کرام بھی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے قرآن، حدیث، فقہ، قیاس، علم کلام وعقائد اور اصول افتاء وغیرہ میں پیغمبر اسلام کے خصوصی فیضان کی بدولت حضرت عائشہ نے جو کارنامے انجام دیئے نیز بزرگ صحابہ کی روایتوں کی خامیوں کی جو نشاندہی واصلاح کی ہے دوسرے کسی صحابی کے اندر اتنے اعتماد واستقلال کی مثالیں نہیں ملتیں یہاں تک کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ جو سب سے زیادہ ثقہ اور مستند راوی تسلیم کئے جاتے ہیں حضرت عائشہ کی علمی گرفت سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ سید صاحب نے حضرت عائشہ کے علمی مرتبہ کی پیش کش پر کتاب کا تقریباً نصف حصہ صرف کیا ہے اور اس سلسلے میں تمام دعوے اپنے مضبوط دلائل بھی رکھتے ہیں۔

علم وفضل کے بلند پایہ وبلند مرتبہ کے باوجود حضرت عائشہ سے جو اجتہادی غلطیاں ہوئی ہیں وہ اُن کے آخری دور کی کمزوریوں اور خامیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان کی بھی نشان دہی کر کے اس پر علمی گفتگو کی گئی ہے۔

غرض جو بحث اٹھائی ہے اس پر سید صاحب نے کلی وتفصیلی روشنی ڈالی ہے مبالغہ کے ساتھ یا مافوق الفطرت بنا کر پیش کرنے کے بجائے انسانی ونسوانی دائرہ میں پرکھنے کی کوشش کی ہے! اسلوب بیان میں شگفتگی بھی ہے اور کہیں کہیں الہلال کا

---

[1] سورۂ نور، رکوع ۲

خطاباتی رنگ بھی۔ اس دلکش اسلوب نے حوالوں کی گراں باری کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔

حیاتِ مالک

"حیات مالک" مشہور محدث اور فقہ کے پہلے امام مالک ابن ابی عامر کی سوانح ہے اور سید صاحب کی پہلی سوانحی تصنیف بھی ہے۔ ۱۰۵ صفحات پر مشتمل اس کتابچہ میں پچیس منتشر صفحات میں امام صاحب کی سوانح و شخصیت پر کچھ اشارے اور کچھ وضاحتیں مل جاتی ہیں بقیہ حصہ حدیث و فقہ اور درس و تدریس میں ان کے کارناموں کے بیان پر محیط ہے اور یہ بیان بھی مصنف کے نزدیک تشنہ ہے، اس کے بعد ان کے اجتہادات کی بحث جو کہ جوہر کتاب ہوتی پیشِ نظر تھی بعض مجبوریوں کے سبب اس کو یہیں روکنا پڑا[1] اور کتاب شائع کردی گئی۔ اس کے علاوہ مصنف نے خاص سوانح لکھنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے ایک خاص مقصد ہے جس کے تحت یہ کتاب وجود میں آئی۔

> "ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر پیدا ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی بے راہ روی دور کرنے اور انھیں اسلامی علوم سے واقف کرانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اس ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے۔"[2]

سوانحی اصولوں کے لحاظ سے یہ ناقص کتاب ہے جس میں نہ موضوع کے بچپن، شباب و شادی وغیرہ کے ضروری حالات ہیں اور نہ ہی شخصیت میں کسی قسم کا ارتقاء ملتا ہے مقدمہ میں دوسری اکثر باتوں کی صراحت موجود ہے لیکن حیات سے متعلق جو کم مواد پیش کیا گیا ہے اس کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی ہے۔ مصنف کی یہ پہلی تصنیف (۱۹۱۷ء) ہے اس لئے

---

[1] و [2] حیات مالک ص ۱

اس میں حوالوں اور حاشیوں کا وہ اہتمام نہیں ہے جو بعد میں اس کا طرۂ امتیاز بنا۔

ابتدا میں امام مالکؒ کے وطن و خاندان پر چند سطریں لکھ کر امام کی ولادت کی تاریخ (۹۳ھ) متعین کی ہے، پھر فوراً ہی موضوع علمی ماحول میں آنکھ کھول لیتا ہے۔ امام کا وطن مدینہ، علمِ دین کا مرکز و منبع تھا جہاں سینکڑوں بڑے علما پہلے سے ہی موجود تھے اور بہت سے لوگ باہر سے آکر وہاں عالم بنتے اور درس حدیث شروع کر دیتے تھے لیکن وہ سبھی علماؔ معتبر و ثقہ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ علوم کا مدار بیشتر قوتِ حافظہ پر ہوتا تھا اور اس صلاحیت میں تمام علماء کو مستند اور یکساں قوی الحافظہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے امام مالک جیسے ذکی الحس، غیر معمولی قوتِ حافظہ رکھنے والے خالص علمی ماحول میں تربیت یافتہ مقامی طالب علم کے لئے ہر کس و ناکس سے استفادہ کے بجائے ثقہ اور معتبر اساتذہ کا انتخاب ضروری ہو گیا تھا اور اعتبار میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ضعف و پیری کی وجہ سے اپنے نوے سالہ دادا سے بھی کوئی روایت نقل نہیں کی اس احتیاط کے باوجود امام کے اساتذۂ حدیث کی تعداد ۹۴ تھی جس کی فہرست سید صاحب نے پیش کی ہے۔ علم حدیث کی تکمیل کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور امام ربیعہ اور امام زہری کو اپنا استاد بنایا۔

شوقِ علم اور فراغِ قلب میں وہ تمام الجھنوں سے بے نیاز و بے پروا ہو جاتے، کسب علم کے دوران معاشی فکر بھی دامن گیر نہیں ہوتی تھی اور فقر تک گوارا تھا اور

> "ایک مرتبہ فقر سے نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دستِ طلب علم کوتاہ نہیں کیا۔ اس لئے امام فرمایا کرتے تھے کہ اس علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی وہ بہر حال طلب علم کو ترجیح دے۔"[1]

امام کا استناد عہدِ شباب تک ہی مسلم ہو چکا تھا اور فقہ سے متعلق مقدمات انہی کے یہاں فیصل ہونے لگے۔ وہ جلد ہی مسند درس پر متمکن ہو گئے اور دور دور سے طلباؔ

---

[1] حیات مالک ــ ص ۳۰

شوق استفادہ میں دوڑے چلے آتے تھے۔ سید صاحب نے اس پہلو پر واضح روشنی ڈالی ہے اور یہ امام کی شخصیت کے مخصوص رنگ کو سمجھنے میں ممد معاون ہوتی ہے۔

امام صاحب کی درسگاہ کا طرز بھی بہت پرشکوہ تھا۔ جب ان کے شاگردوں میں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی جیسی ہستیاں موجود ہوں اور اسی طرح کے منتخب شاگردوں کی تعداد تیرہ سو ہو اس کی درسگاہ سے یہ بعید نہیں کہ

> "جاہ و جلال اور شان و شوکت کا خانۂ امامت پر بارگاہِ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امراء کا ورود، علماء کی تشریف آوری، سیاحوں کا گزر، حاضرین کی مودب نشست، درخانہ پر سواریوں کا انبوہ، دیکھنے والوں پر رعب و وقار طاری کر دیتا تھا"[1]

امام صاحب کا یہ تزک و احتشام اور شکوہ و شان شاہانہ تزک و احتشام سے کم نظر نہیں آتا، فرق صرف سلطنت دل اور سلطنت ملک کا ہے۔ اس کے علاوہ امام کی حق گوئی، خودداری، آزادروی اور انصاف پروری سے یہ بعید تھا کہ وہ امیر وغیر امیر کا امتیاز روا رکھتے اسی وجہ سے جب خلیفۂ وقت ہارون رشید نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی امام سے استفادۂ درس کا خواہاں ہے اور امام صاحب سے دربار میں آنے کی درخواست کی تو امام نے کہلا کر بھیج دیا کہ لوگ علم کے پاس آتے ہیں، علم لوگوں کے پاس نہیں جاتا۔ اسی طرح جب امین کے لئے یہ خواہش ہوئی کہ انھیں اپنی درسگاہ میں ہی تنہائی میں پڑھا دیا کریں تو امام نے انکار کر دیا کہ مجلس درس کا فیض عام ہے کسی کے لئے خصوصی مجلس کا اہتمام ممکن نہیں۔

امام کا درجہ ائمہ فقہ میں سب سے بلند تھا اور دوسرے ائمہ اسی خرمن کے خوشہ چیں تھے فضل و کمال کے اعتراف کا یہ حال تھا کہ عرب و عجم کے مختلف النوع طبقات کے افراد مثلاً خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین و شیوخ امام، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، فقہاء، قضاۃ

---

[1] حیات مالک ص ۴۴

صوفیا، ادباء، شعراء، مورخین، مفسرین اور فلسفی سبھی طبقے ان کے تلامذہ میں شامل تھے سید صاحب نے ان سب کا ذکر کیا ہے جیسا کہ کتاب کی تالیف کا مقصد ہے۔ سوانح نگار نے زیادہ زور و توجہ حدیث و فقہ و اجتہاد میں امام صاحب کے کارناموں کے تذکرہ پر صرف کی ہے اور امام کے یہاں انھیں یہی چیز کہ علوم اسلامی کی حفاظت میں امام کا کیا کردار رہا ہے سب سے زیادہ پسندِ خاطر ہوئی ہے اس لئے کتاب کا دو تہائی سے زیادہ حصہ اس کی توضیحات پر مشتمل ہے پھر بھی بقول مصنف تشنہ ہے۔ خصوصاً امام کی حدیث کی کتاب موطا امام مالک پر بطورِ خاص گفتگو کی ہے۔ اس کتاب سے اپنی دلچسپی و رغبت کا سبب بیان کرتے ہوئے دیباچہ میں لکھدیا ہے۔

> "مجھ کو علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ جس نے مجھے اس فرض کے انجام دینے پر آمادہ کیا۔"

مواد کی کمی کے باوجود سید صاحب نے بعض ایسے نقوش بھی اجاگر کیے ہیں جن سے امام کی سیرت کا ایک خاکہ بہرحال تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کمال احتیاط کے علاوہ امام کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مسائل و فتاوی کا جواب ہمیشہ دِقّتِ نظر اور کاوشِ فکر سے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک صاحب سے بیان کیا کہ "اس کے لئے کبھی کبھی خواب و خور حرام ہو جاتی ہے۔" (ص ۶۰)

اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہوتی اور کوئی اصلاح کر دیتا تو غور کرنے کے بعد فوراً تسلیم کر لیتے۔ ساٹھ برس تک اسی طرح خدمت فتاوی میں مصروف رہے اور ۸۶ برس کی عمر میں ۱۷۹ھ میں انتقال ہوا۔

امام کے اخلاق کے متعدد بنیادی پہلو بھی اجاگر کیے گئے ہیں مثلاً زہد و تقویٰ، طاعت الٰہی، حبِ رسول اور حبِ مدینہ کے مابہ الامتیاز اوصاف سے وہ متصف تھے۔ اس کے علاوہ ان کا حلیہ و پوشاک، طلبِ علم میں ان کی محنت و شفقت، اہل علم کی عزت و محبت، استقلال، حق گوئی، خودداری، آزادیٔ رائے، انصاف پسندی، عفو و حلم، مہمان نوازی کی

فیاضی[1] اور صبر و توکل وغیرہ پر اجمالی و تفصیلی روشنی ڈالی ہے، طریقۂ درس کے سلسلے میں ان کے مزاج کی غایت درجہ صفائی و نزاہت کا تذکرہ پہلے ہی آچکا ہے۔ اس وصف میں کم ہی لوگ ان کے مدمقابل ٹھہریں گے۔

تزکیۂ نفس اور علم و عمل کی مشغولیت و انہماک کے سبب دیگر بزرگانِ دین کی طرح امام مالک کو بھی اپنی سوانح کے متعلق اشارے دینے کی فرصت کہاں ملی ہوگی اس کے باوجود سوانح نگار کی نکتہ آفرینی بعض اشاروں سے ہی بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتی ہے۔ امام مالک کی تصنیف و تالیف کے لئے بھی مصنف کے پاس مواد کی قلت ہے اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ بھی منتشر حالت میں اور ضمنی طور پر بیان کر دیا ہے لیکن اگر امام صاحب کی خامیوں اور کمزوریوں کی تلاش سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو سید صاحب کی یہ ناقص سوانح ہی امام کی شخصیت کا اچھا خاصا مرقع پیش کر دیتی ہے اور یوں بھی اکابر بزرگانِ دین کی زندگی میں عیوب اور برائیوں کی تلاش کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور اس لحاظ سے سید صاحب اپنی اس سوانح میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

---

[1] "تمام توڑے امام شافعی کو دے دیئے۔ ہر سال انھیں گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔"

(حیات مالک ص ۷۵)

حیاتِ شبلی

سید صاحب کی سوانحی تصانیف میں ”حیاتِ شبلی“ کو اہم ترین درجہ حاصل ہے۔ مولانا شبلی ایک عظیم، پُر وقار اور خاصی پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ زندگی کے آخری دس برسوں میں سید صاحب ان کے سب سے زیادہ قریب رہے۔ اس لئے ماضی کی تمام معلومات کے ساتھ ساتھ اس دور کے متعلق سید صاحب سے زیادہ واقف کار کوئی دوسرا صاحب قلم اور سوانح نگار نہیں تھا۔ نیز یہ آخری دور علامہ شبلی کی زندگی میں متعدد وجوہ سے کچھ زیادہ اہم بھی ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر سید صاحب نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے معتبر اور مستند مآخذ کی مدد سے حیات شبلی کا شاندار مرقع تیار کیا ہے۔

”حیات شبلی“ میں بارہ صفحوں کا پیش لفظ، پچاس صفحوں کا دیباچہ اور اتنے ہی صفحات پر مشتمل مقدمہ، یہ سب سوانح نگار کے تخلیقی مزاج، تاریخی ذوق اور تنقیدی شعور کے مظہر ہیں۔ دیباچہ میں شبلی کے علمی کارناموں کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور مقدمہ میں ہندوستان میں مذہب اسلام کے ارتقاء اور مسلمانوں کی مختصر تاریخ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شبلی کی جائے ولادت اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں مسلم علماء و مفکرین اور درس و تدریس کے ماہرین کا درجہ متعین کیا گیا ہے تاکہ وہ شبلی کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں پس منظر اور فضا کا کام دے سکے۔ اس کے بعد حیاتِ شبلی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

شبلی، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ۱۰ مئی کو پیدا ہوئے اور پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں نومبر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ (از ہنگامہ تا ہنگامہ) وہ نسلاً راجپوت مسلمان، راسخ العقیدہ حنفی المسلک، عالم دین، سیمابی شخصیت کے مالک، شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے، صاحب طرز

نثر نگار اور نقاد، قادر الکلام شاعر تھے، اسی درجہ کے اسکالر، دریائے علم کے غواص اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ تاریخ و کلام ان کا علمی میدان تھا۔ سیاست اور قومی کاموں میں ایک بڑے رہنما کی طرح سرگرم اور فعال تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک جذباتی مسئلہ "خلافتِ عثمانیہ" ترکی خلافت کے حامی اور انگریزوں کے مخالف تھے۔ حکومت میں جمہوریت ان کا مسلک اور مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی آزادی، خودمختاری ان کا نعرہ تھا۔ تحریری میدان میں علمی، مذہبی، تاریخی تحقیقی، سوانحی تنقیدی، کلامی، سیاسی، سماجی اصلاحی اور شعری تصنیفات و تالیفات بحرِ ذخّار کی حیثیت رکھتی ہیں اور قومی کاموں میں ندوہ اور دارالمصنفین ان کے خواب کی بہترین تعبیر ہیں اور یہ دونوں ادارے صرف ادارے ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ علی گڑھ کالج میں سترہ سال پروفیسر رہے اس کالج سے ذہنی طور پر انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور کالج کو اور پوری قوم کو وہ بہت کچھ دے گئے، قوم کے مزاج میں اعتدال لے آئے حالات کی جو پیچیدگیاں تمام متحرک بڑی شخصیتوں کا مقدر ہوتی ہے ان کا مناسب حصہ انھیں بھی ملا۔ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی ہمہ جہت اصلاح و ترقی کے لئے پوری قوت کے ساتھ جن مفکرین نے کوششیں کیں اور باقاعدہ ایک تحریک کے دبستان کی حیثیت اختیار کر لی، ان میں سرسید کے بعد شبلی ہی کا نام سرفہرست ہے۔ وہ انتہائی خوددار، بلند ہمت، وضعدار، زود حس اور رقیق القلب تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بہت بلند تھے۔ ہمدرد تھے لیکن مستغنی، زود اشتعال تھے لیکن محتاط، وہ ادیب و شاعر بھی تھے اور بہتر سے بہتر جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں پر جو احسانات کئے ہیں ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل حیاتِ شبلی لکھ دینے کے بعد بھی شاگرد ان کے احسانات کا عشر عشیر بدلہ بھی نہیں پیش کر سکا ہے"۔ "حیاتِ شبلی" اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

چونکہ سوانح نگار گہرا تاریخی ذوق و شعور رکھتا ہے اور اس کی نظر میں صاحب سوانح کی زندگی کا ہر اہم واقعہ اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے اس لئے تام و کمال

وہ پس منظر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ شبلی کے جد امجد کا داخل اسلام ہونا اطرافِ اعظم گڑھ کی ایک خاص فضا میں ہی ممکن ہو سکا۔ شبلی کی تعلیم و تربیت کی آنکھ اسی ماحول میں کھلی جس میں شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تحریکات مذہبی نشاۃ الثانیہ کا سبب بنی تھیں۔ شبلی نے سب کچھ اس ماحول کی درسگاہوں سے سیکھا۔ پھر خود بھی اس تحریک کو جلا بخشی اور اپنے دور کے مایہ ناز مسلم مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں ان کی علمی لگن، علی گڑھ کالج سے منسلک ہونا اور پھر اس سے سبکدوش ہونا، ندوہ کا قیام، الندوہ کا اجراء، سیرتِ نبوی کی تالیف میں کوششیں اور دارالمصنفین کا قیام خاص طور سے موضوعِ بحث بنی ہیں۔

حیاتِ شبلی ایک تاریخی سوانح ہے لیکن ایسا کم ہوا ہے کہ تاریخی رو میں مصنف نے سوانحی آداب کو یکسر نظر انداز کر دیا ہو۔ جہاں کہیں سوانحی اصولوں کو ٹھیس پہنچی ہے۔ وہاں تاریخیت کے ساتھ ساتھ استاد (صاحب سوانح) کی عقیدت کو بڑا دخل ہے۔ سید صاحب اپنے استاد کی سوانح لکھ رہے تھے اس لئے ان کے ذہن سے خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کے مشرقی مقولہ کا محو ہو جانا مشکل تھا۔ پیش کش کے انداز میں "حیات جاوید" کا اثر بھی خاصا نمایاں ہے۔ سید صاحب کے لئے اپنے موضوع "شبلی" کا انتخاب کر لینے کے بعد فراہمی مواد، ترتیب سوانح، طرز استدلال اور اسلوب بیان کے جو مواقع میسر تھے اُس پر دُنیا کی بہتر سے بہتر سوانح لکھی جا سکتی ہے اور سید صاحب نے اس کی کوشش کی لیکن سوانح نگار کے لئے موضوع سے ہمدردی اور جانبداری کے ساتھ غیر جانبداری اور لاتعلقیت کی ناگزیریت مسلم ہے۔ موصوف اس سے بہت دور رہیں اسی وجہ سے شبلی کی بعض خامیوں اور کمزوریوں پر یا تو خاموش ہیں یا پھر ان کی تاویلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب خواہ یہی ہو کہ استاد سے گہری محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی پیدائش کو وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے ہوں۔

> "اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے لیکن اس یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس

کے لئے ظاہری تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کر کے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔ جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے"۔

یہ بات خلافِ توقع نہیں لیکن سوانح میں شخصیت کے مطابق واقعات کی تدریج و منطقیت اور شخصیت کی بوقلمونی پر نظر رکھنا جتنا ضروری ہے اتنا کچھ اور ضروری نہیں۔ حیاتِ شبلی کا مصنف اس میں ہر موقع پر کامیاب نہیں رہا [illegible] نے اپنی پسند کے مطابق جس پہلو کو زیادہ اہم بلکہ بہتر سمجھا ہے وہاں دلایل کا ایک انبار لگا دیا گیا ہے اور جو گوشے تشنہ ہیں یا پسند کے معیار پر پورے نہیں اترتے اُن کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا ہے۔

شبلی کی تکمیلِ تعلیم کے بعد ذریعہ معاش کے سلسلے میں مختلف مشاغل اختیار کرنا، علی گڑھ کالج کا آخری زمانہ اور ندوہ میں ان کے آخری دو تین سال ان کی شخصیت کی پیچیدگی اور سیاب وشی کے اظہار کے لئے زیادہ اہم نقطے ہیں۔

شبلی نے عربی تعلیم کی تکمیل کے بعد والد کے اصرار پر بڑی بددلی سے وکالت پڑھی کالج میں گھر آ کر اپنے چھوٹے بھائی مہدی کو بھی چند مسایل یونہی بتا دیا کرتے تھے جنھیں وہ یاد کر لیتے تھے جب امتحان کا وقت آیا تو تیاری نہ ہونے کی وجہ سے امتحان دینا نہیں چاہتے تھے لیکن مجبوراً دینا پڑا۔ بھائی تفریحاً امتحان میں شریک ہو گئے تھے وہ تو پاس ہو گئے شبلی فیل ہو گئے۔ سفارش لے کر وہ الہ آباد میں ممتحن کے پاس بھی گئے لیکن کامیابی نہ ہو سکی اور بالآخر آئندہ سال کامیاب ہو سکے۔ والد کے اصرار پر یہ وکالت

شروع کی لیکن یہ پیشہ ان کی طبعی حق گوئی سے میل نہیں کھاتا تھا اس لئے چھوڑ دیا اور قائم مقام نقل نویس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ وہاں دس روپیہ تنخواہ ملتی تھی جس میں نو روپیہ مکان سے کچہری تک کرایہ آمد و رفت صرف ہو جلتے تھے۔ اس کے بعد قرق امین کی عارضی آسامی پر کام کیا اور اس کے فرائض اس طرح انجام دیئے کہ

> " اہلِ معاملہ کے یہاں کھانا پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایہ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے۔ گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ تپتی ہوئی دوپہر میں روزہ رکھے ہوئے گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرتے، افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا۔ سائیس دال چاول اُبال دیتا اسی کو کھا لیتے۔ ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے۔ (ص ۱۱۵)

کچھ دن والد کے ساتھ نیل کی تجارت کا کام بھی کیا لیکن بالآخر ایک ملاقات کے دوران سر سید نے ان کی علمی استعداد کو پرکھ لیا اور چالیس روپیہ ماہوار پر کالج میں عربی و فارسی کی پروفیسری پر تقرر کر دیا۔ شبلی شروع ہی سے صحیح معنی میں طالب علم، کالج میں آنے سے قبل کئی رسالوں کے مصنف اور استعداد کے اعتبار بہت بلند پایہ تھے یہاں تک کہ اس عہد کے عظیم عربی اسکالر مولانا حمید الدین فراہی بھی ان کو سند مانتے اور لوگوں کے استفادہ کے لئے شبلی کے پاس بھیجتے تھے۔ کالج کے ماحول نے ان کی شخصیت کو نکھار کر تابناک بنا دیا اور انھوں نے یہاں سے دو چیزیں لیں، اپنے لئے مغربی اندازِ فکر اور طرزِ استدلال اور قوم کے لئے عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی سے واقفیت اور مغربی علوم کے مطالعہ کی اہمیت کا احساس۔ یہاں انھیں جو مواد، حوالے اور کتابیں ہاتھ آئیں، ان کی بنیاد پر انھوں نے اعلیٰ درجہ کی تصانیف قوم کی خدمت میں پیش کیں۔ علمائے دین کے سامنے جدید انداز میں دینِ حنیف کی خدمت کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا اس کا قوم پر گہرا اور دور رس اثر مرتب ہوا، انگریزوں سے ہمدردی، اثر پذیری ان کی پیروی اور اطاعت شعاری کے سلسلے

میں سرسید اور شبلی کی رائے میں شروع سے ہی اختلاف تھا۔ بحیثیت حاکم انگریزوں کی حمایت کو سرسید اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ شبلی انگریزوں کی اسلام مخالف سرگرمیوں پر نکتہ چینی کرتے رہے تھے۔ سرسید کو مولانا شبلی کا یہ عمل پسند نہیں تھا۔ سرسید کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ حکمراں طبقہ کو ساتھ لے کر ہی تعلیمی تحریک میں مدد اور ترقی ہو سکتی ہے، ان سے بگاڑ کر قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کالج کے مفاد میں انگریزوں کو مشتبہ نگاہ سے دیکھنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیں۔ اس کے برعکس شبلی یہ سمجھتے تھے کہ لارڈ میکالے کے پروگرام کے تحت ہندوستانی مسلمان کلرک سے زیادہ کچھ نہیں بن سکے گا۔ انگریز اور عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے خلاف جن سازشوں پر عمل پیرا ہیں ان پر اگر انھیں متنبہ نہ کیا گیا اور عوام میں بیداری پیدا نہ ہوئی تو ان سے جس قدر نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ اس کی تکمیل کا جو منصوبہ ہے اس میں انھیں مزید سہولت ہو جائے گی۔ لیکن اس مسئلہ پر ان دونوں بزرگوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ سرسید مضبوطی سے اپنے خیالات پر جمے رہے اور وہ کالج کی پوری برادری سے بھی انگریزوں کی حمایت اور تائید کے خواہاں ہو گئے۔ قومی بھلائی کے اس پہلو یعنی انگریزوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں انھوں نے جو اجتہادی غلطی کی تھی اس سے ہٹنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔ غالباً تاریخ کے مطالعہ نے ان کی ذہنی رہنمائی کی تھی کہ آریہ اور مغل ہندوستان میں باہر سے آئے اور انھوں نے صدیوں تک یہاں حکومت کی۔ انگریز تو ان سب سے زیادہ متمدن، ذی شعور جدید ترین وسائل کو محیط حکمرانی کی صلاحیت رکھتے ہیں یہ تو شاید ہندوستان پر ہزاروں سال حکومت کریں گے اس لئے ان سے بغاوت کر کے مسلمانوں کو لامحالہ نقصان ہی پہنچے گا۔ بہرحال شبلی اپنی مناسب حدود تک ان کے ساتھ رہے اس سے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ سرسید و شبلی کے درمیان اختلافات کے آغاز و انجام کا بنیادی محور یہی ہے۔ اختلافات عروج پر پہنچ گئے۔ سرسید کی زندگی تک تو وضع داری قائم رہی لیکن ان کی وفات کے بعد شبلی نے کالج سے سبکدوشی اختیار کی۔

اس سلسلے کی دوسری چیز یہ بھی ہے کہ شبلی نے ناموران اسلام کی تصنیف کا سلسلہ

شروع کیا تھا اور وہ الفاروق لکھنا چاہتے تھے، سرسید کو خیال ہوا کہ اس کی اشاعت سے کالج کے ہمدردوں کا شیعہ طبقہ کالج سے بددل ہو جائے گا اس لئے انھوں نے شبلی کو الفاروق کی تصنیف سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی حتیٰ کہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو شبلی کی شکایت کا ایک خط بھی لکھا۔[1] نواب صاحب نے اپنے جواب میں الفاروق کی تصنیف کی حمایت کی لیکن سرسید اسے ذاتی مسئلہ بنا چکے تھے اس لئے مخالفت جاری رہی اور شبلی بھی ضد کے پکے تھے، وہ اپنے ارادے سے باز آنے کے بجائے اس کی تکمیل کے لئے ہمہ تن منہمک ہو گئے اور قسطنطنیہ کا اہم سفر بھی اسی غرض سے کیا۔ ایک تیسری چیز یہ تھی کہ سرسید شبلی سے اپنی سوانح لکھوانے کے شدید خواہش مند تھے لیکن جب یہ ممکن نہ ہو سکا تو قرعہ حالی کے نام نکلا۔

بہر حال شبلی اور سرسید کے اختلافات پر سید صاحب نے بہت واضح، مدلل، تفصیلی، دستاویزی اور بڑی حد تک غیر جانبدارانہ روشنی ڈالی ہے اور اس بحث نے اس گوشہ پر مزید مطالعہ کے امکانات کو اجاگر کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام حقایق کی پیش کش میں سید صاحب نے شبلی کے زود اشتعال اور حیرت خیز مزاج کو نظر انداز کر دیا ہے جس کا بعض جگہ انھوں نے خود بھی تذکرہ کیا ہے اور خصوصاً "شبلی نامہ" میں اکرام صاحب نے اس سے بہت اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔ کالج میں سرسید کے اختلافات کے دوران شبلی سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئیں اور بلا شبہ وہ غیر معمولی نہیں تھیں لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحب کے سامنے استاد کی عقیدت حائل ہو گئی یہ ممکن ہے کہ نتیجہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتا لیکن یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ یہ پہلو مزید دلچسپ ہو کر سامنے آ جاتا۔

اس کے علاوہ شبلی نے خلافِ معمول بمبئی کے دورانِ قیام (۱۹۰۶ء) اور اس کے بعد "دستۂ گل" کے نام سے غزلوں کا ایک مجموعہ تیار کر لیا تھا۔ اس کی رنگینی اور زیر سطح ہیجان انگیزی نے مولانا شبلی کی ثقاہت کے بارے میں سوال کھڑے کر دیئے۔ استاد کا دفاع شاگرد پر لازم ہوا۔ چنانچہ شبلی کے بعض مکاتیب کے حوالے سے ابتداً اس کا صحیح تعارف کرانے کی کوشش کی

---

[1] حیات شبلی ص ۲۲۲۔ پر یہ خط نقل کر دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں شبلی گروپ نے اسے کس طرح حاصل کیا۔

بمبئی کی خوشگوار فضا اور دلکش منظر کو اس کی شانِ نزول قرار دیا۔ اس کی اثر انگیزی اور ولولہ خیزی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشم ساقی کی مستی بھی آمیز ہے خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے۔

آں شد اے دوست کہ آراستئہ پیکر و فن نقشِ زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام
آں شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بیچی بازم کہ دم از صحبتِ آں دشمن ایماں زدہ ام

لیکن جب شیخ اکرام نے آخری شعر کا انتساب عطیہ بیگم فیضی کے نام کیا تو سید صاحب نے استاد کی حمایت میں اس کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا۔ "وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس "دشمنِ ایمان" کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی یہ کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے"[1]

اکرام نے شبلی کے اس مجموعۂ غزل "دستۂ گل" کو فیضی کا فیض بتایا ہے اور شبلی کی جمالیاتی حس کو بہت لطیف قرار دیا ہے اور بمبئی جا کر شبلی کے بدلتے ہوئے اور بدلے ہوئے مزاج پر اس سے استدلال کرتے ہوئے کنایہ کے طور پر لکھا کہ

> "دستۂ گل صحیح معنوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ ہے اور پھول بھی ایسے جن کی شادابی اور خوبیٔ رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ یہ غزلیں الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی اور طرزِ ادا کی شستگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں لیکن جذبات کی شدت دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست طوفانی دریا ہے جو مدتوں اینٹ پتھر کے ایک بند سے ٹکرا رہا ہے۔ اور اب بند توڑ چکا ہے اور پورے زور و شور سے بہہ رہا ہے"[2]

سید صاحب کو اس خیال سے اتفاق نہیں لیکن اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ

---

[1] حیات شبلی ص ۴۵۳

فرمایا اس سے مترشح ہوتا ہے کہ موصوف کے پاس دلائل مستحکم نہیں ہیں اور اس موضوع پر بہت زیادہ کلام نہیں کرنا چاہتے اس لئے صرف اتنی گفتگو کر کے بات ختم کر دی ہے ۔

"یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں معاصر شعراء نے جوابی غزلیں لکھیں جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے اسرار و رموز سمجھے اور مولانا سے دستِ بیعت ہونے اور ان کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں، جو بدگمان تھے وہ اس وصف عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے، حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا کہ نہ وہ بلکہ بمبئی کی خوش سوادی اور حسن منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا۔"

"خطوط شبلی" کے اوراق میں یہ سامان نہیں، ان کی تاریخ دو برس کے بعد ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے۔[1]

"خطوط شبلی" بھی شبلی کی سیرت و شخصیت کا ایک دلچسپ عنوان ہے۔ سید صاحب کی سعادت مندی و ثقاہت اس پر گفتگو بھی کرنے سے محتاط و محترز رہی ہے جبکہ اکرام صاحب نے شبلی نامہ کی تعمیر ہی کلام شبلی بالخصوص "دستۂ گل" اور "خطوطِ شبلی" سے کی ہے اور شبلی و فیضی کے خطوط سے اپنے اظہار مقصد میں فائدہ اٹھایا ہے۔ شبلی خط لکھنے میں محتاط تھے اس کے باوجود "خطوط شبلی" ان کے ایسے مکاتیب کا مجموعہ ہے جن سے اکرام صاحب نے ان کی شخصیت کے شاعرانہ اور جمالیاتی پہلو کے سلسلے میں بڑے اہم نتائج نکالے ہیں۔ اور عطیہ بیگم فیضی سے ان کے مراسم پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت و شاعری میں تابناکی و رعنائی کو بمبئی کے قیام کا فیض بتایا ہے۔ یہاں اکرام گویا ہیں اور سید صاحب خاموش۔ محمد ابن زبیری صاحب کی تالیف "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" اکرام صاحب سے بھی چند قدم آگے بڑھی ہوئی ہے۔

"حیاتِ شبلی" میں موضوع سے لاتعلقیت کی مثالیں بلاشبہ بہت کم جگہ ملتی ہیں لیکن موضوع سے سوانح نگار کو جس ہمدردی اور تعلق کی ضرورت ہوتی ہے وہ سید صاحب کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اکرام کے یہاں اس کا برعکس ہے۔ شبلی مشرقیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ سوانح نگار کے لئے ان پر مخالف و منفی مواد کا بھی

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۵۲م

تذکرہ و گفتگو لازمی ہے لیکن ان کی دیو قامت شخصیت کا احترام بھی ضروری ہے اکرام ان سے عاری ہیں۔

> "خطوطِ شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے، بظاہر تو یہ چند صفحات کا مختصر رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں محبت کا مکمل ڈرامہ کیا ہے"[1]

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ حیاتِ شبلی، حیاتِ جاوید کی طرح شبلی کی ترجمانی ہے ان پر تنقید نہیں[2] لیکن اس بات سے قطع نظر کہ اس میں بہت سی فنی خامیاں ہیں اچھے سوانح نگار کو پہلے ایک خاص حد تک صاحب سوانح کا ترجمان بننا ہوتا ہے تبھی صحیح تنقید ممکن ہے۔

حیات شبلی کی ان خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے دیباچہ سے شبلی کے کارناموں کے ذریعہ اردو زبان و ادب پر مرتب ہونے والے اثرات اور شبلی نے اردو کو جو لافانی اسلوب عطا کیا اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز حیاتِ شبلی میں جو مواد پیش کیا گیا ہے اس سے اردو اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے بہت سے گوشے واشگاف ہوئے ہیں اور سرسید و شبلی کے اندازِ فکر کا فرق سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس کے لئے سرور صاحب کی یہ بات آج بھی درست ہے کہ "دراصل ہمارے دور کو صرف سرسید اور صرف شبلی کے بجائے دونوں کی ضرورت ہے"۔[2]

مجموعی حیثیت سے "حیاتِ شبلی" مواد کی جامعیت سائنٹیفک طریقۂ کار کی کوشش، ترتیب کی عمدگی، بیان کی خوبی، مفصل فہرست مضامین اور تفصیلی اشاریوں کے اندراج کے باوجود (۱) ہیرو کی حمایت میں اس کی بعض کمزوریوں کی پردہ پوشی اور خامیوں پر تاویلات کا شکار ہے۔ (۲) تاریخی پس منظر مناسب ہونے کے باوجود کئی جگہ ضرورت سے زیادہ طول ہو گیا ہے جس کی متحمل سوانح عمری نہیں ہو سکتی۔ جزئیات نگاری بری چیز نہیں لیکن اگر زندگی کی ایک ایک بات کو پیش کر دیا جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں۔ اس لئے صرف ان جزئیات کا انتخاب کرنا ضروری ہوتا ہے

---

[1] شبلی نامہ ص ۲ [2] تنقیدی اشارے ص ۴۵۱۲

جو شخصیت کی تعمیر میں لازمی طور پر معاون ہوں۔ حیاتِ شبلی اس حسن سے عاری ہے۔ غرض یہ کتاب فنی خوبیوں سے معمور ہے اور خامیوں سے منزہ نہیں ہے اور بقول اکرام

> "سید سلیمان نے حیاتِ شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاجِ فضیلت چھین لیا ہے جو حیاتِ جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔"[1]

خیام۔ سوانح نگاری کی روشنی میں

سید صاحب کی تصنیف "خیام"، بنیادی طور پر ایک تحقیقی کتاب ہے جو "خیامیات"، کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ گزشتہ اوراق میں تحقیق کے ضمن میں اس پر کلام کیا جا چکا ہے۔ خیام کی سوانح پر بھی اس میں وافر مواد موجود ہے اور اس کے متعلق بعض بالکل نئی چیزیں پیش کی گئی ہیں، بعض پرانی باتوں کو نئے ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے اور بعض ابہامات کی توضیح اور غلط بیانیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ کوئی دوسری مربوط کتاب تو کجا کوئی مضمون بھی ایسا موجود نہیں ہے جو خیام کی زندگی کا صحیح خاکہ ہی پیش کر سکے اور اس کتاب میں سوانح کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر بھی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ اس لئے شخصیت کی ارتقائی مربوط شکل یہاں بھی بمشکل نکل سکتی ہے تاہم اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک تاریخی ادبی سوانح کے ضروری اجزا سمجھے جاتے ہیں اور یہ سب متفقہ طور پر مستند ہیں۔ حیات خیام سے متعلق اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے سوانحی اجزاء کا انتخاب کر کے یہاں اس کی تلخیص پیش کی جائے۔ اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ خیام کی مستند حیات کے ساتھ ساتھ سوانح نگار کی کاوش و دیدہ ریزی بھی اس میں منعکس ہو گئی ہے۔

---

[1] شبلی نامہ ص ۲

ولادت : خیام کی تاریخ پیدائش کسی مستند تذکرہ یا تاریخ میں تحریر نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی ولادت کا زمانہ ۴۱۰ھ کے قریب مانا ہے اس کی بنیاد صرف نظام الملک اور حسن صباح کی ہمدرسی و ہم سنی کی داستان ہے۔ نظام الملک کی پیدائش ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہے۔ اس پر خیام کا سالِ ولادت بھی قیاساً ۴۱۰ھ مان لیا گیا ہے لیکن اب جب کہ یہ داستان خود ہی بے اصل ثابت ہو چکی ہے یہ قیاس بھی غلط ہو جاتا ہے۔

خیام کی وفات ۵۲۰ھ سے چند سال پہلے ثابت ہے لہٰذا اس کی پیدائش پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں صرف اس وقت فرض کی جا سکتی ہے جب اس کی عمر کو غیر معمولی اور غیر طبعی تسلیم کر لیا جائے یعنی تقریباً ایک سو سولہ سال جس کا ذکر کسی قدیم کتاب میں دستیاب نہیں ہے بیہقی اور نظامی عروضی سمرقندی جنھیں خیام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، ان ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہیں بھی اس کی غیر طبعی عمر اور قوت کا تعجب کے ساتھ ذکر نہیں کرتے جیسا کہ عموماً اس قسم کے مستثنیٰ عمر والوں کے حالات میں مؤرخین نے کیا ہے۔

حیاتِ خیام کے مختلف واقعات کی تحقیقات اور حالاتِ خیام کی چھان بین سے اس کا سالِ ولادت ۴۴۰ھ یا ۴۴۱ھ قیاس میں آتا ہے۔

وطن : تاریخ الفی کے علاوہ تمام کتابوں میں خیام کا وطن نیشاپور مذکور ہے۔ تاریخ الفی کے مصنف نے نہ معلوم کس ماخذ سے خیام کو بلخ کے ایک قریہ شمشاد کا ساکن اور بسنگ تاریخ استرآباد کو اس کا مولد قرار دیا ہے[1] اور بعض مورخین کے بیان سے بلخ اور استرآباد میں اس کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔

دراصل خیام کا ابتدائی قیام بلخ میں رہا ہے۔ اس لئے بعض لوگوں نے بلخ اور استرآباد کو غلطی سے اس کی جائے پیدائش سمجھ لیا ہے۔

۵۰۶ھ میں نظامی عروضی کی ملاقات بھی خیام سے بلخ ہی میں ہوتی ہے پھر وہ

---

[1] مظفریہ ص ۳۲۷

خاقان بخارا شمس الملک کے دربار میں بھی نظر آتا ہے مگر بقول مصنف تاریخ الفی "توطن اکثر اوقات در نیشاپور داشت"۔

تصانیف خیام میں اس کی جائے قیام اور مسکن کی نسبت کوئی واضح اشارہ موجود نہیں البتہ ایک رباعی جو رباعیات کے تمام نسخوں میں پائی جاتی ہے اس میں ایک شعر ہے۔

چوں عمر ہمی رود چہ بغداد چہ بلخ
پیمانہ چو پر شود چہ شیریں و چہ تلخ

اس شعر میں ان دونوں شہروں کا ذکر ہے یعنی بلخ اور بغداد جہاں اس کی اقامت اکثر رہی ہے۔

نام و نسب : خیام کا نام عمر اور اس کے باپ کا نام ابراہیم تھا۔ یہ بات حیات خیام کے تمام لکھنے والوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

عام طور سے وہ خیام کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں اسے عموماً خیام اور کبھی کبھی خیامی اور عربی کی کتابوں میں عام طور سے خیامی کہتے ہیں بالخصوص اپنی کتابوں میں وہ خود کو خیامی ہی لکھتا ہے۔ البتہ رباعیات میں تخلص خیام لاتا ہے۔

خیام عربی میں خیمہ دوز کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں خیمہ دوزی کا پیشہ ہوتا تھا علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں خیام کی نسبت نقل کی ہے اور اس کے معنی خیمہ دوز ہی بتائے ہیں۔ قاضی محمد بن عبدالرحیم نسوی جو ابن سینا کا شاگرد ہے اس نے خیام کو ایک خط لکھا ہے جس کے جواب میں خیام کا رسالہ "کون و تکلیف" ہے۔ اس خط کے شروع میں نسوی نے خیام کی تعریف میں چند عربی شعر بھی لکھے ہیں ان اشعار میں اس کو الخیمی لکھا ہے۔ خیمی خیم کی طرف منسوب ہے جو خیمہ کی جمع ہے اور جس کے معنی خیمہ والے کے ہیں اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ خیامی خیمہ ہی کی طرف منسوب ہے نہ خیام نام کے کسی قبیلہ کی طرف۔

اہل و عیال : خیام کے بارے میں عام خیال یہ طے ہے کہ اس نے تجرد کی زندگی

گزاری ہے۔ "نظام الملک طوسی" کے مصنف نے خاقانی کے چچا کافی الدین عمر بن عثمان شروانی کے اشتباہ کے سبب اس غلط فہمی میں اور اضافہ کیا ہے اس لئے کہ وہ بقول خاقانی زندگی بھر مجرد ہی رہے ہے۔ خیام کے بارے میں یہ خیال درست نہیں ہے۔ ابوالحسن بیہقی جو خیام کے سب سے پہلے سوانح نگار ہیں انھوں نے خیام کی وفات کا واقعہ خیام کے داماد امام محمد بغدادی کے واسطے سے بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام نے شادی کی تھی اور اس کی اولاد میں کم از کم ایک لڑکی ضرور تھی جس کی شادی اس کی زندگی ہی میں محمد نام کے کسی بغدادی کے ساتھ ہوئی تھی۔

دولت شاہ سمرقندی نے خیام کی اولاد میں ایک شاعر ملک الکلام شاہ پور اشہری نیشاپوری کا نام لیا ہے۔ شاہ پور ظہیر الدین فاریابی کا شاگرد اور سلطان محمد بن تکش خوارزم شاہ کے دفتر افتا کا منصب دار تھا۔ دولت شاہ نے اس کی ایک غزل بھی نقل کی ہے۔

تعلیم: خیام کے کسی سوانح نگار نے یہ نہیں لکھا کہ اس کی تعلیم و تربیت کب کہاں اور کس ماحول میں ہوئی اور اس کا یہ علم و فضل کن اساتذہ کے فیض تربیت کا مرہون منت ہے۔

نیشاپور عرصۂ دراز سے علم و فن کا مرکز بن چکا تھا۔ خاص طور سے مدرسۂ نظامیہ کے قیام کے بعد تو اس کی شہرت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ خیام نے جس دور میں ہوش سنبھالا اس وقت اس کا وطن نیشاپور دنیائے علم و فضل میں سارے جہاں میں مشہور تھا اور وہاں تحصیلِ علم کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں لکھا ہے کہ نظام الملک پہلا شخص ہے جس نے مدارس قائم کئے لیکن سبکی نے طبقات[1] میں کئی دوسرے مدرسوں کا ذکر کیا ہے جو مدرسہ نظامیہ سے پہلے نیشاپور میں قائم ہو چکے تھے ان میں مدرسہ بیہقیہ، سعیدیہ وغیرہ خاص طور پر مشہور تھے۔ غرض کہ خیام کے ہوش سنبھالتے وقت نیشاپور میں متعدد باقاعدہ درسگاہیں اور علمی مجلسیں

---

[1] طبقات سبکی ج ۳ ص ۱۳۷۔

قائم تھیں انھیں کے آغوش میں پل کر خیام جوان ہوا ہوگا۔ اگر سنین کا لحاظ رکھا جائے تو امام الحرمین، امام موفق یا ان کے صاحبزادے امام ابوسہیل کی مجالس میں خیام نے مذہبی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ عالی رومی[1] نے ربیع المرسوم میں نقل کیا ہے کہ خیام نے سنائی کے استاد شیخ محمد بن منصور سے پڑھا اور سترہ برس کی عمر میں اپنے ہم عصروں میں سب سے بڑھ کر کمال حاصل کیا۔ خیام کے ہیئت کے اساتذہ میں ابوالحسن الانباری کا نام نمایاں ہے۔ اس کا ذکر بیہقی، شہرزوری اور محمد بن یوسف طبیب ہروی نے اپنی تصانیف[2] میں کیا ہے۔

فلسفہ میں خیام نے کس کی شاگردی اختیار کی یہ معلوم نہیں۔ رسالہ کون و تکلیف میں خیام نے ابوعلی سینا کو اپنا استاد کہا ہے اس میں شک نہیں کہ خیام اس سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اس کی تصانیف سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ وہ ابوعلی سینا کو افضل المتاخرین کے نام سے یاد کرتا ہے اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ابن سینا کی کتاب شفا کے مطالعے میں مصروف نظر آتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس نے فلسفہ کا درس ابن سینا سے تو نہیں البتہ اس کے تلامذہ میں سے کسی سے لیا ہو۔ ابن سینا کے ان تلامذہ میں حکیم ابومنصور حسین بن طاہر بن زیلہ اصفہانی اور بہمنیار آذربائیجانی متوفی ۴۵۸ھ اور قاضی محمد بن عبدالرحیم نسوی اس وقت موجود تھے۔ خیام کا معاصر ابوالعباس لوکری اسی بہمنیار کا شاگرد تھا ممکن ہے خیام نے بھی اسی سے استفادہ کیا ہو۔

فضل و کمال: تمام تذکرے متفق ہیں کہ فلسفہ اور حکمت میں ابوعلی سینا کے بعد خیام ہی کا درجہ تھا بیہقی میں ہے کہ ”علم و حکمت کی مختلف قسموں میں ابوعلی کے بعد وہی تھا اور فلسفہ، رباعیات اور معقولات میں تو وہ یگانۂ روزگار تھا۔

قفطی نے (بدظن ہونے کے باوجود) خیام کو پیشوائے خراسان و علامۂ زمان لکھا ہے۔ شہرزوری[3] نے اسے حکمائے خراسان میں سب سے بلند مرتبہ اور اصابت میں سب سے بڑا اور

---

[1] ربیع المرسوم، اعظم گڈھ ص ۱۲

[2] درۃ الاخبار، اورینٹل کالج میگزین لاہور ص ۵ء، بحرالجواہر فصل الف

[3] نسخہ ندوہ ص ۲۶

حسابیات میں سب سے بڑھ کر لکھا ہے۔

مشہور فارسی شاعر خاقانی نے ایک قصیدہ میں اپنے حکیم، ہندسں، فلسفی، اور ریاضی داں چچا کافی الدین عمر بن عثمان کو علم و فضل میں عمر خیام کا مثیل بنا کر گویا خیام کو علم و فضل میں ضرب المثل ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد خیام کے علم و فضل کی شہرت کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ بدنصیبی سے مشرق میں خیام اپنے تمام علوم و حکمت میں صرف نجوم کا ماہر مانا گیا اور مغرب میں ایک رند لاابالی اور بادہ پرست کی حیثیت سے مشہور۔ نظامی نے جو خیام کو اپنا استاد بھی کہتا ہے اسے چہار مقالہ میں منجم کی حیثیت سے پیش کیا ہے حالانکہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ خیام کو نجوم سے ذرا بھی عقیدت نہ تھی اور وہ اس علم کو بالکل لغو سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اس نے چہار مقالہ میں اسے منجمانہ کمالات کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کے احکام نجوم اس قدر مشہور تھے کہ لوگ ان کی مثالیں دیتے تھے اور منجمین اپنے علمی جھگڑوں میں اسے حکم بناتے تھے۔

علم طب میں بھی اس کا پایہ بلند تھا۔ بیہقی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک شاہ کا درباری طبیب تھا۔ چنانچہ ملکشاہ کے لڑکے سنجر کو بچپن میں چیچک کا عارضہ ہو گیا تھا تو خیام ہی نے اس کا علاج کیا تھا۔ امکان یہ ہے کہ امراء و سلاطین کے درباروں سے خیام کا ابتدائی تعلق اس فن یعنی طب کے ذریعہ ہوا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اس فن کو ”ذلیل بدنی اغراض“ کا نام دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی دوسری صلاحیتوں کو علم و فن کہتا ہے۔ جبر و مقابلہ کے دیباچہ میں افسوس کے ساتھ لکھتا ہے۔

„ذلیل بدنی اغراض کے علاوہ لوگ علم و فن کے قدر دان نہیں[1] معقولات کے علاوہ منقولات میں بھی اسے دخل تھا۔ وہ لغت، فقہ اور تاریخ کا عالم تھا قرائت

---

[1] مقدمۂ جبر و مقابلہ، خیام ص ۲ پیرس

کے علم سے مخصوص لوگوں ہی کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور بظاہر فلسفہ اور ریاضی کے ایک عالم کو اس علم سے تعلق پر تعجب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خیام اس علم میں بھی نہ صرف بلند مرتبہ کا حامل تھا بلکہ اس فنِ شریف میں بھی اسے حَکَم کا درجہ حاصل تھا۔ خواجہ نظام الملک کا بھتیجا عبدالرزاق ایک فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلطان سنجر کا وزیر بھی تھا شہاب الاسلام اس کا لقب تھا۔ اس کی مجلس میں کسی آیت کے اختلاف پر بحث تھی وہ اور امام القرا ابوالحسن غزالی اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اتفاقاً خیام آپہنچا دونوں نے کہا کہ "واقف کار" آگیا، مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ خیام نے قاریوں کے اختلافات کو ہر ایک کی علت کے ساتھ بیان کیا اور قرأت شواذ کی علتیں بھی بیان کیں اور پھر ان سب میں سے ایک قرأت کو ترجیح دی۔ قاری ابوالحسن غزالی اس کی ان تحقیقات کو سن کر دنگ رہ گئے اور فرمایا "خدا علما میں تمہارا جیسا اور پیدا فرمائے۔ مجھے قاریوں کی نسبت یہ گمان نہ تھا کہ ان میں سے کوئی اتنی معلومات رکھتا ہوگا چہ جائے کہ حکماء سے یہ امید رکھتا۔" (بیہقی، شہرزوری)

تفسیر قرآن بھی خیام کے دائرے کی چیز نہ تھی لیکن شہرزوری نے قاضی عبدالرشید بن نصر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرو کے حمام میں اتفاق سے ایک دفعہ خیام سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے دورانِ گفتگو خیام سے معوذتین کا مطلب پوچھا اور سورۂ ناس میں بعض الفاظ کی تکرار کی وجہ دریافت کی اس نے وہیں اپنی معلومات کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ خیام نے اس تفصیل سے ان سورتوں کی تفسیر بیان کی کہ اگر اس کو قلم بند کیا جاتا تو ایک ضخیم کتاب ہو جاتی۔ حالانکہ یہ وہ فن ہے کہ جس کی پشت پر خیام سوار نہیں ہوا تو اس علم کی نسبت قیاس کرو جس کی طلب و تکمیل میں اس نے اپنی جان کو محنت میں تھکا دیا تھا۔[1]

نظام الملک طوسی کے مصنف[2] نے قفطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ خیام یونانی زبان

---

[1] شہرورزی ص ۲۶

[2] نظام الملک طوسی ص ۸۰۹م، کانپور

جانتا تھا یہ مصنف کی غلط فہمی ہے اصل عبارت میں زبان یونانی نہیں علم یونان ہے یعنی وہ یونان کا علم جانتا تھا یعنی فلسفہ یونان نہ کہ زبانِ یونان۔

اگرچہ یہ بات سوانح خیام کے کسی ماخذ میں نہیں ملتی لیکن اس کے رسالہ "جبر و مقابلہ" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو ہندی ریاضیات سے واقفیت تھی۔ وہ لکھتا ہے

> "اہلِ ہند کو چند ایسے طریقے معمولی استقراء سے معلوم ہوئے ہیں جن سے وہ مربع اور مکعب کا ضلع آسانی سے نکال لیتے ہیں، میں نے ان طریقوں پر ایک کتاب لکھی ہے"[1]

آج یہ کتاب اگرچہ دستیاب نہیں نہ یہ معلوم کہ وہ کس درجہ کی تصنیف تھی، البتہ اس عبارت سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ خیام ہندوستانی ریاضیات اور اس کے طریقوں سے واقف تھا۔

خیام کے تمام رسائل عربی میں ہیں۔ اس کی زبان میں سادگی اور اسلوب میں روانی اور زور ہے۔ رسالہ جبر و مقابلہ کا دیباچہ اس کے زورِ انشاء کا مظہر ہے۔ عربی ادب سے اس کے ذوق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ابوالحسن بیہقی بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ ۵۰۷ھ میں جب خیام کے پاس گیا تو خیام نے امتحان کے طور پر رباعیات کے چند سوالوں کے بعد حماسہ کے ایک شعر کا مطلب بھی معلوم کیا تھا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے خیام عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کی فارسی تو بہرحال لاجواب ہے لیکن عربی اتنی بلند مرتبہ نہیں پھر بھی عربی تذکرہ نگاروں نے اسے عربی ادیب اور شاعر کی حیثیت سے ہی اپنے تذکروں میں جگہ دی ہے۔ عماد کاتب نے خریدۃ القصر میں اس کے اشعار کو "شعر طائر" لکھا ہے۔

خیام کا حافظہ بہت قوی تھا اس نے اصفہان میں ایک مرتبہ ایک کتاب سات مرتبہ بغور پڑھ کر یاد کرلی تھی نیشاپور میں آکر اسے لکھوا دیا جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو بہت زیادہ فرق نہ نکلا۔

---

[1] رسالہ جبر و مقابلہ پیرس۔ [2] شہرزوری ص ۲۶ و بیہقی۔

وفات : خیام کی وفات ۵۲۶ھ میں ہوئی۔ اس نے تقریباً چھیاسی ستاسی برس کی عمر پائی۔ انتقال کا واقعہ مؤرخین[1] نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک دن خیام ابن سینا کی مشہور فلسفیانہ تصنیف شفا کی الٰہیات کا مطالعہ کر رہا تھا جب واحد و کثیر کی بحث پر پہنچا تو سونے کا خلال کتاب میں رکھ دیا اور کتاب بند کر کے کہا۔ چند سمجھداروں کو بلاؤ۔ مجھے وصیت کرنی ہے پھر وصیت کی اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا اس وقت سے پھر نہ کچھ کھایا نہ بات کی۔ رات کو عشار کی نماز میں سجدہ کی حالت میں انتقال کیا۔

مدفن : خیام نے نیشاپور میں وفات پائی اور وہیں کے ایک گورستان میں جس کا نام حیرہ تھا دفن ہوا۔ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں خیام کی قبر کے بارے میں خیام کی پیشین گوئی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔

اس نے لکھا ہے کہ ۵۰۶ھ میں بلخ میں بردہ فروشوں کی گلی میں عمر خیام اور خواجہ مظفر اسفرائینی ٹھہرے ہوئے تھے میں اُن سے ملنے گیا۔ دورانِ گفتگو خیام نے کہا کہ میری قبر ایسی جگہ ہو گی جہاں ہر موسم بہار میں باد شمال اس پر پھول برسائے گی۔ مجھے خیام کی یہ پیشن گوئی ناممکن معلوم ہوئی لیکن میں جانتا تھا کہ خیام لغو بات نہیں کہتا۔ ۵۳۰ھ میں جب میں نیشاپور پہنچا تو خیام کے انتقال کو چار سال ہوئے تھے۔ مجھ پر اس کی استادی کا حق تھا۔ جمعہ کے دن اس کی زیارت کو گیا۔ ایک شخص کو رہنمائی کے لیے ساتھ لے گیا وہ مجھے گورستان حیرہ میں لے گیا۔ بائیں ہاتھ کو مڑا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر پائی۔ دیکھا کہ ایک امرود اور شفتالو کے درخت کی شاخیں باغ کی دیوار سے نکلی ہوئی ہیں ان سے پھولوں کی اتنی پتیاں قبر پر گر رہی ہیں کہ قبر بالکل ڈھک گئی ہے۔ اس وقت مجھے بلخ کا (پیشین گوئی والا) واقعہ یاد آیا اور میں رو پڑا۔

تصنیفات : بیہقی اور شہرزوری نے خیام کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ تصنیف میں بخیل تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے جس شخص نے جبر و مقابلہ اور اقلیدس کے اصولوں پر

---

[1] تاریخ الحکماء بیہقی و شہرزوری، چہار مقالہ ص ۶۳ گب

نہایت جد و جہد اور محنت سے محققانہ کتابیں لکھی ہوں، فلکی مشاہدات کی زیج تیار کی ہو، ہندوستانی ریاضی کے نادر اصولوں کے مطالعہ کے بعد اس میں اضافے کرکے کتاب "البرہان" تصنیف کی ہو، نسوی کے ایک خط کے جواب میں پورا رسالہ کون و تکلیف تصنیف کر دیا ہو اس کو کسی طرح بخیل العلم نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ خیام اواخر عمر میں فلسفہ دانی کے اس مرتبہ پر پہنچ گیا تھا جسے لا ادریت کہا جاتا ہے۔ اس درجہ پر پہنچ کر حکیم علم کی ہیچ میرزی دانستہ نادانی اور عالمانہ اقرار جہل کا قائل ہو جاتا ہے۔ خیام کی فارسی رباعیاں اس امر کی شہادت دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خیام کی بیشتر تصانیف جو سعی و محنت اور جد و جہد کا نمونہ ہیں اس کے آغاز زندگی یا اواسطِ عمر میں تصنیف ہوئی ہیں۔ اس کے برخلاف رباعیات جن میں لا ادریت کے خیال کی بہتات ہے اس کی آخری عمر کا سرمایہ ہیں۔ مختلف ماخذ میں جو تصنیفات خیام کے نام ملتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں اور وہ سب خیام کی بہت کوشش، محنت، عمق اور وسعتِ مطالعہ کی مظہر ہیں۔

١۔ رسالۂ استخراج اضلاع مربعات و مکعبات۔
٢۔ رسالہ جبر و مقابلہ۔ اس کا پورا نام رسالہ فی الجبر والمقابلہ ہے۔
٣۔ زیج ملک شاہی۔
٤۔ رسالۂ مصادرات اقلیدس۔ اس کا پورا نام رسالہ فی شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس ہے۔
٥۔ رسالہ طبیعیات و لوازم الامکنہ۔
٦۔ میزان الحکم و رسالہ معرفۃ مقداری الذہب والفضہ۔
٧۔ رسالہ کون و تکلیف۔
٨۔ تتمہ رسالۂ کون و تکلیف۔ یہ "کون و تکلیف" کے جواب میں جو سوالیہ رسالہ قاضی نسوی نے لکھا تھا اس کا جواب ہے۔
٩۔ رسالہ موضوع علم کلی۔
١٠۔ رسالہ فی الوجود۔

۱۱۔ رسالہ موصف و موصوف۔

اس کے علاوہ عرایس النفایس اور نوروزنامہ کی کتابیں بھی خیام سے منسوب ہیں لیکن اول الذکر تو درحقیقت خیام کی تصنیف نہیں بلکہ بیہقی کی تصنیف ہے اور دوسری کتاب فن محازرات و منادمت سلطانی سے متعلق ہے یعنی ان مسائل پر ہے جس کے جاننے کی ضرورت بادشاہوں کے مصاحبوں اور ندیموں کو پیش آتی ہے، خیام کو اس قسم کے مباحث سے کوئی مناسبت نہیں تھی اس لئے یہ کتاب بھی خیام کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی۔

خیام کا مذہب: خیام اسلام کا پیرو تھا لیکن اس کا اسلام اشراقی فلسفیانہ اسلام تھا۔ وہ عقاید میں فارابی اور ابو علی سینا سے متاثر تھا۔ خدا اور رسول کا قائل تھا، نماز پڑھتا تھا اور حج بھی کیا تھا۔ قفطی[1] نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

> "جب اس کے اہل زمانہ نے اس کے دین میں اعتراض کیا تو وہ جان کے ڈر سے دفع تہمت کے لئے حج کو گیا ..... اور حج سے واپس آکر اپنے گھر میں گوشہ گزیں ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے عبادت خانہ میں جاتا اور چلا آتا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہنے لگا تھا۔ خیام کی وفات کے واقعہ سے بھی اس کے مذہبی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بقول بیہقی وہ ابن سینا کی کتاب الٰہیات کا مطالعہ کر رہا تھا جب واحد و کثیر کی بحث پر پہنچا تو بیچ میں خلال رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا لوگوں کو بلایا وصیت کی، نماز پڑھی اس کے بعد نہ کچھ کھایا نہ پیا آخر عشاء کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور سجدہ میں بار بار یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔

"اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے امکان بھر تجھ کو پہچانا، تو مجھے بخش دے

---

[1] قفطی ص ۳۲۲

کہ میری یہی پہچان تیرے دربار میں میرا وسیلہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ طوطیٔ خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے[لہ]

رسالۂ کون و تکلیف میں اس نے بعثتِ رسول کی ضرورت پر بحث کی ہے، مغفرت کی دعا بھی بار بار مانگی ہے، جزا و سزا، جنت و دوزخ کے بارے میں بھی اس کے خیالات وہی تھے جو دوسرے مفکرین اور حکمائے اسلام کے ہیں۔

مشرب و مسلک: جس شخص نے خیام کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ خیام خود کو حکماء کے گروہ میں شامل کرتا تھا۔ اور حکما کی جماعت ہی کو وہ حق کا اصلی امین اور حقیقت کا محرم راز سمجھتا تھا۔ فرقۂ حکماء سے وہ جماعت مراد ہے جس کا مقصد عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب میں مطابقت پیدا کرنا تھا۔ ان لوگوں کے خیال میں حکماء کی آراء اور انبیاء کی تعلیمات ایک ہی صداقت پر مبنی ہیں۔ انبیاء کی تعلیمات میں اگر کوئی بات بظاہر عقل کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تاویل و تشریح اس طرح کی جائے کہ وہ عقل و فلسفہ کے مطابق ہو جائے یہ لوگ اسلامی عقائد کی تشریح فلسفیانہ مذاق کے مطابق کرتے تھے۔

یہ فرقہ متکلمین اسلام سے علیحدہ تھا جو اسلامی اصول و عقاید کی تشریح اس طرح کرتے تھے کہ وہ عقل کے خلاف نظر نہ آئیں۔ الغرض مذہب ان کا اصلی اور فلسفہ ثانوی پہلو تھا۔ برخلاف حکمائے جن کے نزدیک مذہب اور فلسفہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھیں۔

ادب میں وفیات نگاری کا شہ پارہ

"یادِ رفتگاں"

ادب میں وفیات نگاری ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس پر بحیثیت فن کبھی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ بادی النظر میں اس کا تعلق صحافت سے معلوم ہوتا ہے اور بلاشبہ "وفیات" میں متعدد جملے محض وقتی اور عارضی ہوتے ہیں لیکن اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ سوانح اور خاکہ کا مزاج اور انشائیہ کی زبان و اسلوب کے ساتھ ساتھ ایجاز بیانی و اسلوب کی روانی اور کمالِ تاثیر کے عمدہ نمونے "وفیات" ہی میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ادبی رسالوں کی بہت کم چیزیں صحافت کے زمرہ میں آتی ہیں۔ محض اس بنا پر کہ یہ رسالوں کے شذرات میں شامل ہوتی ہیں، انھیں ادب سے کسی طرح خارج نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح بحیثیت فن اس کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔

وفیات کی خاصیت یہ ہے کہ کوئی بھی مصنف بیک وقت وفیات کی پوری کتاب نہیں لکھ سکتا، وہ اگر ایک شخص کی وفات کے بعد اس پر تفصیل سے لکھنے بیٹھے گا تو وہ تحریر، خاکہ یا سوانح میں سے کوئی درجہ ضرور حاصل کر لے گی لیکن زیرِ بحث فن کے دائرے میں نہیں آ سکتی۔ اگر وہ بیک وقت بیسیوں لوگوں کی وفات پر اظہارِ غم کرے تو یہ ممکن نہیں، اس لئے فن وفیات نگاری ٹھہراؤ کا متقاضی ہے۔

یعنی ایک وقت میں ایک دو یا تین لوگوں پر لکھا جا سکتا ہے اس سے زیادہ پر لکھنے سے حق ادا نہیں ہو سکتا مختلف وقتوں میں لکھی گئی ادبی و تعزیتی تحریروں کو جمع کر دیا جائے تو یقیناً تعزیتوں کے مجموعہ یعنی وفیات پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے اور اس سے ادبی سرمایہ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

"وفیات" میں ابتدائی جملہ (یا جملے) اس انداز سے لائے جاتے ہیں کہ اظہارِ افسوس جیسے الفاظ یا ان کے مفہوم کے ساتھ مرنے والے کی تاریخ وفات اور مرض وفات یکایک سامنے آجاتے ہیں اس کے بعد یا کسی اور موقع پر اس کی عمر، اہل وعیال کی نام شماری (جس کا ادبی دنیا میں بالعموم اہتمام نہیں کیا جاتا نیز اعزہ میں کوئی قابلِ ذکر شخصیت ہو تو مختصر طور پر اس کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

دو چیزیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اول جس میدان کا وہ مرد تھا اس کی مہارت کا دل کھول کر اعتراف اور قابلِ فخر کارناموں پر اظہارِ تحسین کیا جاتا ہے اور دوسرے اس کے اخلاق و کردار اور پوری شخصیت کے نمائندہ عناصر کو بہت ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ جچا تلا اور معنی خیز ہوتا ہے۔ یہ دونوں عناصر ادبی صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اور انھیں پیش کرنے کے بعد مبالغہ آمیز طریقہ پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس شخص مذکور نے جو جگہ خالی کی ہے، اس کا پُر ہونا دشوار ہے اور آخر میں مذہبی معتقدات کے تحت اس مرنے والے کی عاقبت کی بہتری کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

وفیات دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔

۱۔ صحافتی وفیات اور اطلاعی وفیات۔ ان کا تعلق عام اخباروں سے ہوتا ہے۔ جن میں آئے دن یہ خبریں کس و ناکس کے لئے آتی رہتی ہیں یا رسائل میں بھی چند سطروں میں صرف اطلاع کے طور پر کچھ خانہ پُری یا رسم ادائی کر دی جاتی ہے

۲- ادبی وفیات اس کی بھی دو شقیں ہیں اول کو ہم لائٹ لٹریچر یا تفریحی رسالوں میں پیش کی گئی رسمی وفیات کے ذیل میں لاتے ہیں اور دوسری قسم ان سنجیدہ ادبی وفیات کی ہوتی ہے جنھیں کوئی عالم یا ادیب علمی یا ادبی رسالہ میں بطور خاص لکھتا ہے اور پوری ادبی شان کے ساتھ اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہی نظر میں اجاگر کر دیتا ہے اور یہی ہمارا موضوعِ گفتگو بھی ہے۔

سنجیدہ ادبی وفیات کے مطالعہ کے بعد یہ بات بار بار سامنے آتی ہے کہ ایجاز و اختصار وفیات کا لازمی جزء ہے۔ خاکہ میں تو خاکہ نگار ان عناصر پر مختصراً اور دلچسپ انداز میں اظہارِ خیال کرتا جاتا ہے جن سے شخصیت بُنی گئی ہے لیکن وفیات نگار کو اپنے اظہار خیال کے لئے تفصیل کی اجازت نہیں اس لئے خاکہ نگار جہاں ایک پیرا لکھتا ہے، وفیات نگار وہاں ایک لفظ یا ایک فقرہ سے کام چلاتا ہے اور وہ ایسے ہی الفاظ منتخب کرتا ہے جو پوری شخصیت و سیرت کے ترجمان ہو جائیں۔ ایسے موقعوں پر لفظوں کے انبار سے زورِ بیان میں مصنف کی کوشش و کاوش کا احساس ہونے لگتا ہے جب کہ در اصل وفیات نگار کی توجہ متوفی کے تمام اجزائے شخصیت کا احاطہ کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سبھی اقتباسات اس جامعیت کے حامل نہیں ہوتے بالخصوص اس کی ابتدا و انتہا رسمی، اطلاعاتی اور دعائیہ ہوتی ہے جسے تعمیرِ شخصیت سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس سے تاثر کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ کا دھیما پن آخری حصّہ کا وصفِ خاص ہوتا ہے اور قاری رفتہ رفتہ خاتمۂ مضمون کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ کرتا جاتا ہے۔

ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ "وفیات" میں وفیات نگار کے فکری میلان اور مزاج کا انعکاس ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ہی شخص سے متعلق مختلف ادیبوں کا بیان مختلف ہو جانے میں مضائقہ نہیں؛ ادبی صداقت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی بھی رسالوں کے مدیر رہے اور ان کے زمانۂ ادارت میں سینکڑوں ان لوگوں کی وفات ہوئی جن سے وہ واقف تھے اور جو کسی نہ کسی

اعتبار سے قابلِ ذکر شخصیات ہوتی تھیں ان پر وہ خامہ فرسائی بھی کرتے ۔ الندوہ اور معارف کے شماروں میں یہ اظہار تعزیت بکھرے پڑے ہیں جن میں سے بیشتر اطلاعی یا رسمی وفیات ہیں ۔ موصوف کی ادبی وفیات کا بڑا حصہ ان تعزیتی تحریروں پر مشتمل ہے جنھیں معارف سے جمع و انتخاب کرکے "یادِ رفتگان" کے نام سے شائع کیا گیا تھا ۔ اس میں ہر قسم کی شخصیات موجود ہیں ۔ ان کے بزرگ بھی ہیں ، ہم عمر بھی اور کم سن بھی ۔ خالص سیاسی شخصیتیں بھی ہیں ، خالص مذہبی بھی ، ان میں خادمِ قوم بھی ہیں اور شاعر و ادیب و محقق بھی شامل ہیں ۔ علمی اشخاص پر بھی زور و توجہ صرف کی گئی ہے اور شیخ تھانوی جیسے عملی مرشد پر بھی کامیابی کے ساتھ اظہارِ جذبات کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ انھیں شخصیات میں بعض ایسے بھی ہیں جن پر اگر سید صاحب قلم نہ اٹھاتے تو شاید وہ بہت دن تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہتیں ، یہ ان کا خصوصی اضافہ ہے ۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ قرابت جتنی زیادہ ہوتی ہے اس کے اظہار تعزیت میں اتنی ہی تاثیر بھی مضاعف ہو جاتی ہے ۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، نورالحسن خاں کلیم ، سر شاہ سلیمان ، سلطان جہاں بیگم ، پروفیسر آرنلڈ اور مولانا عبدالماجد بدایونی پر سید صاحب نے بہت کچھ اور بہت اچھا لکھا ہے لیکن مولانا حمید الدین فراہی ، مولانا محمد علی ، ڈاکٹر انصاری ، علامہ اقبال ، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شروانی وغیرہ سے انتہائی قربی تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی وفیات کی دلسوزی ، درد و تاثیر اور ادبی پیشکش افضل درجہ کی حامل ہیں ۔

سید صاحب کے ادبی شعور کی پختگی و تابناکی کے ساتھ ساتھ ان کی وفیات میں بھی تدریجی ارتقاء ملتا ہے ۔ معارف کے پہلے شمارہ (جولائی ۱۹۱۶ء) سے ہی اس کا

سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ۱۹۵۰ء تک جاری رہتا ہے اس دوران وہ جن سیاسی، ادبی، مذہبی و مسلکی تحریکوں سے وابستہ یا متاثر رہے اس کا عکس بھی انھیں ادوار کی وفیات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ خوش نصیب ہے وہ دوست جو سید صاحب کی زندگی میں مرے کیونکہ سید صاحب اس کی وفیات لکھنے میں بھی حقِ دوستی ادا کر دیتے ہیں۔

مختلف قسم کی شخصیات پر لکھی گئی سید صاحب کی "وفیات" کے صرف چند نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں جن کے بغیر اس فن میں سید صاحب کے اہم مقام کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

آہ اکبر: "۶ محرم ۱۳۴۰ھ کو ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا۔ اس گلستان نما خزاں آباد کی بہتّر بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھی تھیں وہ اس وقت عالمِ وجود میں آیا جب ہندوستان انقلاب کی کروٹیں لے رہا تھا اس لیے لامحالہ اس کی زبان سے وہی نعرے بلند ہوئے جو قوموں کے انقلاب اور ملکوں کے تغیرات کی خبر دیتے ہیں۔ اس کے ضخیم دیوان کے اوراق ہماری سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، تخیلی اور تعلیمی انقلابات کی تاریخ ہیں۔ زبانِ خلق نے اس کو لسان العصر کا خطاب دیا اور اس سے بہتر اس کے لیے دوسرا لقب نہیں ہو سکتا۔ اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک شرب صوفی اور زندہ دل شاعر تھا اس کا نمکِ ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکا لگاتا ہو تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں) مرہم تھا، سرسید کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ہندوستان تمدنِ جدید کے حسنِ منظر پر والہ و شیدا تھا لیکن صرف ایک اکبر کی زبان تھی جو برملا اس کے عیوب و نقائص کو واشگاف کرتی رہتی تھی"[1]

محمد علی جوہر کی غمگساری جس خوبصورت، دلسوز اور اثر آفریں انداز میں

---

[1] معارف ستمبر ۱۹۲۱ء - "آہ اکبر"

کی ہے اور چند جملوں میں شخصیت کے ان اجزا کا پورا نقشہ کھینچ ڈالا ہے جن کے مجموعہ کا نام "محمد علیؒ" تھا، ذیل کے اقتباسات کا ہر فقرہ اور ہر جملہ اس حقیقت پر دال ہے ۔

("افسوس! وہ پر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو ہو جاتا تھا اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سن سکیں گے۔ وہ آتشیں زبان جو ہر بزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لے جاتا تھا اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا وہ پُرزور دست بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا الوداع، الوداع محمد علی الوداع، والسلام الی یوم القیام۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا۔ اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا۔ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا۔ وہ مشرق کا آفتاب تھا یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا

اس لئے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے۔ اے مشرق و مغرب کے مالک تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دُنیا میں ہوا، مشرق و مغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان میں ہوا، مصر و شام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لئے ہوا ہو، صاحب دل شاعر کی اس پیش گوئی کی صداقت سے آج کس کو انکار ہے۔

ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

مولانا عبدالماجد بدایونی۔ جنوری ۱۹۲۶ء

.... حضرات علما کے طبقے میں ان کی ذات ہر حیثیت سے قابل فخر تھی۔ ان تمام لوگوں پر جنھوں نے طرابلس کے زمانے سے اسلامی جدوجہد میں شرکت کی ان بیس برسوں میں مختلف دور گزرے لیکن کچھ آرام و سکون، پھر کچھ سعی و محنت کچھ عزلت گزینی اور پھر ہنگامہ آرائی، کچھ توقف پھر تیز رفتاری، اس طرح انکی زندگی کے ایام وقتاً فوقتاً گزرتے رہے مگر جماعت علماء میں یہی ایک ہستی تھی جس کی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی اس وقت چین نصیب نہ ہوا، ہر وقت اور ہر نفس ان کو کام کی ایک دُھن لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے ان کا آرام، چین، خانگی سکون، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز قربان تھی۔ یہ سماں بھی گزرا ہے کہ ان کے گھر میں کفن دفن کا سامان ہو رہا ہے اور وہ مردہ قوم کی مسیحائی کے لئے کانپور و لکھنؤ کی تگ و دو میں مصروف ہیں، خدام کعبہ، طرابلس، بلقان، کانپور، خلافت کانگریس، تبلیغ، مسلم کانفرنس یہ تمام وہ مجالس ہیں جو ان کے خدمات سے گراں بار ہیں۔ ... مرحوم کی قوت خطابت غیر معمولی تھی ان کی تقریر جذبات اسلامی کی ترجمان ہوتی تھی ان کی شاعری و سخنوری گو مخفی تھی، مگر شاندار تھی۔ ان کی عالمانہ شان اور معقول و منقول سے پرانی دلآویزی اس عالم میں بھی نمایاں تھی۔ ان کا دراز قد، بڑی داڑھی، سیاہ عمامہ، بڑا کرتہ اس پر جبہ، گلے میں بڑا کالا رومال یا چادر

مست چال، جھوم جھوم کر متانت سے چلنا اب تک نگاہوں کے سامنے ان کی تصویر بنا کر کھڑی کر دیتا ہے۔

مرحوم نے عراق کا سفر اپنے بزرگوں کے ساتھ کیا تھا اور حجاز و مصر کا سفر میرے ساتھ ۱۹۲۵ء میں کیا، بے گوش تو وہ تھے ہی مگر ان جیسا بے زبان رفیق سفر ملنا بھی ممکن نہیں وہ بہت کچھ تھے مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہر دوست، ہر ہم عصر، ہر رفیق کے محبوب و حبیب تھے ان کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں ان کی ہستی محبت کا آئینہ خانہ تھی ہر آئینۂ دل میں وہی ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔" (معارف جنوری ۱۹۳۱ء)

سید صاحب اور اقبال دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ تھے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۸ء تک دونوں کے تعلقات تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے۔ اقبال جیسے جیسے عظیم ہوتے گئے، سید صاحب کی عظمت ان کے دل میں گھر کرتی رہی۔ اگرچہ ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۷ء میں ہو سکی۔ اقبال کی وسعتِ نظر نے ان کے جوہر کو پہچان لیا تھا اور تحریری طور پر پہلے ہی اپنا رازداں بنا لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں سفر افغانستان کے دوران دونوں کا ساتھ رہا تو اقبال کے تعلقات سید صاحب سے عقیدت کی حدوں کو چھونے لگے۔

اقبال سید صاحب سے عمر میں تقریباً دس سال بڑے تھے لیکن وہ تعلقات بزرگانہ رکھتے تھے اور اُن سے مستفید ہونے پر فخر کرتے تھے سید صاحب بھی علامہ اقبال کی دل سے قدر کرتے اور اُن کی اہمیت کے سچے شناسا تھے "ماتم اقبال" علامہ کے دل کی صحیح ترجمانی ہے۔ اس میں سید صاحب نے بعض باتیں تو اتنی نادر، مستحکم اور دور اندیشی کی کہی ہیں جن کی زمانہ حرف بحرف تصدیق کرتا رہا۔ سید صاحب کے بعض دوسرے ادبی جواہر پاروں کی طرح "محمد علی" اور "ماتم اقبال" بالخصوص وفیات میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں

("..... عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر

یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملّت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پر پروانہ بالِ جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملّت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیغام لاتا تھا، وہ توحید خاص کا پرستار، دینِ کامل کا علمبردار اور تجدیدِ ملّت کا طلب گار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا اس خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہو گئی۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں۔

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا۔ ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہو گا۔ اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی۔ قرآنِ پاک کی آیتوں، احادیثِ شریفہ کے جملوں، مولانا اور حافظ و حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہو گا۔

اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا۔ وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔

اقبال ہندوستان کا فخر اقبال۔ اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال فضل وکمال کا پیکر اقبال حکمت ومعرفت کا دانا اقبال۔ کاروانِ ملت کا رہنما اقبال۔ رخصت۔ رخصت۔ رخصت۔ الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک ورحمۃ الی یوم التلاق[1]،،

ڈاکٹر انصاری مرحوم کا ماتم بھی عجیب ہے۔ اس میں ان کے اوصاف کو انتہائی خوبصورتی اور ایجاز بیانی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ صداقت وشرافت کے پیکر تھے۔

"ان کا گھر مہمانوں کے لئے، ان کی جان دوستوں کے لئے اور ان کا مال ضرورت مندوں کے لئے وقف تھا۔ نادان لوگ ان کو دولت مند سمجھتے تھے لیکن جاننے والوں کو معلوم ہے کہ کبھی کبھی ان پر ایسے دن بھی گذرے کہ قرض لے کر مہمان داری کا فرض انجام دیا جاتا تھا۔۔۔۔ وہ فیاضی کا مجسمہ، لُطف ومحبت کا دیوتا اور حسنِ اخلاق کا فرشتہ تھے۔ متانت وسنجیدگی اُن کی طینت اور غور وفکر ان کی عادت تھی۔ وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غمخوار اور اسلام کے پرستار تھے۔ وہ دنیا میں اتحاد اسلامی کے پیغامبر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ تھے۔ سیاست کے سولہ برس میں بھی صداقت وراست بازی کے پہاڑ بنے رہے۔ ایک وقت وہ آیا جب ان کے سب اپنے بیگانے ہی نہیں حملہ آور ہو گئے لیکن یہ شرافت ومتانت کا مجسمہ خاموش رہا اور اپنوں کی بدسلوکی کے ذکر اور دوستوں کی جائز شکایت سے کبھی اپنے لب کو آلودہ نہیں کیا۔" (جون ۱۹۳۶ء)

موت العالم موت العالم۔ اگست ۱۹۴۳ء[2]

(".... جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون کا مجمع البحرین تھا

---

[1] معارف مئی ۱۹۳۸ء "ماتم اقبال"

[2] یہاں سید صاحب کے فن وفیات نگاری کے تدریجی ارتقاء کو ذہن میں رکھتے ہوئے رسالہ معارف (جس میں وہ اولاً شائع ہوئے تھے) سے حوالے دیئے گئے ہیں۔

جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اس لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا۔"

(ماتم شیخ، مولانا اشرف علی تھانوی)

اس طرح کے بیسیوں نمونے یادرفتگاں کی زینت بنے ہیں اور مذکورہ حضرات کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے، جس میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خطابت بھی در آئی ہے، ایجاز و تفصیل دونوں موجود ہیں اور ساتھ ہی قلم کا اعجاز بھی اور ظاہر ہے جب جذبات متلاطم ہوں اور قلم اپنی نیرنگی دکھانے پر آئے تو اس سے ایجاز بیانی بیانی کو جراحت پہنچتی ہی ہے۔ اور ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" سے متاثر ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود سید صاحب بیسویں صدی میں بھی اپنے شایانِ شان اس فن میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں کر سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

صحافت وادارت

سید صاحب کا شمار ان اہم اشخاص میں ہوتا ہے جو علم و عمل کے رہرو، فکر و فن کے پاسبان اور قلزم صحافت کے شناور بھی تھے۔ الندوہ، الہلال اور معارف جیسے بلند پایہ اور وحید العصر جریدوں کی ادارت نے ان کو اپنے عہد کے اعلیٰ درجہ کے ادبی صحافیوں کی فہرست میں شامل کرادیا تھا۔ صحافت جس حاضر دماغی بے باکی، چابک دستی، اولوالعزمی اور سلیقہ شعاری کا مطالبہ کرتی ہے، سید صاحب کی شخصیت نے اس کو بدرجۂ اتم پورا کیا۔ ہر اہم رسالہ یا اخبار کسی خاص مقصد کا نمائندہ و ترجمان اور اپنے ایک مخصوص معیار کا حامل ہوتا ہے اور اصول صحافت کے ساتھ اس ترجمانی اور معیار کو برقرار رکھنا اچھے صحافی کا اور اس کے معیار کو بلند کردینا بڑے صحافی کا کام ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جب "الندوہ" سے "وکیل" امرتسر پہنچے تو انھوں نے اس کا معیار بہت بلند کردیا۔ اس کے بعد الہلال جاری کیا تو وہ نہ صرف یہ کہ اپنے عہد میں لاثانی تھا بلکہ مجموعی حیثیت سے ان حالات کے پیشِ نظر اردو میں آج تک کوئی اخبار اس پایہ کا نہیں نکلا۔

سید صاحب اور مولانا آزاد کی صحافت کا مقابلہ تو نہیں لیکن ایک اتفاق یہ ہے کہ الندوہ جس کی نائب ادارت سید صاحب کے ہاتھ آئی اس پر مولانا ابوالکلام آزاد، ان کے پیش رو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میدان میں شبلی کی نگاہ میں سید صاحب پر آزاد نے اپنی برتری ثابت کردکھائی تھی

یہ سید صاحب کے طالب علمی کے آخری دور کا واقعہ ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں شبلی نے جب سید صاحب اور مولانا آزاد کو ایک مضمون لکھنے کے لئے دیا تھا تو مولانا آزاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ مضمون لکھ کر شبلی کے حوالے کر دیا تھا جبکہ سید صاحب دوسرے روز لکھ کر لائے تھے اس آزمائش نے آزاد کی اہمیت و وقعت میں اضافہ کیا لیکن مولانا آزاد صرف چند ماہ تک ہی الندوہ سے وابستہ رہے پھر امرتسر چلے گئے تھے اور یہ ذمہ داری سید صاحب کے سپرد کی گئی۔ اس طرح الندوہ کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی حیثیت ضمنی رہ جاتی ہے اور اپنے ابتدائے آفرینش سے جب تک الندوہ شبلی کے حلقے میں رہا سید صاحب ہی اس کے ہیرو نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وقتاً فوقتاً الندوہ کے نائب مدیر تبدیل بھی ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد یہ ذمہ داری سید صاحب کو سونپ دی جاتی تھی جو سید صاحب کے علم و سلیقہ کے ساتھ ساتھ ان پر علامہ شبلی کے غیر معمولی اعتماد پر بھی دلالت کرتی ہے۔

> "۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے۔ مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا شبلی نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا اور جون جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبران کی ادارت میں نکلے اس کے بعد وہ پھر میرے حوالے کر دیا گیا اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض ادا کیا اس کے بعد یہ عزت ہمارے دوست مولوی عبدالسلام ندوی کو حاصل ہوئی جس کو انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بخوبی انجام دیا اس کے بعد یہ خدمت اگست ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی جس کو میں نے مئی ۱۹۱۲ء تک پورا کیا اور اس پر اس الندوہ کا خاتمہ ہوا جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے۔ (حیات شبلی ص ۴۲۶ - ۴۲۵

مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال جاری کیا

تھا۔ سید صاحب اور مولانا آزاد دونوں الندوہ کے ابتدائی زمانہ میں شبلی کے زیر تربیت رہ چکے تھے جس سے دونوں کو ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے واقف ہونے کا موقع ملا تھا اور ایک ہی راہنما کے زیرِ تربیت رہنے کے سبب دونوں کی فکری نہج میں بڑی حد تک یکسانیت بھی پائی جاتی تھی جو الندوہ اور الہلال میں نمایاں ہے۔

جب سید صاحب الندوہ سے علیحدہ ہوئے اور مولانا آزاد نے انھیں الہلال کے ادارۂ تحریر میں بُلانا چاہا تو اس وقت ندوہ کی داخلی سیاست اور حالات کی خرابی کے باوجود وضع داری کے طور پر سید صاحب ندوہ ہی رہے اور جب مئی ۱۹۱۳ء میں شبلی ندوہ سے مستعفی ہو گئے تو ان ہی کے ایما سے سید صاحب الہلال سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ تقریباً اتنا ہی عرصہ رہے جتنا مولانا آزاد الندوہ میں رہے تھے اور بالآخر باہمی معاصرانہ چشمک و اختلاف اُن کی جُدائی کا سبب بنا۔

جنوری ۱۹۱۴ء میں وہ پونا کالج میں ملازم ہو گئے لیکن اسی سال نومبر میں شبلی کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے ۱۹۱۵ء میں کالج چھوڑ کر سید صاحب کو دارالمصنفین آنا پڑا۔ یہاں جولائی ۱۹۱۶ء میں انھوں نے معارف جاری کیا اور وفات سے تین سال قبل یعنی ۱۹۵۰ء تک یہ رسالہ ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ قیامِ پاکستان نے ان کی ادبی سرگرمیوں اور ادارتی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جون ۱۹۵۰ء کے شمارۂ معارف میں مدیر کی حیثیت سے سید صاحب کا نام آخری بار دیکھنے میں آتا ہے۔

اس طرح درمیان میں دو تین سال کے وقفہ کو چھوڑ کر ۱۹۰۶ء سے ۱۹۵۰ء تک تقریباً بیالیس برس ان کا صحافتی و ادارتی سفر جاری رہا اس میں وہ تقریباً چھ ماہ ہفت روزہ اخبار الہلال کلکتہ سے وابستہ رہے اور انھوں نے تقریباً چھ سال الندوہ اور پینتیس ۳۵ سال معارف کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ الندوہ اور الہلال میں وہ اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے اور معارف کے چیف ایڈیٹر۔

رسالوں کی ادارت اور اخبار کی ادارت میں صحافتی نقطۂ نظر سے نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ رسالہ میں مقصدی مضامین لکھوانا، ان کا انتخاب کرنا اور رسالہ کے معیار کے لحاظ سے ان میں قطع و برید، ان کی تہذیب و تزئین اور ترتیب کو بنیادی اہمیت

حاصل ہوتی ہے اور شذرات میں حالاتِ حاضرہ پر مختصر اظہارِ خیال یا رسالے پر جاذب توجہ ابتدائیہ قلم بند کرنا اور آخر میں نئی کتابوں اور رسائل پر تبصرہ، زبان و اسلوب کی مطابقت و مناسبت کا لحاظ رکھنا وغیرہ کام مدیر کے فرائضِ منصبی میں شامل ہیں۔ مدیر کو یہ ملحوظِ نظر رکھنا ہوتا ہے کہ کسی بے محل مضمون یا بات کے رسالہ میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی شمارہ قابلِ گرفت نہ بن جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ احتیاط اسے اظہارِ حقیقت سے باز رکھے۔ ظاہر ہے کہ اس میں سیاست کو کم سے کم دخل ہوتا ہے اور رسالہ کی ادارت ایک علمی کام ہو جاتا ہے جس میں خطرات کا اندیشہ کم ہے۔

اس کے مقابلہ میں اخبار روزنامہ ہو، سہ روزہ ہو یا ہفت روزہ، اس کی ذمہ داریاں، آزمائشیں اور خطرات زیادہ پر پیچ، زود رو اور سیاسی نزاکتوں سے بھی معمور ہوتے ہیں، ہفت روزہ اخبار میں ہفتہ بھر کی سبھی اہم خبروں کا انتخاب، اس کی انفرادیت کو برقرار رکھنے والے مخصوص کالموں کی تیاری، اخبار کے مسلک و مقصد کی حفاظت کرنے والے مضامین کی شمولیت، سماجی، سیاسی معاشی و تہذیبی کجی اور ناہمواری پر مخصوص اور مؤثر لہجہ میں تنقید کرنا اور اس میں باک و طمع سے مستغنی رہنا، عوام کے جذبات اخبار کے وسیلہ سے حکومت تک پہنچانا اور ہر طرح کا توازن قائم رکھنا، اگر اجتماعی اور متفقہ طور پر انقلاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو حکمت کے ساتھ اس کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے صحیح راستے کی نشاندہی کر کے تعمیری پہلوؤں کو روشن کرنا وغیرہ اور تمام مضامین کے لئے مناسب سرخیاں قائم کرنا ان کی ترتیب کے بعد اخبار کے شایانِ شان اداریہ لکھ کر مناسب جگہ پر رکھنا اور قانونی پیچیدگیوں سے باخبر رہ کر وقت ضرورت جواب دہی کے لئے تیار رہنا اخباری صحافت کے اہم نکات ہیں۔

سید صاحب کو لکھنے لکھانے کا شوق اوائل عمر سے ہی تھا۔ ندوہ آنے سے قبل ہی وہ مضمون نگاری کا آغاز کر چکے تھے۔ انھوں نے پہلا مضمون ۱۸۹۹ء

میں دربھنگہ کے مدرسہ میں سالانہ جلسہ کے لئے لکھا تھا اور وہیں ''آخری وقت'' کے عنوان سے دوسرا مضمون پڑھ کر سنایا تھا جو مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں دیسنہ کی انجمن الاصلاح میں ''علم اور اسلام'' کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ یہ علی گڑھ منتھلی میں ۱۹۰۵ء میں چھپا۔ ۱۹۰۴ء میں عربی زبان کی مختصر تاریخ، علم حدیث، منطق اور امام بخاری پر مضامین لکھے جو ۱۹۰۴ء، ۱۹۰۵ء اور اس کے بعد اشاعت پذیر ہوسکے۔

اپریل ۱۹۰۶ء میں الندوہ کے نائب مدیر ہونے کے بعد وہ مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ رسالہ کی کتابت وطباعت کی نگرانی بھی کرنے لگے۔ ان کا ایک نہ ایک مضمون تقریباً ہر شمارہ میں شامل ہوتا تھا۔ جون ۱۹۰۶ء سے رسالہ کے آخری دو صفحات میں ''علمی خبریں'' کے عنوان سے مختلف قسم کی معلوماتی، ایجاداتی اور سائنسی خبریں دینا شروع کیں۔ اگست ۱۹۰۶ء کا قریب قریب پورا شمارہ ہی سید صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ ابتدائی چار صفحات میں تو مولانا شبلی کے مضمون ابن رشد کا بقیہ درج تھا اس کے بعد صفحہ ۵ تا ۲۶ جامعہ ازہر کے عنوان سے سید صاحب کا مضمون تھا اور آخر میں ''علمی خبریں'' کے تحت ''علمائے روس اور اصلاح نصاب عربی'' پر چھ صفحات پر مشتمل ایک جائزہ پیش کیا گیا تھا جس میں بتایا تھا کہ ہندوستان میں ندوہ کی تحریک اصلاحِ نصاب کا اثر سرد مہری کا شکار ہے لیکن یہاں سے ہزاروں میل دور روس میں اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے قزان کے مدرسۂ محمدیہ میں نیا نصاب اختیار کرلیا گیا ہے۔

اس وقت سے ہر ماہ علمی خبریں دینا سید صاحب کا مخصوص کالم ہوگیا۔ جنوری ۱۹۰۲ء سے انھوں نے کبھی کبھی شذرات بھی لکھنا شروع کیے جن کا معیار و اسلوب شبلی کے شذرات سے اتنا ہم آہنگ تھا کہ تمیز دشوار تھی۔

فروری ۱۹۰۸ء سے علمی خبریں کے تحت ہی الندوہ میں کتابوں پر تبصرہ کی بنیاد پڑی اور اس میں ''تاریخ العرب الادبی'' پر سید صاحب نے تبصرہ کیا تھا۔

اس کے بعد سے یہ سلسلہ بھی مستقل طور پر جاری ہو گیا۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں "تالیفات جدیدہ" کے عنوان سے شیخ عبدالقادر کے سفرنامہ مقام خلافت، پیرزادہ محمد حسین خان بہادر کا ترجمہ قصیدہ بردہ مع قصیدہ بانت سعاد، اور مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ القرآن پر، تبصرہ نگار کی حیثیت سے سید صاحب کا نام ہی درج ہے۔ اس کے بعد اس کالم کا مستقل عنوان مطبوعات جدیدہ رکھا گیا اور جب جب سید صاحب مدیر رہے، مطبوعاتِ جدیدہ پر تبصرہ غالباً انھیں کی ذمہ داری تھی۔ اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک کے تمام شمارے سید صاحب نے خود مختاری کے ساتھ نکالے اس وقت سے شذرات، مطبوعات جدیدہ کے ساتھ ساتھ "واقعات اور خبریں" (جو "علمی خبریں" کی ترقی یافتہ شکل تھی) کا سلسلہ شروع ہوا اور اہم بین الاقوامی واقعات، نئی علمی تحقیقات، نئے علمی مسائل و مباحث اور ملی سرگرمیوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

ادارت صحافت کی اس تدریجی رفتار و ترقی سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ذمہ داری کے دوران سید صاحب نے مولانا شبلی کی امیدوں کو پورا کر دکھایا اور جس غرض سے رسالہ جاری ہوا تھا اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس رسالہ کے اجراء کی غرض یہ تھی کہ ملک کے اہلِ علم اور بالخصوص دینی مدارس کے علمائے اہلِ قلم جو شرح در شرح لکھنے یا مناظرانہ رسائل کی تالیف کرنے یا دیگر جزئی و فروعی باتوں میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو ضائع کر رہے تھے اور علوم و معارف کے دائرہ کو تنگ سے تنگ تر کرتے جا رہے تھے وہ اس جمود سے نکل کر نئے مسائل اور علمی مباحث پر غور کریں اور ان سے نبرد آزما ہو کر ان کا حل تلاش کریں۔ اس کے لئے زبان و بیان بھی ادق و مغلق ہونے کے بجائے سہل و دلکش ہو، اندازِ نظر جذباتی سے زیادہ علمی و تحقیقی ہو تاکہ دوسکر علما و عوام اور طبقۂ قدیم و جدید میں تال میں ہو سکے یہی مقصد اس رسالے کی لوح پر لکھا ہوتا تھا۔

"علومِ اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علومِ قدیمہ جدیدہ کا موازنہ۔"

اور بقول سید صاحب "پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل نقل کی تطبیق معقول و منقول اور قدیم وجدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے۔" (حیات شبلی ص۔ ۴۴۰)

بقول شاہ معین الدین احمد "یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پرانے عربی مدارس اور علماء کے خیالات میں الندوہ نے بڑا انقلاب اور ان میں صحیح علمی مذاق پیدا کر دیا۔

الندوہ جس مقصد سے جاری ہوا تھا، ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک کے مضامین کی فہرست سے آج بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہوا۔ الندوہ کے قابل ذکر مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

علوم القرآن، فلسفہ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا، علوم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ کتابیں، مسائل فقہیہ پر ضروریات زمانہ کا اثر، ذوالنون مصری، فارسی شاعری اور عرفی شیرازی، مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو، جمہرۃ البلاغہ، سوانح امام بخاری اور ان کی تصنیفات، المراۃ المسلمہ پر ریویو، اعجاز القرآن، مسئلۂ ارتقا اور حکمائے اسلام، عربی زبان کی خصوصیات، شیخ الاشراق سہروردی، مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ، جرجی زیدان کے تمدن اسلامی پر ریویو، الاحتساب فی الاسلام، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر وغیرہ۔

مولانا آزاد علامہ شبلی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور فیض یافتگان شبلی کے قدر دان اور ان کی صلاحیت و علم کے معترف تھے اس لئے الندوہ کے سبھی نائب مدیروں کو انھوں نے الہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل کیا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اپنے قیام ندوہ کے دوران مولانا آزاد کو سید صاحب سے زیادہ قربت حاصل رہی تھی اور انھیں سمجھنے کا سب سے زیادہ موقع ملا تھا اس لئے سید صاحب کو مولانا آزاد نے

بڑی عزت اور قدر و منزلت سے بلایا اور جب کچھ دن الہلال میں رہنے کے بعد دونوں میں رنجش ہو گئی اور سید صاحب پونا چلے گئے تو مولانا آزاد نے انھیں دوبارہ بلانے پر اصرار کیا اور الہلال و البلاغ کو تمام و کمال ان کے سپرد کر دینے کا فیصلہ سنا دیا۔ اگرچہ سید صاحب نے اسے قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ بات مولانا آزاد کی نظر میں سید صاحب کی غیر معمولی قدر و منزلت کا بہر حال ثبوت ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال جس مقصد سے جاری کیا تھا ندوہ کے یہ حضرات اس کے اہل تھے۔ سیاسی اعتبار سے شبلی کے ہم مسلک ہونے کے سبب مولانا آزاد اور سید صاحب کے سیاسی مسلک میں بھی ہم آہنگی تھی۔ یہ دونو انگریزوں کی عیاری سے باخبر، ان کے غلامی سے نفریں اور مسلمانوں کو ان سے نجات دلانے کے درپے تھے۔ مولانا آزاد کے نزدیک اس کا بہترین راستہ خدا کی اطاعت احکام الٰہی کی پابندی اور زندگی کے ہر معاملہ میں قرآن کو رہنما بنانے کی موثر ڈھنگ سے تبلیغ کرنا تھا اور زندگی کے کسی بھی میدان میں کسی بھی غیر خدا کی تقلید کو مولانا آزاد صریح کفر تصور کرتے تھے:

> "ہم اسلام کو اس سے بہت بلند سمجھتے ہیں کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی دوسری قوم کی تقلید پر مجبور ہوں۔ وہ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے والے ہیں نہ کہ وہ خود دوسروں کے مقتدی بننے والے۔ بس ہماری تعلیم وہی ہے جو اسلام کی ہے، اسلام سے بڑھ کر کوئی تعلیم، بغاوت فساد کی دشمن نہیں۔ ایک شخص اگر مسلمان ہے تو وہ کبھی فتنہ و فساد اور بغاوت کا مجرم نہیں ہو سکتا۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جائز آزادی حاصل کرنے کے لئے حرکت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایک جمہوریت اور مساوات کی روح ہے اور اس حکومت کو خدا کی مرضی کے مطابق نہیں سمجھتا جو پارلیامنٹری اور دستوری نہ ہو یہ مقصد مسلمانان ہند کو ہندوؤں سے نہیں بلکہ قرآن سے سیکھ کر اپنا نصب العین بنانا چاہیئے اور جمود کی جگہ حرکت، آہستگی کی

جگہ تیزی، بزدلی کی جگہ ہمت اور گورنمنٹ پر اعتماد کے بجائے خدا اور اس کے بخشے ہوئے دین پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو وہ ایک کفر صریح ہے، مسلمانوں کو کسی جماعت میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دُنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں۔

الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر ہی اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہوئیے صرف اس پر چلیئے جو اسلام کی بخشی ہوئی صراط المستقیم ہے"[1]

مولانا آزاد کے دل میں یہ بات جاگزیں تھی کہ مسلمانوں کی فلاح ان کو مذہب کے راستے بیدار کرنے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے ممکن نہیں اور اس کے لئے اپنے خیالات و افکار کو وہ عام کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دعوت کا راستہ اختیار کیا۔ یہ دعوت جسے الہلال کا منشور بھی کہا جا سکتا ہے خود ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

> "الہلال کی دعوت کا اصل اصول مسلمانوں کو ان کی زندگی کے ہر عمل اور عقیدے میں اتباع کتاب اللہ و سُنت رسول اللہ کی کی طرف بلانا ہے اور ان کی پالٹیکل پالیسی کے لئے بھی وہ اسی اصول کو پیش کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں جس دن ان کی گم شدہ قرآنی روح پھر بیدار ہو جائے گی، اس دن پھر وہ اپنے اندر ہر چیز کامل و اکمل پائیں گے۔ پس اصل کار اسلامی تعلیم

---

[1] الہلال۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

کا احیا اور ایک صحیح دعوت کی تحریک ہے۔ بدبختی سے مسلمانوں کے پاس آج قرآن کی اصل تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، صدیوں کی تقلید اور استبداد فکری نے سینکڑوں پردے اصل حقیقت پر ڈال دیئے ہیں اور قرآن اور سنت کی کوئی شاخ اس فتنۂ تقلید کے مہلک اثر سے محفوظ نہیں ۔۔۔ پس اگر توفیق الٰہی ساتھ دے تو الہلال مسلمانوں کو ایک ایسی دعوت کی طرف بلانا چاہتا ہے جو تعلیم قرآن کی ایک خالص دعوت ہے اور جو قوم کے آگے اسلام کی حقیقی تعلیم کی راہ کھول دے"[1]

الہلال صرف محدود معنی میں مذہبی تبلیغ کا آلۂ کار نہیں بنا بلکہ مواد کی پیش کش، تخاطب کا انداز، اس کی اشتعال آفرینی، پُرشکوہ و پُرجلال لب و لہجہ انگریزوں کے لئے خدشات کا پیغام لے کر ابھرا اور ۔۔۔۔۔۔۔ اس نے انگریزوں کے خلاف پہلی بار جس بے باکی کا مظاہرہ کیا اس دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لب کشائی کی جرأت کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، جب الہلال نے یہ لہجہ اور تیور اختیار کیا۔ بقول مالک رام۔

> "اس وقت ہماری قومی تحریک اس مرحلہ پر تھی کہ دوسروں کا تو کیا ذکر کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرارداد قیصر ہند ملک معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کی منظور کرائی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے (اور بعد میں جب وہ ہندوستان آگئے تو وہ بھی اتنی تیز اشتعال انگیز تقریر کرنا اور تحریر لکھنا اس وقت تک خلاف مصلحت سمجھتے تھے) اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم ادا اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اس کے اعمال و اقوال میں کڑی نکتہ چینی کی ابتدا "الہلال" ہی سے ہوئی ۔۔۔ اس رسالے

---

[1] الہلال ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء

نے جو اثر اپنے زمانے اور بعد کے لکھنے والوں پر کیا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں اور بہر حال وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہا۔"

مولانا آزاد کو اپنی ہم نوائی کے لئے ایسے ہی ذی استعداد رفقاء کی ضرورت تھی جو ان کے مقصد اور ان کی دعوت کو حسب منشا آگے بڑھا سکیں۔ سید صاحب سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے بلند پایہ مذہبی عالم تھے اس لئے الہلال سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں بیشتر کی نوعیت سیاسی ہونے کے باوجود مذہبی ہے۔ الہلال میں اُن کے مضامین کی فہرست اس طرح ترتیب دی جا سکتی ہے۔

۱۔ الحریہ فی الاسلام۔ چھ قسطیں
۲۔ تذکار نزول قرآن۔ دو قسطیں
۳۔ تاریخ اسلام کا ایک غیر معروف صفحہ، ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت، ۳ قسطیں۔
۴۔ قصص بنی اسرائیل۔ تین قسطیں
۵۔ عربی زبان اور علمی اصطلاحات۔ دو قسطیں۔
۶۔ افکار و حوادث۔ چھ نمبر۔

مولانا آزاد بعض سیاسی مصلحتوں کی بناء پر جولائی ۱۹۱۲ء میں ایک ماہ کے لئے مسوری چلے گئے تھے اس دوران الہلال کے شمارے سید صاحب نے ترتیب دیئے جن میں ۶، ۱۳، ۲۰ اور ۲۷ اگست ۱۹۱۲ء کے شمارے شامل ہیں۔ نصب العین اور اپنی روایت کے اعتبار سے بھی ان شماروں کا رنگ و آہنگ ماسبق و مابعد کے شماروں سے مماثل ہے۔ لیڈنگ آرٹیکل، شذرات اور ادارتی مقالہ کے رنگ و موضوع اور اسلوب کی نہج وہی ہے جو مولانا آزاد کے مرتب کردہ الہلال سے مخصوص ہے۔ ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو مسجد کانپور کا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ ۶ اگست کے شمارے میں اس حادثے کے متعلق "مشہد اکبر" کے عنوان سے صرف ایک خبر موجود ہے باقی وہی علمی و مذہبی رنگ اور بین الاقوامی سیاست خصوصاً ترکی پر مضامین و تصاویر اور دیگر مخصوص کالم شامل ہیں۔ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کے شمارے کے اہم مشتملات درج ذیل ہیں۔

---

[1] ابوالکلام - احوال و آثار، مضمون "مولانا آزاد کی صحافت" از مالک رام ص ۴۶

شذرات

لنصبرن علی ما آذیتمونا

اعانہ مظلومان کانپور

مشہد اکبر

تصویر: غازی انور بے۔

مقالات

الترک والعرب (از محمد رشید رضا)

وثائق و حقایق۔ تیسرا اصوم، شیؤن عثمانیہ، جزائر بحر ایجیین

مراسلات

مضمون۔ تاریخ حیات اسلامیہ کا ایک ورق

متفرقات

جیسا کہ فہرست سے ظاہر ہے کہ اس شمارہ میں "مشہد اکبر" کے عنوان سے مسجد کانپور کے حادثہ کے متعلق ایک لیڈنگ آرٹیکل تھا۔ الہلال گزشتہ ایک سال سے مسلمانوں کو بیدار کر ہی رہا تھا اور اس آرٹیکل کا لب و لہجہ جذباتی اور خطیبانہ ہونے کے ساتھ اتنا تیز، شدید اور دو دھارا تھا کہ اس نے مسلمانوں کے جوش کے سیل رواں میں تلاطم پیدا کیا تو دوسری طرف وہ حکومت پر بھرپور وار کر کے رہا اور یہ وار اتنا شدید تھا کہ الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور اس شمارہ کو ضبط کر لیا گیا۔

۱۔ اس مقالہ کا عنوان تھا "مشہد اکبر" اور ذیلی سرخی "ادرنہ کا دردناک نظارۂ کانپور" تھی۔ اور اس کا آغاز شیخ سعدی کے مشہور مرثیۂ بغداد کے ابتدائی تین شعروں سے ہوا تھا۔

اے محمد گر قیامت سر برون آری ز خاک   سر برآور دیں قیامت درمیان خلق بیں
خون خلق بے گناہے بر حریم مسجد است   ز آستان بگذشت و ما را خون دل ز آستین

پیروانِ دینِ حق را خون بہ خاک آغشتہ شد از پئے خاک کہ ہر مسلم برو ساید جبیں ع

اس کے بعد قرآن کی سورہ آل عمران کی اس واقعہ محزنہ کے مناسب یہ آیت درج کرنے کے بعد اصل مضمون بڑی آب و تاب سے اپنے رجزیہ انداز میں شروع ہوتا ہے اور دور تک اسی طرح چلا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔

ولاتحسبن الّذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ...... ولاھم یحزنون (ع۱۷)

"زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگی ہے؟ مسلمانوں کے، خاک ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی تھی، خون چاہتی تھی، کس کا؟ مسلمانوں کا، آخر سرزمینِ کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و خروش میں ہے، اپنی قربان گاہ کے لئے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے، صوبۂ متحدہ کا بادشاہ (سرجیمس مسٹن) بالآخر آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے، وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمالیہ۔ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند تیز ہوا کو روک دیتا ہے تو پرغیظ و غضب بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے کیا تو ہمارے شدائد

ومصائب کا طوفان نہیں روک سکتا کیا تو ہمارے حزن وغم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔

۳، اگست کی صبح انقلاب حکومتِ برطانیہ کی تاریخ ہے، بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف وناتواں وغیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل وانصاف کو زخمی کر رہی ہیں انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومتِ برطانیہ کی عمارت قائم ہے۔

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست وپا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم نم وبادلِ پُرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی وبےکسی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کی زبان پر جاری ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (پروردگار اپنے گھر کے لئے ان چند اینٹوں کو قبول کر، تو سن رہا ہے، جان رہا ہے)

یہ پُراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہوتا ہے، میدان میں خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ چکیں۔" (الہلال ۱۳، اگست ۱۹۱۳ء)

الہلال کی مجلسِ ادارت کے ارکان کے مضامین پر ان کے نام ظاہر نہیں کئے جاتے تھے اس لئے "شہدِ اکبر" کو اس کے مخصوص لب ولہجہ کی وجہ سے بہت دن تک مولانا آزاد

کا زائیدۂ فکر سمجھا جاتا رہا جب کہ سید صاحب نے مکاتیب شبلی (مطبوعہ ۱۹۱۶ء) میں شبلی کے ایک خط کے حاشیہ پر اس کی وضاحت کر دی تھی، خط کا متعلقہ حصہ یہ ہے۔

„الٰہ آباد گورنمنٹ نے الہلال کا پرچہ مشہدِ اکبر قابلِ ضبطی قرار دیا ہے اور حسن نظامی کا پمفلٹ بھی“ اس پر سید صاحب نے حاشیہ لکھا کہ „مشہدِ اکبر کی سرخی سے مکتوب الیہ ہی کا لکھا ہوا مضمون الہلال کے لیڈنگ آرٹیکل میں واقعہ کانپور کی نسبت شائع ہوا تھا، تمام ملک نے اس مضمون کو پسند کیا اور اب تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ مضمون اس قدر پر جوش تھا کہ گورنمنٹ نے اس کو قابلِ ضبطی قرار دیا اور اس جرم میں الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، مولانا شبلی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ مضمون کس کا لکھا ہوا تھا“

اس کے باوجود بھی اس مضمون کو مولانا آزاد کے نام سے ہی منسوب کیا جاتا رہا پھر سید صاحب نے رسالہ „مستقبل“ کراچی میں ایک مضمون „سیاسیات اسلام کے نظریے“ میں „الحربیہ فی الاسلام“ پر حاشیہ میں لکھا کہ

> „الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں الحربیۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں“
>
> (ماہنامہ مستقبل کراچی اکتوبر ۱۹۴۹ء)

چونکہ مشہد اکبر کے عنوان سے اس وقت الہلال میں صرف ایک ہی مضمون شائع نہیں ہوا تھا بلکہ تین شماروں یعنی ۶ر اگست، ۱۳ر اگست اور ۳ر ستمبر کے شماروں میں یہ مضامین شامل ہیں اس لئے یہ ابہام درج بالا اقتباس سے بھی دور نہیں ہوتا کہ کیا یہ تینوں مضامین سید صاحب کے ہی ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد نے اس اقتباس کی بنیاد پر ۱۳ر اگست اور ۳ر ستمبر والے مشہدِ اکبر کو سید صاحب کے مضامین کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے[1] لیکن ۶ر اگست والے مضمون کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ دراصل ۶ر اگست

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ الہلال کے آئینے میں ص ۹۲

کا شمارہ سید صاحب نے ترتیب دیا تھا اور اس کا مذکورہ مضمون صرف ایک خبر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے متنازعہ فیہ بھی نہیں ہے اور داخلی و خارجی شہادتوں کی بناء پر وہ سید صاحب کا ہی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح ۱۳، ۲۰ اور ۲۷ر اگست کے شمارے بھی سید صاحب نے ہی ترتیب دیئے تھے جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ۲۲ر اگست کے شمارہ میں "عربی زبان اور علمی اصطلاحات" کے عنوان سے سید صاحب کا مضمون شائع ہوا اور (زیدی سید ہونے کی وجہ سے) سید صاحب نے نسبت کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اس پر اپنا نام "مولانا السید سلیمان الزیدی" درج کر دیا تھا۔ اس کے بعد مولانا آزاد کلکتہ واپس آگئے اور ۳ر ستمبر کا شمارہ مولانا آزاد نے ہی مرتب کیا، اس میں حسب معمول مضمون نگار کے نام سے معری سید صاحب کے مضمون عربی زبان اور علمی اصطلاحات کی دوسری قسط؛ شائع کی اس پر سید صاحب کو مولانا آزاد سے شکایت ہو گئی اور نام درج نہ کرنے اور مضمون میں بے جا قطع و برید کرنے سے متعلق سید صاحب نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھا۔

> "مسئلہ وضع اصطلاحات پر جو پہلا مضمون نکلا، مولانا آزاد کی غیبت میں نکلا اس لئے میرے نام سے اور خامۂ اصلاح کے ضربات شدیدہ سے محفوظ رہ کر۔ دوسرا نمبر انھیں مطالب پر مشتمل تھا۔۔۔۔ لیکن کیا کروں کہ دیگر مضامین کی طرح میرے نام سے معریٰ اور ان امور و مطالب ضروری سے معطل شائع ہوا۔ فہرست علوم کے ساتھ جو عبارت ہے درحقیقت وہ میری نہیں، للّٰہ اس کو میری طرف نسبت نہ دیجئے۔"[1]

مضمون کی یہ دوسری قسط ۳ر ستمبر کے شمارہ میں شامل ہے اس اقتباس سے زیادہ معتبر شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ یہ شمارہ مولانا ابو الکلام نے ہی ترتیب دیا ہے کسی دوسرے نے نہیں۔ ظاہر ہے اس کا لیڈنگ آرٹیکل اپنی موجودگی میں ہمیشہ کی طرح مولانا آزاد نے ہی لکھا ہے، اس کا عنوان بھی مشہدِ اکبر نمبر ۲ رکھا اور بیشتر باتیں اپنے

---

[1] مکتوبات سلیمانی حصہ اول ص ۱۳

منفرد اسلوب میں وہی دہرائیں جو ۱۲ راگست کے مضمون میں تھیں۔ یہ مسئلہ اس وقت پوری طرح حل ہو جاتا ہے جب ہم اس مضمون کا ابتدائیہ پڑھتے ہیں جو مولانا آزاد نے اپنی تحریر کے شائقین کی تسلی کے لئے لکھا تھا۔

> ”ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات..... لا تشعرون۔
>
> ”کانپور کے آخری حوادث جب شروع ہوئے تو میں سفر میں تھا اور سفر بھی میرے لئے مانع کار نہیں ہو سکتا لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک مقام پر قیام نہ ہونے کی وجہ سے سکون و جمعیت خاطر کہ جمع خیالات کے لئے ضروری ہیں، بالکل میسر نہ تھے۔ میں شاکی تو نہیں البتہ معذرت خواہ ضرور ہوں کہ اس واقعہ پر پوری تفصیل سے بحث نہ ہو سکی اور مقالۂ افتتاحیہ کے سوا، جو صرف اصل حادثہ سے متعلق تھا اور کوئی تحریر اس اثنا میں نہ نکل سکی حالانکہ بہت سی عبرت بخش بصیرتیں ان واقعات میں پوشیدہ ہیں اور ہلاکتوں اور خونریزیوں کے یہی حوادث ہیں جن سے قومیں اور جماعتیں اپنے لئے زندگی حاصل کرتی ہیں۔
>
> ## سفکِ دماء و قتلِ نفوس
>
> ۳ راگست کی صبح کو جب آفتاب افق کانپور پر طلوع ہوا تو اس کے لئے کوئی نیا نظارہ نہ تھا۔ اس نے اس خون کو دیکھا جو ہمیشہ بہا ہے، اس نے لاشوں کی تڑپ پر نظر ڈالی جو ہمیشہ تڑپی ہیں۔ اس نے قہقہہ وحشت کا شور اور آہ مظلومی کی سسک سُنی جو اس عصیان آبادِ ارضی پر ہمیشہ سنائی گئی ہے۔.....“

قہقہہ وحشت کا شور عبرت بخش بصیرتیں، آہ مظلومی کی سسک، نظارہ فرمائے آسمانی، خونچکاں قطعات ارضیہ وغیرہ تراکیب کا اختراع و استعمال مولانا آزاد ہی کا حصّہ ہے۔[۱]

---

[۱] اور سید صاحب کو یہ ترکیب بندی پسند بھی نہیں وہ اس کے شاکی نظر آتے ہیں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ”الہلال کا کیا کہنا، مگر مجھے ایک شکایت ہے، الفاظ اس قدر پیچیدہ“ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پورے مضمون میں ان کے معجز نگار قلم کا ایک ایک جملہ، ایک ایک فقرہ اور ایک ایک لفظ اپنی تمام رعنائیوں اور محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لہٰذا ۳؍ستمبر کے "مشہدِ اکبر" کے متعلق یہ خیال درست نہیں کہ اس کے راقم سید صاحب ہیں۔

بہرحال یہ بحث اس لئے چھڑ گئی تھی کہ سید صاحب کے اس مضمون کو اس کے تیز اور جذباتی لہجہ کے سبب مولانا آزاد سے منسوب کر دیا گیا تھا اور مولانا ممدوح نے اس کے بعد اپنی ۴۵ سالہ زندگی میں نہ تو کبھی اس نئے انتساب کی تردید کی اور نہ تائید، ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بحث اس لئے اہم ہے کہ اس مضمون کو اصل مدیر یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کا سمجھے جانے کی وجہ سے کم سے کم یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ الہلال کی صحافتی زندگی میں سید صاحب اتنے کامیاب ہوئے کہ اصل مدیر اور ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ یہ ادارتی مقالہ کا حال ہے اور "افکار و حوادث" کے عنوان سے وہ ملکی و عالمی سیاسیات و مسائل حاضرہ پر جو بیش قیمت و دلچسپ معلومات پیش کرتے تھے وہ اس پر مستزاد ہے۔ اس کامیابی کا دوسرا اہم ترین ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد سے غیر معمولی چشمک اور سید صاحب کی حد درجہ بدظنی کے سبب جب سید صاحب الہلال چھوڑ کر پونا چلے گئے تو مولانا آزاد نے بار بار اصرار کر کے انھیں بلانا چاہا اور الہلال، اس کے بعد البلاغ کی خود مختار ادارت پیش کی جب سید صاحب نے اس سے بھی بے رغبتی ظاہر کی تو مولانا آزاد نے لکھا کہ اگر میری مصروفیتوں یا پریشانیوں یا تساہل سے بھی الہلال بند ہو گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہو گی کیونکہ آپ ہی مجھے تنہا چھوڑ کر اس عظیم کام سے کنارہ کشی اختیار کر کے پونا چلے گئے۔

"الندوہ" اسسٹنٹ ایڈیٹری اور شبلی کی سرپرستی و نگرانی نے سید صاحب کی وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق، معیار علم و صحافت اور پختگیٔ اسلوب کو فروغ دے کر ایک خاص بلندی عطا کی تھی۔ الندوہ میں سید صاحب علمی معیار کے اعتبار سے اچھے مضامین لکھ لیا کرتے تھے اور شائقین کو رسالہ کے تازہ شمارہ کا انتظار رہتا تھا، سید صاحب شبلی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ترکیبیں ایسی مشکل، عربی الفاظ کا اس کثرت سے استعمال کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عربی داں ان کو سمجھ سکتا ہے مولانا شبلی بھی اس کے شاکی ہیں۔" (مکتوب بنام عبدالحکیم ستمبر ۱۹۱۲)

پسندیدہ شذرات لکھتے تھے اس لئے الندوہ کے آخری ایک سال میں مولانا شروانی تو برائے نام ایڈیٹر تھے۔ اصلاً وہ بھی شمارے پورے طور پر سید صاحب نے ہی ترتیب دیئے تھے۔ اس لحاظ سے جہاں الندوہ کا شمار ہمعصر معیاری علمی رسالوں میں ہوتا تھا وہیں سید صاحب کا تشخص بھی معروف و متعین ہو چکا تھا۔ "الہلال" جتنا مشہور اور جتنے وسیع حلقہ میں پسندیدہ تھا، الندوہ کے دائرے سے باہر وہ سید صاحب کی شہرت میں مزید وسعت اور اضافہ کا سبب بنا اس کے مضامین کے علاوہ واقعات و حوادث پر سید صاحب جو نئی معلومات پیش کرتے تھے لوگ اس کے منتظر و مشتاق رہتے تھے۔

اس پس منظر میں ایک نئی آب و تاب اور اپنے عہد میں بلند ترین علمی معیار کے ساتھ جولائی ۱۹۱۶ء میں جب اعظم گڑھ سے ماہنامہ معارف منظرِ عام پر آیا تو اس کا غیر معمولی استقبال ہوا۔ دار المصنفین اور رسالہ کا تخیل شبلی نے پیش کیا تھا جو سید صاحب کے ہاتھوں عملی پیکر بن کر مطلع علم و صحافت پر نمودار ہوا۔ اب وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا کہ الندوہ کی طرح علمی و مذہبی رسالے پڑھنے کے لئے عوام و خواص کے ذہن تیار کرنے میں جد و جہد کی جاتی، معارف کو بنی بنائی فضا ملی اور قارئین کو جانا پہچانا معیار اور اس معیاری رسالہ کا جانا پہچانا مدیر ملا۔ فرق یہ تھا کہ یہ مدیر پہلے پابند تھا، دوسروں کا معاون تھا اور اب آزاد ہو گیا اور دوسرے اس کے معاون ہو گئے، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا عبد الباری ندوی جیسے باوقار اور ذی استعداد اہلِ قلم مدیر معارف کے رفقاء و معاونین کی حیثیت رکھتے تھے۔

معارف کے شمارۂ اول میں سید صاحب نے جو ابتدائیہ لکھا تھا معارف ہمیشہ اس کا پابند و ترجمان اور نقیب رہا اور اس کی خاطر مدیر کو کتنی ہی جد و جہد کرنی پڑتی یا قربانی دینی ہوتی وہ گریز نہ کرتا تھا۔ اگر کبھی کسی سے مناسب مضمون فراہم نہ ہو سکا تو مدیر نے اس کی تیاری اپنا فرض سمجھا اور وقت مقررہ کے اندر اُسے تیار کر کے رسالہ میں شامل کر دیا۔ معارف کے اس پہلے اداریہ کا ایک اہم حصہ درج ذیل ہے۔

" معارف سے جن خدمات کی توقعات رکھنی چاہیئے اور اس کے مقاصد میں

جو نوعیت پیشِ نظر ہو گی وہ حسب ذیل ہے ۔

فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقاید اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق، عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں ۔

اگر صرف ان ہی مقاصد پر قناعت کر لی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لئے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوان سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“[1]

معارف کے شمارۂ اول سے ۱۹۵۰ء تک بور اس کے بعد کے مشمولات پر بھی نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان سبھی امور کو بدرجۂ احسن برتا گیا اور زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں ارتقاء بھی پایا جاتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ مدیر معارف کی وسعت علمی کے پہلو بہ پہلو ان کی وسعت مشاہدہ، عالمی اسفار اور عملی طور پر سیاست میں شرکت نے بہت سے نئے حقائق و معارف ان کے سامنے پیش کر دیئے جو رسالہ کے اجراء کے وقت مہیا

---

[1] معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۱۶ء

نہیں تھے۔ منقولہ بالا اداریئے میں اردو اور فرقہ واریت کا کوئی خاص ذکر نہیں ہے لیکن معارف، اردو، اسلام اور مسلمانوں کے دفاع میں ہمیشہ سینہ سپر رہا۔ اداریہ میں سیاست کا تذکرہ نہیں ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد معارف کے شذرات سیاست سے غیر معمولی طور پر گرانبار ہیں اور مقالات میں مسئلہ خلافت پر بہت سے مضامین رسالہ کی زینت بنے، نظر بندان اسلام کے نام سے سید صاحب نے مذہبی نوعیت کے سیاسی مضامین لکھے۔ شاہ سعود کے حملۂ حجاز کے بعد عرب پر اور پہلی جنگِ عظیم کے نتائج سامنے آنے کے بعد مسئلہ فلسطین پر متعدد مضامین معارف میں شامل ہوئے۔ خود سید صاحب نے مختلف مواقع پر جو خطبات دیئے وہ معارف کے صفحات پر اپنا خاص رنگ رکھتے ہیں۔ وفیات کا ایک طرح سے مستقل عنوان بن گیا جس کے نتیجہ میں اس فن کے اچھے نمونے سامنے آئے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ مدیر کا کام صرف شذرات و مضامین لکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ حسب منشا و ضرورت ماہرین فن اہلِ قلم سے مضمون لکھوانا، ان کا انتخاب اور ان میں حک و اصلاح کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے اور یہ کام جتنا جانکاہ اور صبر آزما ہے، پہلے کے مقابلہ میں اس کا اندازہ آج زیادہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے، سید صاحب نے اس سلسلے میں بڑی پامردی کا مظاہرہ کیا۔ جب تک مولانا ابوالکلام کا قلم چلتا رہا ان سے مذہبی و فقہی مسائل پر، مولانا عبدالماجد دریابادی سے نفسیات پر اور سائنسی مضامین اردو کے اہلِ قلم سائنس دانوں سے لکھوا کر لیتے رہے۔

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آبادی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی وغیرہ کے نام بھی اعلیٰ درجہ کے مضمون نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ شاہ معین الدین احمد، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، نجیب اشرف ندوی، مجیب اللہ ندوی، محمد ابوالحسنات ندوی، مولوی ریاست علی ندوی، مولوی سعید انصاری وغیرہ نے ان کے زیر تربیت رہ کر مضمون نگاری کا سفر شروع کیا اور ترقی کی جس منزل تک پہنچے، اہل علم سے مخفی نہیں۔

سید صاحب کی صحافت یا ادارت پر ایک جامع تحقیقی مقالہ درکار ہے اور اس پر مکمل تفصیلی بحث مقالۂ ہذا کے دائرۂ کار سے باہر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ معارف وہ واحد

رسالہ ہے جو اتنی طویل مدت یعنی اپنے روز اول ۱۹۱۶ء سے آج تک بلا ناغہ نکل رہا ہے اگر اس کے صرف ایک سال کی دو جلدوں (بارہ شماروں) پر بھی گفتگو کی جائے تو ایک اچھا خاصا مضمون تیار ہو سکتا ہے اس لئے ذیل میں زمانہ کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی تخصیص کے بغیر اس کے صرف چند شماروں کے مشتملات درج کئے جاتے ہیں جن سے معارف کے معیار اور اس کے دائرہ کار کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۷ء : سیرت نبوی جلد اول کی طباعت کے مراحل و مسائل پر گفتگو، حیاتِ مالک کی وجہ وجود، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ، دار المصنفین کے سامنے اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تاریخ کا پروگرام۔

مقالات : تکملہ مقالہ اہل سنت۔ وصایائے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

مکالمات برکلے

فلسفۂ لیبان

مباحث حاضرہ - جنگ کا فلسفہ (ترجمہ)

ادبیات کلام حمید (غزل) بیان حسرت، نظریاتِ ناظر

مطبوعاتِ جدیدہ: دنیائے اسلام اور عیسائیت، بستان المحدثین

معجزۂ قرآن در بیان میراث مسلمانان

فروری ۱۹۱۸ : شذرات : اردو انسائیکلوپیڈیا سے متعلق گفتگو مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کی اطلاع اور اردو والوں کو غیرت دلانا، اسلامیہ کالج پشاور میں نادر کتب و مخطوطات کے ذخیرہ کی موجودگی پر اظہار مسرت اور دوسرے اسکولوں و کالجوں کو ایسے نوادر جمع کرنے کی طرف رغبت دلانا۔

مقالات: سلطان ٹیپو کی چند باتیں
مکالمات برکلے
پاٹلی پتر کے کھنڈر
یورپ کا جدید طریقہ تعلیم
آثار علمیہ و ادبیہ۔ نامۂ حالی بنام حامد نعمانی
ادبیات: متاع حق گوئی کی بازار جہاں میں ارزانی (از رمزی)
فریاد اکبر
سیر الصحابہ (قطعات از سعید انصاری)
مطبوعات جدیدہ۔ البیان الکافی، مصباح النسوان، سعیدہ
مارچ ۱۹۲۰ء: شذرات: امریکہ کے ایک فاضل ڈاکٹر سنڈرلینڈ کے
مجموعۂ خطبات "ترقی پذیر جاپان" پر گفتگو
اور مشرق کے حالات سے اس کا مقابلہ۔
مقالات: مسئلہ خلافت
عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیاں
کیمبرج یونیورسٹی
نفسیات طبیہ (ترجمہ)
اخبار علمیہ: انکشافات
تلخیص و تبصرہ: یوسف زلیخا
ادبیات: مرثیۂ غالب (از سالک مرحوم دہلوی)
باب التقریظ والانتقاد۔ مذہب و عقلیات
مطبوعات جدیدہ: صبح امید کا قومی نمبر "الفوز الکبیر
برکاتِ حکومتِ برطانیہ۔
اکتوبر ۱۹۳۸: شذرات
مقالات: ہندو ادبائے فارسی

مذہب اور انسان

بچوں کے قوائے ادراکیہ

برق یا کہربا

حریت و آزادی

ایک آیت کی تفسیر

ادبیات:

مطبوعات جدیدہ: حالات عزیز مرزا، نصائح جانکیہ

رسائل۔ صبح امید، کہکشاں، شعلہ، مغلیہ گزٹ۔

مئی ۱۹۴۲: شذرات۔ انجمن عربی صوبۂ متحدہ الہ آباد، ادارۂ ادبیات اردو،
حیدر آباد۔ علی گڑھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بمبئی میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن۔
ادارۂ اقبال لکھنؤ

مقالات: شریعت اسلام اور موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق

تیموری شہزادیوں کا علمی ذوق

بیدل اور تذکرۂ خوش گو

ہندی ادب کا دور جدید

عورت اور مرد کا نفسیاتی مطالعہ

اخبار علمیہ: اورینٹل کالج کانفرنس کا گیارہواں اجلاس

باب التقریظ والانتقاد: ـــــ "خنداں"

مطبوعات جدیدہ: غلامان اسلام، ایک معلم کی زندگی، فن شاعری آج
کا مصر، انشائے داغ

اگست ۱۹۴۶: شذرات: مسئلہ فلسطین اور اس کا حل۔ آل انڈیا
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی نگرانی میں ادارہ تحقیقات

علوم اسلامیہ کے قیام پر اظہار مسرت و دعوت فکر۔

مقالات: مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے۔
اسلامی نظریۂ سیاست۔
رفع خوف و حزن
مثنوی گلزار نسیم کے ماخذ
سیالہ کے مسلمان

ادبیات: سیل تخیل (شفق جوالاپوری)، حشر جذبات (ثاقب کانپوری)
باب التقریظ والانتقاد۔ مجمع فواد الاول للغۃ العربیہ
مطبوعات جدیدہ: تاجدار دو عالم، فلسفۂ ایمان، تنقیدات،
رموز اقبال، مولانا ابو الکلام آزاد، روح صہبائی۔

جیسے جیسے سید صاحب کی وسعت مطالعہ کے ساتھ گہرائی اور مشاہدہ میں گیرائی آتی رہی، مضامین سے قطع نظر ان کے شذرات کا دامن بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو معارف کے شذرات میں زیر گفتگو نہ آتا ہو۔ اگرچہ بنیادی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے مسائل اور اردو کو حاصل تھی لیکن اس محور کے گرد ساری دنیا گھومتی تھی۔ اس کے علاوہ ملکی و بین الاقوامی مسائل کا امتزاج ان شذرات میں نمایاں ہے۔ مدیر معارف قابل رشک بات پر شذرات کے ذریعہ اکساتا اور حوصلہ افزائی کرتا، قابل تقلید امور کی نشاندہی کرتا اور غیروں سے کوئی اچھی بات ملتی تو اس کی مناسب الفاظ میں تعریف کرتا اور معیاری چیزوں کو قبول کر لینے میں پس و پیش نہ کرتا تھا اور ان غیروں کا ذکر بڑی عزت و احترام سے کرتا لیکن اگر کسی نے مذہب اسلام اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کو ترچھی نگاہ سے دیکھا تو یہی مدیر اپنے قلم کے نشتروں سے اس کی آنکھیں نکالنے کے سامان کر دیتا، کوئی غلط بات زبان پر لاتا تو طنز کے تیروں سے اس کو زخمی کر ڈالتا اگر کوئی اپنا یا غیر کسی شرارت پر اترنے کی کوشش کرتا تو مدیر معارف مناسب ہتھیاروں سے اس کا استقبال کرتا تھا لیکن اگر نادانی

ہیں کسی سے کوئی بات ہو جاتی تو یہی شذرات نگار ہمدردی کے ساتھ اصل حقایق کو لفظی پیکر میں لاکر کھڑا کر دیتا اُردو زبان کی محبت کا جتنا بڑا ثبوت معارف نے پیش کیا ہے، اس کے دفاع میں مضبوط اور اعلیٰ درجہ کے ہتھیاروں کو جو رسالہ کام میں لایا وہ معارف ہی ہے۔ غرض معارف میں سید صاحب کی شذرات نگاری ایک مہتم بالشان درجہ رکھتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس پر بڑا سنجیدہ اور جچا ہوا تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ((صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی و امتیازی شان رکھتی تھی، بے لاگ لیکن درشت نہ کرخت، عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل، سلیس لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ شگفتہ لیکن نہ نادلانہ نہ خطیبانہ، جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پُرخروش، صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ۔ سلیمانی نثر و انشا کا جو اردو کی تاریخ ادب و انشاء میں ایک خاص مقام ہے۔ شبلیت اور ابوالکلامیت دونوں سے الگ، گو ایک خوشگوار حد تک دونوں کو سموئے ہوئے، اس کی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور شذرات نے بہتوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔
>
> شذرات سلیمانی الندوہ کے بھی قابلِ قدر ہوتے تھے لیکن اول تو معارف میں الندوہ سے کہیں زیادہ تنوع تھا، کہیں زیادہ وسعت تھی اور پھر سید صاحب کے قلم کی عمر میں بھی گویا پختگی آچکی تھی اور الندوہ کی نو مشقی کا دور ختم ہو چکا تھا اور معارف معنوی اور ادبی ہر اعتبار سے گویا الندوہ کے نقش اول کا نقشِ ثانی تھا۔ مسائل و واقعات حاضرہ پر رائے زنی میں شخصی تعریضات سے بچنا آسان نہیں خصوصاً جب کہ اشتعال انگیزی بھی مسلسل ہو رہی ہو، صاحب معارف اس امتحان میں بھی پورے اُترے اور بجز چند مستثنیٰ موقعوں کے اپنے قلم کو قابو میں رکھا))۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ معارف میں سید صاحب نے باب التقریظ والانتقاد کا مستقل باب قائم کر کے اپنے عہد میں تنقید کے معیاری اور رہنما نمونے پیش کئے۔ اسی طرح مطبوعات جدیدہ کے تحت تبصرہ نگاری کے میدان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے "وفیات" کے تحت مختلف قابلِ ذکر لوگوں کی وفات پر جو تاثراتی مضمون لکھے جاتے تھے معارف اپنے ماقبل بہت سے رسالوں میں اور بعض مابعد رسائل میں بھی اس میدان میں سبقت رکھتا ہے۔ سید صاحب **وفیات** کے معیار کو ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" کے قریب تک لے گئے ہیں۔ اسی لئے اس موضوع پر علیحدہ گفتگو کی گئی ہے۔ "ادبیات" کے کالم سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگاروں کو ہی نہیں کتنے ہی شاعروں کو معارف نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، جگر کو جگر اور اصغر کو اصغر بنانے والا معارف ہی ہے۔ محمد علی جوہر، حسرت وفانی کا کلام بیشتر معارف میں شائع ہوتا تھا۔

معارف کا معیار اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کافی پست ہوا ہے اس کے باوجود وہ آج بھی اپنے مخصوص دائرہ اور اپنے مقصد کے تحت بلند تر معیار کا حامل ہے اور سید صاحب کا دور اس کا عہدِ زرین رہا ہے۔ موصوف نے پینتیس[۳۵] سالہ ادارت کے دوران اس کو جو بلندی اور عظمت عطا کی تھی وہ ہر لحاظ سے قابلِ ذکر ہی نہیں قابلِ فخر بھی ہے اور قابلِ تقلید تو ہمیشہ ہی رہی ہے اور رہے گی۔

*

تنقید و تبصرہ نگاری

علامہ سید سلیمان ندوی کے صحافتی و ادارتی مطالعہ کے ضمن میں ان کے تنقیدی افکار پر بھی ایک حد تک نظر جاتی ہے۔ موصوف کو مستقل طور پر تو نقاد نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی کسی مخصوص تنقیدی نظریے یا دبستان سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جن بنیادوں پر انھوں نے مضامین، مقدمات اور تبصروں میں اپنے افکار پیش کیے ہیں وہ یقیناً قابل غور ہیں۔ "اکبر کا ظریفانہ کلام" اور "ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی" صرف[2] دو مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں، "خیام" پر پوری کتاب تحقیقی کارنامہ ہے۔ جس میں تنقیدی اشارے جا بجا نظر آجاتے ہیں لیکن کسی مربوط نظریۂ تنقید کی تلاش وہاں بھی بے سود ہے۔ (خیام پر مفصل کلام تحقیق و سوانح کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔) ۱۹۳۲ء میں سید صاحب نے "رباعی" کے عنوان سے ایک تاریخی و تحقیقی مضمون میں بڑی تفصیل سے اس صنف کی وجہ تسمیہ، اس کے مختلف نام مثلاً دوبیتی، دوبیت یا ترانہ وغیرہ پر کلام کر کے اس کے تاریخی اور عہد بہ عہد ارتقاء میں حکماء و صوفیا کی غیر ارادی خدمات کا جائزہ لیا اور یہ بھی واضح کیا کہ فارسی میں کہاں کب اور کس وجہ سے اس کو قطعہ سے مختلط کیا گیا۔ اس مضمون کے آخر میں حکماء اور صوفیاء نے ریاضی کو کیوں اختیار کیا، بحث اٹھا کر سید صاحب نے اس زمانہ میں رائج اصنافِ سخن، قصیدہ، مثنوی اور قطعہ کی ہیئت اور اس صنف کے موضوعی اور وقتی تقاضوں کے تناظر میں تاریخی استدلال کے ساتھ پانچ محققانہ جوابات میں یہ واضح کیا ہے کہ مذکورہ اصناف کسی بھی حالت میں رباعی گو

شعراء کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں۔ ان میں سے کوئی ہیئتی اعتبار سے مختصر لیکن بلیغ خیالات پیش کرنے میں مانع اور تنگ داماں تھی تو کوئی موضوعی نقطۂ نظر سے اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اور حالات کے تقاضے نے ایک نئی صنف "رباعی" کو جنم دیا جو اس کے کہنے والوں کے لئے ہیئت اور ہر طرح مناسب اور کارگر ثابت ہوئی۔ یہ پوری بحث عالمانہ محققانہ، ناقدانہ اور دلچسپ ہے۔

معارف اعظم گڑھ ۱۹۱۶ء میں نکلا سید صاحب نے ابتدا سے ۱۹۵۰ء تک اس کی نہایت سرگرمی، بالغ نظری اور سخت اصولوں کی پابندی کے ساتھ ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ اپنے عہد کا اعلیٰ درجہ کا علمی جریدہ تھا۔ اس میں نامور علماء، ادباء اور محققین اپنی نگارشات شائع کرانے میں مسرت و فخر محسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ بہت تفصیل سے حیات کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد سید صاحب ہندوستانی علماء میں مقتدر حیثیت کے مالک ہو چکے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے معتبر قائد اور رسالہ معارف کے مدیر ہونے کے سبب بطورِ خاص موصوف کی ادبی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ نئی کتابوں اور رسائل پر تبصرہ جو الندوہ سے شروع ہوا تھا معارف میں آکر باقاعدہ ہو گیا اور نکھر گیا۔ لہٰذا ہر شمارہ میں مطبوعاتِ جدیدہ کے عنوان سے وہ تبصرہ لکھتے۔ ان میں سے بعض تبصرے بہت مختصر اور صرف کتاب اور اس کے مندرجات کی اطلاع دینے تک محدود ہوتے تھے اور قابلِ ذکر و قابلِ قدر علمی و ادبی کتابوں پر سید صاحب تفصیلی اور جامع تبصرے سپردِ قلم کرتے تھے جس سے ان کے نقد و نظر کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابوں پر چند سطری تعارفی تبصرہ تشنہ و ناکافی رہتا ہے جس سے کتاب کے متعلق صحیح رائے سامنے نہیں آتی۔ سید صاحب نے مفصل تبصروں کو باقاعدگی سے رواج دیا اور یہ سہرا انہی کے سر ہے کہ عہدِ حاضر کے نئے معیاری رسالوں کو مفصل تبصروں.... ...... کی طرف مائل کیا۔ سید صاحب کے ان معیاری تبصروں کی تعداد بھی چالیس سے کم نہیں اور عمومی تبصروں کی تعداد تو سینکڑوں تک پہنچی ہے۔

سید صاحب کی مذکورہ بالا عظمت نے اہلِ علم و ادب کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ ان سے اپنی کتابوں میں مقدمہ لکھوائیں، چنانچہ ان مقدمات کی تعداد بھی تقریباً ایک درجن ہو گئی۔ اگرچہ ان کی حیثیت بڑی حد تک تقریظ کی سی ہو جاتی ہے اور مقدمہ نگار کو مصنف یا شاعر کا طرفدار کہنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے اس کے باوجود نثر و شاعری کی کتابوں پر لکھے ہوئے مقدمات میں کتاب کی تحسین کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ تنقیدی اصول درکار ہوتے ہیں جن سے سید صاحب قابلِ ذکر حد تک عہدہ برآ ہوئے۔ یہ مقدمات نثر میں "مکاتیبِ مہدی" اور "مکاتیبِ شبلی" پر ہیں۔ شعری مجموعوں میں گلستانِ امجد، کلامِ شاد، کلیاتِ عشق، شعلۂ طور خمستان مسدسِ حالی، خیابان، عطرِ سخن اور "حقیقتِ علمی شاعری" وغیرہ پر تحریر کئے گئے ہیں۔ تاریخ و تحقیق ان کا اصلی میدان ہے۔ اس لئے وہ شاعر کے کلام کو سمجھنے اور اس کا درجہ متعین کرنے کے لئے اپنی تنقید، مقدمہ اور تبصرہ میں اس کا تاریخی پس منظر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس میں اس مخصوص صنف کی تاریخ، اس شاعر کے وطن یا اجداد کی تاریخ، یا وہ شاعر جن نظریات کا حامل و ترجمان ہے ان کی تاریخ وغیرہ شامل ہیں اور کبھی کبھی اس تفصیل میں اکتا دینے والی طوالت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

تنقید کے لئے تاریخی پس منظر پیش کرنا تنہا سید صاحب کا ہی حصّہ نہیں ہے بلکہ شبلی سمیت ان کے ہم خیال بیشتر سابقین و معاصرین اسی پر عمل پیرا تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی اثرات کے باوجود اردو تنقید میں اجتماعی لاشعور کا جو رجحان وجود میں آیا وہ اس پس منظری نظریے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے اور اس لحاظ سے ان نمونوں نے اس نئے دبستان کو کافی غذا فراہم کی ہے۔

دوسری چیز تشریحاتی تنقید ہے، سید صاحب اس سے بھی بے نیاز نہیں ہیں۔ تذکروں بالخصوص آبِ حیات کا اثر ان کے یہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ اس کا اظہار زبان کے علاوہ کلام کے تفصیلی انتخاب میں بھی ہوتا ہے۔

مشرقی تنقید میں فکر سے زیادہ زبان کے معیاری استعمال پر توجہ ہوتی تھی۔ سید صاحب کی تمام تنقیدوں کاوشوں میں اس عنصر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

سید صاحب کی سبھی تنقیدیں اور تبصرے معاصرین سے متعلق ہیں یا ان شعری مجموعوں پر ہیں جن کو ان کے دور میں پہلی بار شائع کیا گیا، اسی طرح اگر کوئی نسخہ قدیم ہوتا ہے تو اس پر سید صاحب محققانہ روشنی بھی ڈالتے ہیں۔

عشق کے سلسلے میں وہ حالی کی طرح سچے جذبات و واردات کے مداح اور "عشق و محبت کے ناتمام پیام اور حسن و جمال کی نادیدہ تصویر کشی کرنے والے شعراء" کے نقاص ہیں۔ اسی طرح جوش ملیح آبادی کے انقلابیات اور شبابیات کے دفتر کو "ادھوری خواہشات کا مظہر" سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری اور غزل گوئی کے لئے واقعیت اور زخمی دل درکار ہے اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ

> "شاعری کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ لفظوں میں شاعر کے جذبات اور تاثرات کی تصویر ہے اور جذبات و تاثرات صرف ذاتی واردات ہو سکتے ہیں وہ نقالی اور اخذ و سرقہ سے ادا نہیں ہو سکتے۔ یہ ہار سچے موتیوں ہی سے تیار ہوتا ہے جھوٹے موتی اس کے لئے بیکار ہیں۔
>
> غزل گوئی کوئی بری چیز نہیں لیکن اس کے لئے زخمی دل درکار ہے۔ اس کے لکھنے کے لئے سیاہی بازار کی بوتلوں میں نہیں ملتی، خوں چکاں سینوں میں پائی جاتی ہے، دل سوختہ میر کی کامیابی کا راز نصیحت کے اس فقرہ میں ہے جو بوڑھے باپ نے اپنے نوجوان شاعر بیٹے کو کی تھی "اے پسر عشق بورزہ"۔[1]

حقیقت پسندی پر سید صاحب کا بہت زور ہے۔ اسی طرح وہ سرسید و حالی کے افادی دبستان کے حامی بھی ہیں۔ حالی نے مسدس لکھ کر جو عظیم کارنامہ انجام دیا سید صاحب اس سے بیحد متاثر اور اس کے مداح ہیں۔ اکبر، جگر، مہدی افادی کی پرکشش، پرصنع اور ضلع جگت سے معمور شاعری اور نثر پر نہایت مرصع کلام کرنے والے سید صاحب مولانا حالی کے انقلاب آفریں سادہ اور بلیغ کارنامہ پر اسی سادہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

---

[1] نقوش سلیمانی ص ۳۵۲

سرسید کے زیرِ اثر مولانا حالی کی شروع کردہ افادی تنقید کا اثر سید صاحب پر نمایاں ہے۔ موصوف دبستانِ شبلی کے نقیب تھے لیکن مسدس حالی پر تنقید و تبصرہ کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دبستانِ حالی کی تنقیدی فکر کے داعی اور سرگرم مبلغ تھے مثال کے لئے مسدس سے متعلق چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

مسدس حالی: "...... اس شاعری میں، جو صرف تفریح طبع کا سامان رہ گئی تھی ...... شاعر نے اپنی مسیحا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی روح پھونک دی۔ لفظ سیدھے سادھے، ترکیبیں بے تکلّف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و استعارہ سے پاک، مگر ہر شعر جوشِ بیان سے لبریز وفورِ احساس سے معمور اور درد و غم سے بھرا ہوا۔

اس نظم کے لئے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا۔ شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرگداز ماتم کا خیال آیا تو اس مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی جس کا وزن ہی گویا درد و غم اور نالہ و ماتم کے لئے بن چکا تھا......

اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف و شفاف نہر کسی ہموار ترائی میں آہستگی سے بہتی چلی جا رہی ہے نہ کہیں رکاوٹ ہے نہ لفظ میں گرانی نہ قافیہ کی تنگی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے۔ ہماری زبان میں سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔

پیغمبر کی نعت میں ہمارے خوش خیال شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا اور کس کس طرح مدح و توصیف نہیں کی مگر مسدس کی نعت کے جو چند بند ہیں وہ اپنی واقعیت اور سچائی کی بناء پر جس اثر سے مالا مال ہیں وہ تکلف و مبالغے سے بھری ہوئی اکثر نعتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ حالی نے اس میں سچائی اور واقعیت کے

اعجاز سے اثر پیدا کیا ہے۔ نظم کے ساتھ مقدمہ اور دیباچہ کی نثر بھی اپنی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے ہماری زبان کے ادب کا اتنا بلند نمونہ ہے جس کی پیروی آج تک نہ ہو سکی۔" (ص ۴۴۸ تا ۴۵۲)

حالی پر تنقید بالکل حالی کے اسلوب میں کر دینا سید صاحب کا خاصہ ہے۔ مسدس کے بارے میں مذکورہ بالا میں جو کچھ موجود ہے آج تک اس سے انحراف نہیں کیا جا سکا ہے۔ تنقید فنکار کی تخصیص، انفرادیت اور قطعیت پر زور دیتی ہے، سید صاحب نے بھی عمومی رائے زنی سے احتیاط کرتے ہوئے کچھ ایسا انداز تنقید اختیار کیا ہے کہ وہ کسی دوسرے شاعر کے لئے کارآمد نہ ہو کر صرف اس شاعر کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔

جگر کی سرمستی کا بیان حالی کی سادگی کی زبان میں نہیں ہے بلکہ سرمستی ہی کی بولی میں ہے۔

> "جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر، تنہا شاعر، اس کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ، لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا۔ جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بعید فطری آرائش اور از خود نمائش کا حسن ہے۔
>
> معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے تنہا کھڑا ہے، سرمستی اور سرشاری تاثر اور دلفگاری اس کے شعر کی جان ہے۔
>
> جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا۔ وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانے کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقیٔ کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔
>
> جگر بظاہر سرشار ہے مگر در حقیقت بیدار ہے۔ اس کی آنکھیں پرخمار

> مگر اس کا دل ہشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو۔" (ص ۴۲۹ تا ۴۳۱)

جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ شاعر کے حسب موضوع وحسب حال اسلوب اختیار کرنے میں سید صاحب کو کمال حاصل ہے۔ حالی پر تنقید میں سادگی غالب ہے، جگر کی ترصیع وصنعت گری نقاد کو پسند آئی تو اس سرمستی وسرشاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ویسی ہی مقفیٰ اور صناعی سے بھری ہوئی زبان استعمال کی۔ "مکاتیب مہدی" کے مقدمہ میں بھی کچھ ایسے نمونے سامنے آئے ہیں۔ اس سے جستہ جستہ اقتباسات نقل کرکے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں لیکن یہ بات یہاں بھی ظاہر ہے کہ وہ زبان کی آراستگی کے باوجود اپنے مقصد اور خیال سے غافل نہیں ہو جاتے۔ لطیف وبلیغ اشاروں کے ساتھ نفس مقصد واضح کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری بیک روانی کے ساتھ نہر شیریں میں بہتا چلا جاتا ہے۔

> "مہدی مرحوم کے خطوط پر نقد وتبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو ایک ایک کرکے دکھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی خوش رنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے۔ وہ پھول ہیں اور پھول کی قدر یہی ہے کہ آپ ان سے لطف اٹھائیں اور بس، جہاں آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے اور نازک پتیاں آپ کی انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں۔
>
> مہدی صرف انشا پرداز تھے، جن کو پروفیسر آزاد کی طرح کسی اور سہارے کی ضرورت نہ تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مرحوم کے لٹریچر کا اثر ان کی زبان کی لطافت ونفاست پر پورا پورا پڑا تھا۔ آزاد کی ادبی نفاست ولطافت اور نذیر احمد کی چہل اور خوش طبعی اگر یکجا دیکھنا ہو تو مہدی مرحوم کی قلمی مخلوق کو دیکھئے۔ خطوط میں ان کے چھپے طعن وطنز کے تیروں سے جو زخم لگتا وہ بھی مزا دیتا تھا۔ ...... وہ اپنے خطوط میں نئے مفہوم کے لیے

پرانے لفظ اور انگریزی ترکیبوں کے لئے مشرقی طرزِ ادا کی ٹوہ میں رہا کرتے تھے۔

حسنِ تحریر کی وہ صنعت جو تالیف و تصنیف میں نظر آتی ہے وہ سراپائے جمال ہے جو اپنے جلوۂ سرِ بام کا احساس رکھتی ہے اور دیکھنے والوں کے لئے اہتمامِ آرائش کرتی ہے اور حسنِ تحریر کی وہ صنعت جو کارڈ کی چلمنوں اور لفافوں کی نقابوں میں چھپی ہوتی ہے وہ اپنے جلوہ سے بے پروا اور تاک جھانک کرنے والوں سے بے خبر رہتی ہے وہ تصنع اور تکلف کی زینت و آرائش سے پاک ہوتی ہے وہ فطرت کے سانچے میں ویسی ہی ڈھلی نظر آتی ہے جیسی وہ ہے۔

مہدی مرحوم کے خطوط کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مصوری کا کمال نہیں تصویرِ فطرت کا جمال ہے۔ ان کا حسینِ خیال اپنے پیکرِ ظہور کے لئے اپنی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروز ہے اور آسمانِ اسٹیج کے تاروں کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروش نہیں۔

مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا۔ نوکِ قلم پر جو بات آجاتی وہ "ناگفتنی" بھی ہوتی تو "گفتنی" ہو کر نکلتی تھی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقے ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچے کر لیتی (کیا بعید کہ یہ متانت خود مقدمہ نگار ہی ہو) چنانچہ مرحوم کے اس قسم کے فقرے اپنی عریانی کے باوجود جس قدر مستور ہیں وہ زیرِ لب داد کے مستحق ہیں۔۔۔

مہدی مرحوم کا یہ اسلوبِ تحریر جس قدر لطیف و نازک ہے اسی قدر پُرخطر ہے وہ اس راستے میں غار کے منہ تک آجاتے ہیں مگر ان کا محتاط قدم اس طرح تل تل کر پڑتا ہے کہ لغزش نہیں ہونے پاتی۔" (ص ۳۷۹ تا ۳۸۸)

آخر میں تبصروں کے ضمن میں "رموزِ بیخودی" اور "بالِ جبریل" سے دو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جس سے زمانی فاصلہ کے ساتھ ساتھ ایک ہی شاعر سے متعلق دو

کتابوں پر اس کے افکار و اسلوب کا محاکمہ سامنے آتا ہے تو ساتھ ہی اس فن کے حوالے سے تبصرہ نگار کے ذہنی ارتقاء کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

"ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی ہے کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لئے انھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اردو شاعر کے خیالاتِ موزوں کی رہ گئی۔

زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعراء میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے لیکن حق یہ ہے کہ اس کی ایک لغزشِ مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں مصرعوں کی درو بست اور وصل و فصل میں قصور ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے۔ شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں اس لئے وہ اختلافِ مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نہیں نکل سکتا۔

یہ مثنوی ڈاکٹر اقبال کی دوسری نظموں کی طرح تعقید لفظی اور معنوی سے بَری نہیں تاہم بعض مقامات پر مسلسل اشعار اس قدر رواں اور سلیس البیانی کے ساتھ موثر ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق فلسفیانہ تشریح کے ساتھ صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں۔

ایک بالغ نظر شخص اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی میں ان کے استعمال کی صحت میں اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ یہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہاں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔"[1]

---

[1] معارف اپریل ۱۹۱۸ء

۱۹۳۵ء میں بالِ جبریل شائع ہوئی اس کے دو ماہ کے بعد ہی سید صاحب نے اس پر تبصرہ لکھا۔

یہاں اس کے صرف دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

”بالِ جبریل کی نسبت پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگِ درا سے بڑھ کر شاعرانہ صنعت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے اور عجب نہیں کہ بالِ جبریل کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخنور بھی پنجاب کے سخندان کا لوہا مان لیں۔ زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔

معنوی حیثیت سے بالِ جبریل بانگِ درا کی طرح جذبات سے معمور نہیں جس کے پڑھنے سے طبیعت میں جوش و خروش و ولولہ و آمدگی پیدا ہو لیکن حکمت و معرفت اور نکتہ رسی و حقیقت شناسی کے انمول موتیوں سے اس کے دامن بھرے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے جوش و ولولہ نہیں جو جوانی کا خاصہ بلکہ اپنی حالت پر غور و فکر کا احساس پیدا ہوتا ہے جو عمر کی سنجیدگی اور طبیعت کی پختگی کا اقتضا ہے۔ خیالات میں رفعت، اسرار الہیات کی ترجمانی میں حکیمانہ گہرائی، اجتماعیات میں حیات اسلامی کی روح کی صحیح معرفت، مسلمانوں کے سامنے ان کی معیاری زندگی کی اصل تصویرکشی اور نوجوانان سعادت مند کے لئے پند و نصیحت میں ”پیردانا“ کی سی مشفقانہ حکمت آموزی ہے۔“[1]

---

[1] معارف مئی ۱۹۳۵ء

شاعری

مولانا سید سلیمان ندوی نے جس وقت شعور کے عہدِ شباب میں قدم رکھا اور ندوہ میں داخلہ لیا اس وقت لکھنؤ اپنے ادبی دور کی آخری کروٹیں لے رہا تھا۔ مولانا حالیؔ نے مقدمہ لکھ کر لکھنویت پر اپنا بھرپور وار کیا تھا۔ دہلی و علی گڑھ میں حسرتؔ اور لکھنؤ و رام پور میں جلالؔ و امیرؔ اس کا پوری طاقت سے مقابلہ کرنے اور بغیر نام لئے، جواب دینے پر کمربستہ تھے۔ اس زور آزمائی نے اندرونی طور پر گروہ بندیوں کو بھی جنم دیا تھا۔ چنانچہ اس عہد میں داغؔ و جلالؔ و امیرؔ کے معرکے بھی مشہور ہوئے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ عہد لکھنوی شاعری کے متاخرین کا دور تھا۔

سید صاحب اپنے شعری ذوق و ملکہ کی بنیاد پر دبستانِ امیر سے وابستہ ہوئے اور انھوں نے ابتدائی شعری مدارج اسی رہنمائی میں طے کئے۔

سید صاحب کی حیات کے ابتدائی دور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی بہت حرکی اور فعال شخصیت کے مالک تھے۔ گاؤں اور وہاں کے مکاتب و مدارس میں بیت بازی کا رواج تھا، اس کے شرکا اور عہدہ داروں میں ان کا نام ضرور ہوتا۔ بقول مولانا ابو ظفر ندوی سیکڑوں نہیں ہزاروں اردو فارسی اشعار ان کے نوکِ زبان تھے اس کے لئے انھوں نے ایک خوشنما بیاض بھی تیار کی تھی اور یہیں انھیں فنِ عروض و تقطیع میں بھی مہارت پیدا ہوئی[1]۔ خانقاہ پھلواریہ میں شعر و شاعری کی مجلسوں اور قوالی کی

---

[1] معارف، سلیمان نمبر "بچپن اور طالب کے کچھ واقعات" از مولانا ابو ظفر ندوی

محفلوں میں بھی وہ شریک ہوتے اور شعر بھی موزوں کرنے لگے تھے۔ ندوہ کے خالص لکھنوی اور شاعرانہ ماحول و فضا نے اس ذوقِ شعری کو جِلا بخشی، شعری نشستوں اور مشاعروں میں پابندی سے شرکت نے اس شوق کو مہمیز کیا۔ چنانچہ مشاعروں میں پڑھنے کے لئے غزلیں کہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ لکھنوی مزاج کی ترجمان و نمائندہ غزلیں "ندوہ" کے ایک غیر معمولی طالب علم ہی کا نتیجۂ فکر ہو سکتی تھیں۔

اس سلسلے میں چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

شعلۂ غم سے پسِ مردن جو بھڑک جاتے ہیں   سنگ ہائے لحدِ کشتہ چٹک جاتے ہیں
یوں تو آتے ہی نہیں ہیں جو وہ آتے بھی ہیں   زخم پر اور نمک میرے چھڑک جاتے ہیں
خود جفاؤں سے تم اپنی پوچھ لو   کیوں کسی کی لاش پر کہرام ہے
کل شب مرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی   ہے کیوں نگاہِ ناز مگر شرمسار آج

یہ لکھنوی مزاج جن خاص وجوہ سے پیدا ہوا اُن میں داغ و جلال و امیر کے معرکے اور ادبی گروہ بندیاں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سید صاحب کے اس وقت کے رنگِ طبیعت کے علاوہ ان کے ندوہ کے پسندیدہ استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب سے امیر مینائی کے خصوصی تعلق اور ان کے محاسن کلام پر اکثر و بیشتر گفتگو نے ان کا ادبی رشتہ امیر سے جوڑ دیا، اس حلقہ میں شامل ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ شاگردِ امیر جلیل مانکپوری کے بیٹے صدیق حسن خاں، سید صاحب کے ہمدرس و ہم ذوق تھے اُن کے ساتھ رہنے سے بھی اس مذاق کو فروغ ہوا، نیز امیر کا دیوان "مراۃ الغیب" خصوصی طور پر سید صاحب کے مطالعے میں رہا اور موصوف کی شاعری کے دورِ اول کا ایک معتد بہ حصہ اس کے زیرِ اثر وجود میں آیا جو ان کے کلام کی لطافت و نزاکت اور ندرت و حسنِ بیان کا مظہر ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے اس زمانے میں امیر مینائی سے ان کی گرویدگی سے متعلق اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> "سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھا، ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی

> کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا کلام امیر کا حافظ نکلے گا، مراۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانۂ عشق کا پرستار، یہ پہلی بار کھلا کہ حضرت باین زہد و تقویٰ اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے"۔

سید صاحب کا مطبوعہ مجموعۂ کلام "ارمغانِ سلیمان" ہے اور اس کے مرتب غلام محمد صاحب ہیں۔ اس پورے کلام میں سید صاحب کا کہیں کوئی تخلص نظر نہیں آتا البتہ ۱۹۰۳ء کی دو۲ غزلیں جو مجموعہ مذکور میں شامل نہیں ہیں اور "سید صاحب ندوہ میں" کے زیرِ عنوان گزشتہ اوراق میں نقل کی جا چکی ہیں، ان میں "سید" تخلص ملتا ہے دونوں کے مقطعے یہ ہیں۔

قطرۂ خونِ جگر ہجر میں نکلے سید
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں
لاش پر سید کی بولی بے کسی
عاشقی کا بس یہی انجام ہے ؏

معارف میں ان کا جو کلام شائع ہوتا تھا اس کے تخلیق کار کی حیثیت سے "رمزی" یا عنوان کے طور پر "رمزیات" کے الفاظ ملتے ہیں لیکن اس تخلص کا کوئی مقطع کلام میں موجود نہیں سید صاحب نے ایک موقع پر یہ وضاحت بھی کی تھی کہ "نواب عماد الملک کے مشورہ پر میں نے شاعری ترک کر دی تھی لیکن ایک عرصہ بعد اگر کچھ کہہ لیا تو اسے عیب کی طرح چھپایا اور اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو پھر رمز و اشارہ بنا دیا"۔ (معارف جولائی ۱۹۵۰ء)

سید صاحب نے شاعری کو اپنا مستقل شغلہ نہیں بنایا۔ ان کا جو کلام دستیاب ہے اس میں ۱۹۰۲ء کی دو غزلیں ۱۹۰۴ کی ایک غزل اور چند متفرق اشعار، ۱۹۰۶ء کی مشاعرۂ اعظم گڑھ میں پڑھی ہوئی ایک غزل

عجب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے
دگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

اور ۱۹۱۷ء میں محمد علی جوہر کی زمین میں سید صاحب کی غزل

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ
لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ

ملتی ہے اس کے بعد شبلی کا رنگ شروع ہو جاتا ہے اور کوچۂ غزل کو چھوڑ کر

نظم گوئی کے میدان میں آتے ہیں اور شبلی کے رنگ میں چند نظمیں مسٹر مظہر الحق، مسٹر محمد علی جینا، سرالجیات، متاعِ حق گوئی کی بازارِ جہاں میں ارزانی، درسِ مساوات، انڈمنٹی بل اور رولٹ بل، بحرِ عرب، دریائے نربدا اور "بہار" علی الترتیب ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء، (دو) ۱۹۱۸ء (دو) ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۸ء میں موقع بہ موقع لکھی گئیں۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء تک پھر غزلیں کہیں اور ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء میں ایک ایک غزل ملتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں سلوک کی بستی میں قدم رکھنے کے بعد اڑتیس غزلیں اور چار نعتیں کہیں۔ ۱۹۰۳ء میں ایک ترکیب بند اور اپنے عزیز صغیر الحق دسنوی کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا۔ ۱۹۰۵ء میں شبلی کی ندوہ آمد پر ایک فارسی قصیدہ، ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک کے معائنہ ندوہ کے موقع پر ایک عربی قصیدہ، ۱۹۱۴ء میں شبلی کی وفات پر نوحہ، استاد کے نام سے ایک مرثیہ اور تین قطعات ۱۹۱۷ء میں اہلیہ کی وفات پر مرثیہ "مرگِ یار"، ۱۹۴۳ء میں رحلتِ شیخ کے عنوان سے چند اشعار کے علاوہ مولانا عبد الماجد دریابادی کے نکاح کے موقع پر تین قطعے، مولانا شبلی کی ٹانگ کے حادثہ پر ایک رباعی، امجد حیدرآبادی کی رباعی کے جواب میں ایک فی البدیہہ رباعی (فارسی) اور جوش ملیح آبادی کی نظم "شرارِ بولہبی" کے جواب میں ایک نظم "چراغِ مصطفوی" لکھی۔ اس کے علاوہ بھی چند متفرق اشعار موجود ہیں مثلاً میر عثمان علی خاں آصف جاہ نے آموں کا تحفہ بھیجا تو اس کے جواب میں دو رباعیاں کہیں۔ شیخ نے تسبیح اور عصا عطا کیا تو اس پر فارسی میں ایک شعر اور ایک قطعہ کہہ دیا۔

اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ موزونِ طبعی، ذہن رسی، نکتہ آفرینی اور غیر معمولی صلاحیت و استعداد سے بہرہ ور ہونے کے سبب سید صاحب کو غزل (لکھنوی و دہلوی دونوں)، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ، ترکیب بند اور نظم گوئی میں سے بعض پر دسترس اور بعض پر پوری قدرت حاصل تھی اس کے علاوہ موصوف عربی و فارسی شاعری میں بھی مشق بہم پہنچاتے رہتے تھے۔

اگرچہ سید صاحب کی شاعری نصف صدی پر محیط ہے اور تعداد میں اشعار

بھی سینکڑوں تک پہنچ گئے ہیں لیکن کثرت، عظمت کی ضامن نہیں اس لئے اس شاعری کو دو ادوار سے زیادہ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

پہلا دور تقلیدی ہے جسے انھوں نے (تصوف سے معمور اپنی آخری عمر میں خود رسمی و نقلی شاعری کہا ہے۔ یہ دور ابتدائے مشق سے ۱۹۳۹ء تک رہتا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک ہے جس کی شاعری فطری، جذباتی اور تجرباتی ہے اس میں چند متفرق اشعار کے علاوہ سب غزلیں اور چار نعتیں ہیں اور یہ حصہ ان کی شاعری کا سب سے زیادہ جاندار حصہ ہے۔

دورِ اول کا کلام اپنے آغازِ آفرینش سے ہی اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ وہ تقلیدی ہونے کے باوجود مہارتِ فن سے عاری نہیں ہے، شاعر، شاعری اور عشق دونوں کے آداب سے واقف معلوم ہوتا ہے اس کا احساس، نزاکت اور پیچیدگیاں سب نظروں کے سامنے ہیں۔ وہ ہجر و وصال کا کیف آشنا ہے اور جب محبوب سے گفتگو کرتا ہے تو دونوں کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ الفاظ و تراکیب، زبان و اسلوب کا انتخاب و استعمال یہ سب چیزیں شاعر کے مخصوص طرزِ فکر اور آداب و انداز و لب و لہجہ کی غمازی کر رہی ہیں۔

اس عہد کی شاعری کے نمونہ کے لئے چند اشعار اس باب کے بالکل شروع میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہاں تکرار غیر ضروری ہے اور یہ کلام سید صاحب کے بیس سال کی عمر یعنی ۱۹۰۴ء تک کا کلام ہے۔ اس کے بعد بارہ برس تک سناٹا نظر آتا ہے اور اچانک سید صاحب دارالمصنفین میں سرگرم سخن ہوتے ہیں۔ اس دور کی ایک غزل ہے جس کے دو اشعار قابلِ تحسین ہیں۔ دوسرے شعر کی داد تو علامہ اقبال نے بھی بطورِ خاص پیش کی تھی۔

عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے — دہن میں تیغ کے اب بھی ہے تشنگی باقی
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے — ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں

۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء کے درمیانی مدت کی شاعری خیال کی لطافت، کلام کی پختگی اور اسلوب کی جاذبیت کے اعتبار سے دورِ اول کی نمائندہ شاعری ہے۔

اور دراصل یہی وہ دور ہے جب محسوس ہوتا ہے کہ سید صاحب عقل و عشق کے دوراہے پر کھڑے کسی فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اب ہوس اور عشق میں فاصلہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ عشق کی نزاکت، رقیب کی بوالہوسی محبوب کی تغافل شعاری اور نت نئے انداز ستم سے بھی شاعر واقف ہے اور اس غم کی کسک پر منہ بسورنے کے بجائے اسے برداشت کرنے کا حوصلہ، اسے سبق سکھانے کا جذبہ یا اگر محبوب نفسیاتی طور پر کمزور ہے تو اس سے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔ عشق کی تپش و اضطراب اور خلش و ہیجان اس کی ذاتی چیز نظر آتی ہے۔ محبوب کے علاوہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ طور کی تجلی، کنعان کا حسن اور اس کے رقیب، آذر کی بت گری، ابراہیم کی بت شکنی، میدانِ عشق میں خضر کی بیچارگی، منصور کی دار، ساقی کی تنگ ظرفی، موسمِ گل میں عاشق کی حیرانی۔ مہ کامل کے فروغ میں جنون خیزی یہ مناظر ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں۔ ان مضامین شعری کے علاوہ سید صاحب کو بچپن سے ہی رعایتِ لفظی کے استعمال کی ایک دھن تھی، یہاں وہ بھی جلوہ افروز ہے، سہل ممتنع برتنے کا سلیقہ ہے۔ غزل کے آداب و روایات کا سید صاحب کو پاس ہے لیکن زبان کے اختیار و استعمال کے معاملے میں وہ ان روایات اور فارسی تراکیب سے سودے بازی نہیں کرتے بلکہ جس زبان کے استعمال کے لئے وہ دوسروں پر زور دیتے رہے، پہلے خود ہر جگہ انھوں نے اسے ہی ذریعۂ اظہار بنایا ہے، نثر میں سادگی اور سلاست ان کی شان ہے، شاعری بھی اس کی پابند ہے اور بلا شبہ یہ التزام ہر شاعر کے بس کا نہیں۔ چند اشعار سے شاعر کی کیفیات و واردات کا مزید اندازہ ہو سکے گا۔

سوزشِ خام ہو تب آگ سے اٹھتا ہے دھواں   عشق کامل کا جو دعویٰ ہے تو پھر آہ نہ ہو
کوچۂ عشق میں آئے ہیں تو حضرت سن لیں   نام کا پاس نہ ہو ننگ کی پرواہ نہ ہو
پھر چھیڑنے کو آئی ہے بادِ بہار آج   مدت کے بعد لائی ہے پیغام یار آج
مائل بہ کرم وہ بتِ بدخو نہ رہا   حسن کی آنکھوں میں یا لطف کا جادو نہ رہا

اے ساقیِ شباب بجھا تو نہ میری پیاس　　تو مجھ کو یوں ہی اپنا طلب گار چھوڑ دے
مخمورِ کیف جوشِ جنوں تو مجھے نہ کر　　اے مستِ ناز تو مجھے ہشیار چھوڑ دے

۱۹۲۳ء میں سید صاحب سفرِ افغانستان پہ گئے، وہاں سے واپسی پر شیخ تھانوی سے مراسلت شروع ہو گئی۔ اگرچہ یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہنے کے بعد پانچ چھ سال کے لئے بند ہو گیا تھا لیکن ایک تحریک جڑ پکڑ چکی تھی جو دائمی تھی۔ اس سے وہ متاثر ہی نہیں متعلق بھی ہو گئے بلکہ وہ اس کے لئے وقف ہو گئے۔ بادۂ انگور کی مستی چھٹ گئی، پہلے تجلّی سے محروم جو بے طور کی آگ تھی وہ ابرِ کرم کے چھینٹوں سے بجھ گئی اور دل کے فانوس میں ایک نئی شمع روشن ہوئی جس میں چاروں طرف ایک ہی لَو نظر آتی تھی۔ اس شمع کی مدھم لو نے عاشق کو جلا کر راکھ کر دیا اور صوفیہ نے اصطلاح کے طور پر اس کو "فنا" کا جامہ پہنایا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً میں نہیں ہو گیا بلکہ نصف عمر سیرت نگاری میں گزارنے والے عاشقِ رسول کے عشق کی دبی ہوئی چنگاری ۱۹۲۳ء میں باہر نکل کر سلگنے لگی۔ اس کے بعد سے ۱۹۳۸ء تک کوئی غزل نہیں ملتی۔ یہ زمانہ غور و فکر اور قلبِ ماہیت کا ہے۔ ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کی آخری دو غزلیں شاعر کے اس بدلے ہوئے رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء سے دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ دونوں غزلیں "گریز" کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ عہدِ شباب کی غزلیں غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔ وہاں بھی زندگی بعض تلخ و شیریں حقیقتیں پیش ہوئی تھیں اور بعض دلکش پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی تھی لیکن حسن و عشق، ہوش و خرد، دار و منصور اور زلفِ دراز کے معنی اس شہر میں آ کر بدل گئے۔ وہ چہکا، وہ مستی، وہ جنون، وہ جادو، وہ رقابت، وہ ستم، وہ کرم، وہ حرفِ مطلب اور وہ دستِ گستاخ، توازن و تفکر، تدبر و حقیقت اور انابت و خشیت میں تبدیل ہو گئے۔ ان غزلوں کا نمونہ اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ حسن کے اعتبار سے ان میں کسی قسم کا جھول نہیں اور کلام کی یہ پختگی، یہ رنگ جہاں اقبال کی یاد تازہ کرتا ہے وہیں

شاعری کے اس دوسرے دور کی تمہید بھی بن جاتا ہے جو کیفیت اور کمیت کے نقطۂ نظر سے سید صاحب کی شاعری کا دورِ کمال ہے ۔

مری ہی ہستی ہے نقاشِ وجودِ کائنات　　میں اگر معمور ہوں ویران بھی معمور ہے
شانِ منصوری نہیں پابند طوق و سلسلہ　　دار پر جو خود سے چڑھ جائے وہی منصور ہے
نقشِ زنگار رنگ عالم کو تصوّر سے مٹا　　تجھ کو اگر آرائش ایوانِ دل منظور ہے

⁂

دعویٰ غلط ہے عشق کی تمکین و ہوش کا　　ممکن نہیں کہ حسن سے ہو بے نیاز عشق
خود جھک پڑے گی حسن کی زور آزما نگاہ　　ہو بالمقابل اس کے اگر پاکباز عشق
کتنی ہو مختصر یہ کہانی حیات کی　　کھولے اگر نہ حسن کی زلفِ دراز عشق

مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے اردو میں نظمِ جدید کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی مختلف رنگوں کی آمیزش کے ساتھ تیز تر ہوتی گئی ۔ آغاز سے اقبال تک حب وطن اور مناظرِ فطرت اس کے دلچسپ ترین موضوع رہے ۔ اکبر نے اس میں باقاعدہ طنز اور طنز کے لئے ظرافت داخل کی اور دوسرے گل بوٹے کھلائے ۔ مولانا شبلی نے بھی اپنے مخصوص طرز میں قومی نظمیں لکھیں ۔ شروع میں علامہ اقبال نے بھی طنز و مزاحیہ اسلوب میں ان کی پیروی کی اور انھوں نے ہی اسی رنگ میں نظمیں کہنے کے لئے سید صاحب کو راغب کیا چنانچہ موصوف نے شبلی کے رنگ و جذبہ اور اقبال کے فن سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے نو نظمیں لکھیں ۔ دو شخصی نظمیں مسٹر مظہر الحق اور مسٹر محمد علی جینا، ایک خالص سیاسی ایڈمنسٹی اور رولٹ بل، دو دریاؤں پر بحرِ عرب اور دریائے نربدا، تین مثالی نظمیں درسِ مساوات، حق گوئی اور سر الحیات پر اور آخری نظم اپنے وطن صوبۂ بہار کے عنوان سے لکھیں ۔ اوّل الذکر ابتدائی تینوں نظمیں سیاسی یا قومی حیثیت کی ہیں ۔ مظہر الحق اور محمد علی جینا کی ریاضت، ایثار اور پُر خلوص و با اثر شخصیتوں میں شاعر کو ایک اچھے مستقبل کی کرن دکھائی دی ۔ اس لئے یہ نظمیں وجود میں آئیں ۔

اردو کے علاوہ عربی و فارسی شعر و سخن کا آغاز بھی انھوں نے اسی دور میں کیا تھا۔ عربی میں جو کچھ کہا وہ دستیاب نہیں ہے۔ سید صاحب کے ایک شاگرد مولانا محمد ناظم ندوی نے بتایا کہ سید صاحب کے قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے ایک دوست سفیر شام متعینہ پاکستان عمر بہاء الامیری نے سید صاحب سے ان کا عربی کلام یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ وہ اس مجموعہ کو شام سے شائع کریں گے، غالباً اس کی نوبت نہ آسکی اور اس طرح ان کا کل عربی کلام نایاب ہے۔ بہرحال یہاں اس سلسلے میں شاہ معین الدین احمد کے اس قول پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ "سید صاحب عربی کے ممتاز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے"۔[1]

لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بغیر استاد کا یہ شاعر فارسی اصنافِ سخن میں بھی غیر معمولی دستگاہ رکھتا تھا۔ سید صاحب نے بیس سال کی عمر میں بھی ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا اس کے علاوہ دو قطعے اور چند رباعیاں بھی ان کے فارسی کلام کے نمونہ کے طور پر موجود ہیں۔

۱۹۱۸ء میں سید صاحب نے "رموزِ بے خودی" پر معارف میں جو تبصرہ لکھا تھا وہ شعری پرکھ کے علاوہ فارسی شاعری پر قدرت اور گہرے مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور ان کے درمیان خط و کتابت بھی ہوئی تھی وہ اس پر مستزاد ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر سید صاحب اس میں شاعری کرتے رہتے تو فارسی کے بڑے شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔

۱۹۰۵ء میں شبلی کی ندوہ آمد پر سید صاحب نے فارسی میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغِ طورِ ایمانی

عربی، فارسی اور اردو ادب میں قصیدہ مشکل ترین صنفِ سخن ہے جس سے عہدہ برآ ہونا عام شاعر کے بس کی بات نہیں۔ مزید برآں فارسی کے اساتذۂ فن نے اس

---

[1] معارف، جولائی ۱۹۷۱ء

کا جو معیار قائم کر دیا ہے اس کی تقلید میں کامیاب ہو جانا بہت زیادہ دشوار کام ہے۔ لیکن سید صاحب نے تفنن طبع کے طور پہ اس کوچہ کی سیر کی اور عرفی و قاآنی جیسے صحرانوردوں کی یاد تازہ کر دی۔

تشبیب کے اشعار میں ساقی سے شراب علم طلب کی ہے، علوم و معارف کی اہمیت اور مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ تشبیب کے آخری ۲دو اشعار درج ذیل ہیں۔ دوسرے شعر میں شبلی کے لئے مرغ باغ یزدانی کے گریز کے ساتھ مدح کا آغاز ہو جاتا ہے۔

فسوں سازی چشم نرگسیں دل ربائی بازد   کہ مسحور بہ سحر کلک جادوئے سخندانی
نہ دارم گوش برایں نغمہ سنجیہائے داؤدی   کہ گوشم ہست بر آواز مرغ باغ یزدانی

مدح میں بڑی سخن سنجی و معنی آفرینی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ شبلی کو شہنشاہ علم قرار دیا۔ ان کے حکیمانہ خیالات کے علاوہ نظم و نثر اور تحقیق کے میدان میں انھیں بے مثال ثابت کیا ہے۔ قصیدہ کے تمام آداب اور ممکنہ محاسن شعری کو سلیقہ کے ساتھ برتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف فارسی کے معیاری قصائد کا مطالعہ کیا ہے بلکہ عربی کے متاخرین شعرا پر بھی ان کی گہری نظر ہے جس نے قصیدہ میں ان کی رہنمائی کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ فارسی میں متوسطین اور متاخرین شعراء میں وہی ممتاز بن سکے جنھوں نے فارسی کے اساتذہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ عربی قصیدہ کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور اس کے فن سے روشنی حاصل کی تھی۔ سید صاحب کے اس قصیدہ کو اعلیٰ درجہ کا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن خیال کی بلندی، قصیدہ کی جلالت و شکوہ اور تراکیب کی مضبوط بندش سے یہ بات عیاں ہے کہ اتنی پختگی بہت زیادہ مشق کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے جو اس بیس سالہ نوجوان کا پہلا فارسی نمونۂ کلام ہے۔

خدیو کشور معنی کہ فرمانش برد دلہا   چہ دلہا؟ سکہ بر جان زد چہ بر قاصی چہ بر دانی
بیا اے قصہ خوانِ جاہ افریدون و کیخسرو   بہ بیں اینجا کہ درویشی کند در فقر سلطانی
وثاقش سجدہ گاہ قصر و ایوانِ شہنشاہی   بساطش بوسہ گاہ دانش آموزانِ یونانی

سخن گویدبلبش یا گوہر شہوار می بارد   چنیں گوہر نہ زنہارہ آفریدست ابر نیسانی
گراں ترچند او راقش بود از گنج قارونی   نمی ارزد بیک حرفش ہمہ سامان سامانی
ضمیرش چوں کند غواصیٔ جیحونِ مشکلہا   برآرد دست فکرش صد درنا سفت و نورانی
کفش باشد تہی از درہم و دینار و دامانش   پراست از در عمانی و بہ از لعل بدخشانی
مسیحادم، باعجاز قلم، جان دگر بخشد   بحکم قم باذن العلم آں تن را کہ شد فانی
دلیل فضل ممدوحت نہ مدح تو ہویدا شد   بہ پیش مور سر نہ نہی کہ ہمنام سلیمانی

سید صاحب نے چند فارسی قطعات بھی کہے! اعلیٰ حضرت سرکار نظام نے آم کا تحفہ بھیجا تو اس پر دو قطعے کہے۔ جو زیادہ اہم نہیں ہیں، جب شیخ تھانوی نے اپنا عصا سید صاحب کو عطا کیا تو اس وقت یہ قطعہ کہا۔

سلیماں بودم و در دست ماتم نمی دادند   مرا از لطف حق در دست خواجہ داد منتانم
دگر چوں لطفِ حق خواہد مرا نقش و نگیں بخشد   ہما نقش و نگیں کو ملک معنی را بود خاتم

اردو میں بھی علامہ شبلی کے پاؤں کے حادثہ سے متاثر ہو کر ایک رباعی سپرد قلم کی تھی جو درج ذیل ہے۔

تنقید مراثی کے صلہ میں استاد   دربار حسینی نے سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی   اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

سید صاحب نے شخصی مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اتفاق یہ ہے کہ قصیدہ کی طرح مرثیہ کے نمونے بھی ان کی کم عمری کے زمانہ سے ہی مل جاتے ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں صغیر الحق دسنوی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا۔ اس میں زندگی کو سمجھنے کا ایک وسیع تصور کارفرما ہے لیکن اپنی غیر تجرباتی کمزوریوں کے ساتھ، وسیع النظری کی مثالیں ملتی ہیں لیکن روایتی حد بندیوں کے ساتھ غم سے پگھلنے کا احساس موجود ہے لیکن غم کی موجوں میں فطری روانی سے عاری۔

۱۹۱۴ء میں وفاتِ شبلی پر مرثیہ لکھا، یہ بھی دل کی دھڑکنوں کی آواز ہے۔ اور شاعرانہ لطافت سے مملو۔ اب یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ حالی کے مرثیۂ حکیم محمود خاں،

اقبال کے "والدہ مرحوم کی یاد میں" اور "جواب شکوہ" وغیرہ سے شاعر فنی طور پر متاثر ہے۔ اس میں

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں
شامِ اقبالِ گزشتہ مقطعِ عہدِ سلف
شمعِ بزمِ صحبت آخر نشانِ رفتگاں

سے شروع کر کے شبلی کے علم و فضل اور محنت و دقت کی توصیف، اپنے تعلقات کا تذکرہ اور قوم پر گوناگوں احسانات کا اعتراف و اظہار تشکر کیا ہے اس میں گیارہ اشعار کے پانچ بند اور سات اشعار کا ایک بند ہے۔ یہ بہت زوردار پر اثر اور یادگار مرثیہ ہے۔

دنیا کی محبوب ترین چیز وہی ہے جو محبوبیت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر لمحہ میں رفاقت بھی کرے اور جزو زندگی بن جائے، اس کے چھوٹنے کا غم انسان کو تڑپانے تلملانے کے ساتھ ساتھ پگھلا بھی دیتا ہے اور وہ غم پگھل کر جب شعر کے وسیلے سے ظاہر ہوتا ہے تو سب ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب سید صاحب کی عمر ۲۳ برس کی تھی اس وقت اُن کی اہلیہ کی وفات ہوئی، اس پر "مرگِ یار" کے عنوان سے ایک دلسوز مرثیہ سپرد قلم کیا۔

ہم سفر وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا
شمع اس راہ میں اُس کا رُخِ انور نہ ہوا
تیر جو آئے فلک سے ہدف اُن کا میں تھا
ظلم ہے کہئے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا
درد اُٹھ اُٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے
کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
کس سے کیجیے دلِ شیدا کا گلۂ تنہائی
مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا
حیف اس خون کی قسمت پہ جو مژہ سے ٹپکے
قطرۂ اشک ہوا گوہرِ احمر نہ ہوا
باعثِ رنج ہے اُمید کا پیدا ہونا
یارب اس خرمنِ امید میں اخگر نہ ہوا

چودہ اشعار کا یہ مختصر مرثیہ جوان عمر ہجراں نصیب شوہر کے قلبِ حزیں اور غم آگیں جذبات کا ترجمان ہے اور اس اجمال کی تفصیل میں بند کے بند لکھے جا سکتے ہیں۔

"رحلتِ شیخ" پر ۱۹۴۳ء میں جو اشعار لکھے ان کی دنیا ہی دوسری ہے۔ وہاں شاعر "مقامِ صبر" کی سیر میں مصروف ہے جہاں رونا رُلانا، شکوہ و فریاد اور آہ و زاری کی کسک اور تڑپ ظاہر نہیں ہوتی صرف محسوس کی جاسکتی ہے، اس کے آنسو رجائیت میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

داغِ فراقِ یار مٹایا نہ جائے گا   اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے   نقشِ دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا
پیرِ مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے   جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ   یوں ہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

سید صاحب نے اگرچہ اردو اور فارسی کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرکے اپنے ذوقِ سخن کا مظاہرہ کیا تھا لیکن یہ بات سامنے آچکی ہے کہ وہ کوئی باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ ان کے دورِ اول کی شاعری پر دوسرے درجہ کے شعراء امیر و جلال وغیرہ کی تقلید غالب ہے البتہ یہ بات ناقابلِ فراموش ہے کہ وہ ایک نرم دل اور گداز طبیعت کے مالک تھے۔ سادگی، شائستگی و نفاست ان کے رویئے میں بھری ہوئی تھی۔ تصوف ان کا خمیر تھا۔ دادا حکیم میر محمدی بہت بڑے صوفی تھے اور حکیم صاحب موصوف کے اخلاف بالخصوص سید صاحب کے والد حکیم سید ابوالحسن، برادرِ بزرگ حکیم سید ابو حبیب وغیرہ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ائمۂ وقت تھے۔ سید صاحب کی ابتدائی تربیت بڑے بھائی کے زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ وہ انھیں اپنی مجلسوں میں بٹھاتے تھے وہاں سید صاحب نے کچھ ذکر و مراقبات وغیرہ بھی کئے لیکن حصولِ علم مقدم تھا اس لئے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ "سیرت" کی چھ جلدیں مکمل کر لینے کے بعد مولانا تھانوی سے وابستہ ہوئے اور بآخر خمیر اُٹھ آیا۔ نوجوانی کی شاعری نے ذہن و طبیعت کو موزوں اور رسا پہلے ہی بنا دیا تھا۔ سیرت نگاری نے غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی شیخ سے وابستگی کے بعد کوئی حال، حال نہیں رہا تھا بلکہ مقام بھی تیزی کے ساتھ حال بننے لگا۔ بغرض کسی ایک مقام پر زیادہ دیر نہیں رہ پاتے تھے کہ اس میں رسوخ

ہو جاتا اور " ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب " کے مصداق علم الیقین جیسے دشتِ امکاں پر جلد ہی عبور حاصل ہو گیا اور حق الیقین کی طرف بھی توجہ تھی ۔

سلسلۂ نقشبندیہ میں سلوک کی ایک اہم منزل ہے کہ سالک جب مرشد کے سوا ہر طرف سے خالی الذہن ہو جائے، حضور میں اس کے چہرہ کی طرف نگاہ جمائے رکھے اور غیاب میں انھیں کیفیات کا تصور کرے ۔ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ رسول اور خدا کی محبت تک پہنچنے کے لئے سالک کے عشق کا مرکز مرشد ہی ہوتا ہے اگر وہ سالک شاعر ہے تو اسی سے ہمکلام ہوتا ہے اور عاشقِ مجازی محبوب سے جو بھی امکانی تصورات وابستہ کر سکتا ہے وہ سید صاحب نے کئے اور انھیں اپنی شاعری میں بیان کیا ہے ۔

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو
دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کس سمت چلا ہے
تمیزِ صدا ہائے درا بھول گیا ہوں
تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی
قید میں آرام ہی آرام ہے ئو
لذتِ دیدار قرباں انتظارِ دید پر
ٹکٹکی سی صبح سے تا شام سوئے بام ہے
اُف رے دریائے معاصی کی تلاطم خیزی
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں
چشمِ ساقی میں بھری کیا بادۂ پُرجوش ہے
جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے
مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ کہ ہو
ہر ادا محبوب کی محبوب ہے ئہ
تری ساقی کرامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی
زباں میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیانِ دل

ذکر و عبادت، اوراد و وظائف اور حضور و شہود سب کا واحد مقصد یہی ہے کہ قلبِ سالک ماسوی سے پاک ہو جائے اور پیر و مرید کا اثر و تاثر اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب یہ کیفیات حاصل ہو جائیں ۔ عاشق کے محبوب نے اس میں مکمل رہنمائی کی ہے ۔ اگر اقبال کی خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ تھا تو اس عاشق کو بھی اب الا اللہ کے سوا کوئی آواز ہی نہیں سنائی دیتی ۔

کس نے چھیڑ دی یہ صدائے دلنواز
ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں
ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے

اس تجلّی گاہ کا ہر نازنین ۔۔۔ کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند ۔۔۔ قلب ذاکر سازِ الا اللہ ہے
وجد میں جان ہے تو اعضا رقص میں ۔۔۔ جامِ مئے آوازِ الا اللہ ہے

سید صاحب کی رگ رگ عشق سے تپاں ہے اور یہ عاشق مرشد سے قرب معیت کے مقابلے میں دُنیا کی محبوب چیز کو قربان و خاکستر کردینے میں تامل نہیں کرتا۔

مرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں ۔۔۔ لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل میں

اردو شاعری میں خواجہ میر درد کی عارفانہ شاعری سے سید صاحب متاثر ہوئے۔ دردؔ نے شرابِ معرفت کے استعارہ کے طور پر خمریات کو وسیلۂ اظہار بنایا لیکن وہ اس کے نشہ سے بہکتے نہیں۔ بلاشبہ وہ عشق کی تندی کے قافلہ سالار ہیں لیکن ذاتی طور پر اربابِ صحو میں شمار کیے جاتے ہیں سکر میں نہیں، بے ادبی اور مجذوبانہ کلمات سے ان کی زبان آلودہ نہیں ہے۔ سید صاحب اس باب میں دردؔ کی پوری پوری پیروی کرتے ہیں وہ قلبی کیفیات کو جامۂ شعر پہنانے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کی واردات بھی فرضی نہیں۔ ان کی شاعری پیشہ ورانہ یا ذریعہ عزت و شہرت اور وسیلۂ معاش نہیں ہے۔ یہ صرف محسوساتی اور تجزیاتی شاعری ہے جو عام طور پر وجدانی کیفیت طاری کردیتی ہے۔ وہ ابتداءً مشق فنا میں مستغرق ہوتے ہیں، پھر بحر فنا میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس کی سرمستی سے چھٹکارا دشوار ہے ان پر ہمیشہ سرمستی اور نیستی چھائی رہتی ہے۔

سیر الی الرسول اور فنا فی الرسول اس راہ کی بہت اہم اور بلند منزل ہے۔ یہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب سالکہ ایقان و اذعان کمال کو پہنچ جاتا ہے اور سیر الی اللہ سے پہلے کی تمام کڑیاں راستہ صاف کردیتی ہیں۔ رسول کی محبت ہی اس کا ایمان بن جاتی ہے، نور الانوار اس کا رہنما اور اطیعوا الرسول فقد اطاع اللہ اس کا اصول بن جاتا ہے رسولؐ کے نور کے بغیر ہر چیز اس کے لئے بے مزہ ہوتی ہے بالخصوص سلسلۂ نقشبندیہ میں سنت و اتباع سنت کا التزام و انہماک حب رسول کی علامت سمجھا جاتا ہے

اور چونکہ خود رسولؐ نے محمداً عبدہٗ و رسولہ کہہ کر اپنے لئے رسالت کے مقابلے میں عبدیت اور بندگی کو ترجیح دی تھی اس لئے اس منزل میں سالک کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس جذبہ کا حامل ہو۔

سید صاحب کی شاعری کیفیات قلبی اور تجربات ذاتی کی ترجمان ہے۔ اس لئے ان کی آخری دور کی شخصیت کو شاعری سے اور شاعری کو شخصیت سے جدا کر کے سمجھنا مشکل ہے۔ فنا فی الرسول کے بعد جو شاعری وجود میں آئی وہ اردو نعت گوئی میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ اردو میں نعت گوئی کی روایت خاصی پرانی ہے لیکن محسن کے قصیدہ "سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" سے نعتیہ شاعری کے عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے اور متعدد اربابِ فن کی بہترین نگارشات سے مالا مال ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے سید صاحب نے صرف چار نعتیں لکھی ہیں، دو شیخ سے وابستگی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۹۴۲ء میں اور دو ۱۹۴۹ء میں آخری سفرِ حج کے موقع پر۔ اول الذکر دونوں میں حبِ رسول سے سرشاری کے ساتھ تندی بھی ہے اور زبان و طرزِ بیان پر کمال قدرت کے ساتھ افکار کا مدوجزر بھی شاعر کی کوشش ہے کہ کوئی امکانی صفت بیان کرنے سے نہ رہ جائے۔ رواں اور مترنم بحروں کا انتخاب اور شاعرانہ حُسن کا اہتمام بھی کیا گیا ہے غرض محاسنِ کلام کے اعتبار سے بھی یہ نعتیں اہم مقام کی حامل ہیں۔

نام محمد صلِ علیٰ نورِ محمد صلِ علیٰ　　حمد مورد صلِ علیٰ قد ممد صلِ علیٰ
چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلف معنبر لیل وسجیٰ　　قلب مطہر نورِ ہدیٰ ذکر ممجد صلِ علیٰ
شاہدِ عالم شاہِ اُمم ہادیِ اعظم شمعِ حرم　　صاحبِ لطف جود و کرم حق سے مؤید صلِ علیٰ
ساغرِ کوثر جام ترا سیر ہے تشنہ کام ترا　　خوانِ کرم پیغام ترا اسم محمد صلِ علیٰ
نسبت بیضا راہ تری جاہ خدا کی جاہ تری　　شافعِ عاصی جاہ تری رفرف مسند صلِ علیٰ
نورِ الٰہی نور ترا غارِ حرا ہے طور ترا　　ہے ہوش میں ہر مخمور ترا اے نورِ مجسد صلِ علیٰ

جی میں ہے عاشق سجدہ کرے تو نے جہاں پہ پاؤں دھرے
اور بشوق و ذوق پڑھے محضر مرقد صلِ علیٰ

لولاک لما عنوان ترا فرمانِ خدا فرمان ترا   پیغام خدا فرمان ترا ایمان خدا ایمان ترا
ہے تیری محبت دین مرا اور دین ترا آئین مرا   ہر لفظ پہ تیرے یقین مرا عرفانِ خدا عرفان ترا

اس کے سات سال کے بعد ۱۹۴۹ء کے آخر میں دو نعتیں کہیں۔ ان میں ظاہری بالکل نہیں بلکہ نیک روی، نرم گفتار اور ادب کا غلبہ ہے الفاظ میں بھی شان و شوکت کا اہتمام نہیں بلکہ احتیاط نظر آتی ہے لیکن تاثیر و تغزل اور داخلی کیفیات کے اعتبار سے یہ بلند پایہ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ سالک کے لئے عشقِ رسول جتنا زیادہ ممکن ہے یہ نعتیں اس کی مظہر ہیں۔ ان میں پہلے کے مقابلے میں اشعار کی تعداد بھی کم ہے اور شاعر خود کلامی میں منہمک۔

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے   مکّی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس   آرام گہہ پاک رسولِ عربی ہے
آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو   خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج   جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

⁂

عشقِ نبوی دردِ معاصی کی دوا ہے   ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمعِ ہدا ہے
پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق   تصویر پہ خود اپنی مصوّر بھی فدا ہے
بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبّت   جو پیروِ احمد ہے وہ محبوبِ خدا ہے
لے جائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور   جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

تصوف کے سلسلۂ نقشبندیہ میں دس اصطلاحیں نظر بر قدم، سفر در وطن، وطن در سفر، خلوت در انجمن، یاد کرد، باز گشت، نگاہ داشت، وقوف ربانی، وقوف قلبی اور وقوف عددی، تربیت سالک کے لئے ضروری ہیں۔ انھیں کے ذریعہ سالک مختلف مقامات تک پہنچتا ہے۔ سیر الی اللہ اور پھر فنا فی اللہ کی منزلیں سلوک کی آخری منزلیں ہیں۔ بالفاظِ دیگر سالک کی معراج راضی بہ رضا ہو جانا ہے۔

ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیہ۔

منظور تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے   اُمید جزا خوفِ سزا بھول گیا ہوں

عشقِ حقیقی کمالِ سلوک ہے۔ جو شخص اس منزل کو پہنچ جائے اور اس کے حضور و شہود کو دوام ہو جائے تو قلب میں ماسوی کے لئے گنجائش نہیں رہتی اور دل کی انجمن آرائیاں خلقِ خدا بن جاتی ہیں۔ یہ عشق دو عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے   وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیات دو روزہ کا کیا عیش و غم   سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

ہر جگہ اور ہر لمحہ محبوب نگاہ کے سامنے رہتا ہے، حضوری کی دائمی کیفیت کی تمنّا بھی ہر وقت عاشق کے پیشِ نظر ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ سلسلۂ چشتیہ سے بھی وابستگی ہے اور اس اتصال میں وجد و ضبط کی مابہ الامتیاز خصوصیات کے تصادم کو روکنا تقریباً ناممکن ہے۔ "حیات" میں سید صاحب کے والد کا ایک واقعہ درج کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے لونڈیوں کا ایک گیت سنا تو اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ وجد میں آکر دیوار میں اپنا سر دے مارا جس سے خون جاری ہو گیا۔ سید صاحب پر بھی یہ غیر معمولی کیفیت اور اس پر قابو پانے کی خواہش ہر وقت غالب ہے وہ نقشبندی ضبط کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں اور خدا سے بے تابانہ دعا گو ہیں۔

المدد توفیق ضبط و المدد تاب سکوت   لب پہ آئے نہ جوش دل کہیں اسرار دل

یہ بات اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ یہ کیفیت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں اردو میں موجود کلام کے علاوہ فارسی کی ایک غزل بھی ہے جس کا انداز و اسلوب عراقی سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ شاعر نے عشق کی سرشاری میں شاعرانہ رموز و نکات اور تمام محاسن کے ساتھ ساتھ قرآن کی آیتوں کو اس طرح جزوِ شعر بنایا ہے کہ لفظی و معنوی روانی میں کہیں سکتہ بھی حائل نہیں ہوتا۔ سالک کے لئے جن عناصر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور محبوبِ حقیقی کا سالک سے جو تعلق ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے اور خود شاعر پر جو کچھ کیفیت طاری ہے سب کو کمالِ ایجاز کے

ساتھ بیان کیا ہے۔ فارسی میں سید صاحب کی یہ ایک ہی غزل ہے بقول غلام محمد صاحب اس غزل کے بارے میں سید صاحب نے خود فرمایا کہ "انتیسویں شب رمضان کو تہجد پڑھ کر ذکر کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتہً یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی[۱] چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

عشق را گوئی جنوں اے بے خبر باہمہ ہوش ایں جنونم آرزوست
خوش نمی آید سجود بے حضور فی صلوٰۃ خاشعونم آرزوست
قرب بے غیبت نماز عاشقاں فی صلوٰۃ دائمونم آرزوست
ایں شتابئ دل ناصبر بیں انچہ می خواہی کنونم آرزوست
بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن نشتر زخم درونم آرزوست

نسبت عشق کے حصول کے بعد سالک و محبوب کے درمیان سے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ عاشق کو ہر چیز میں اسی کا مزہ آنے لگتا ہے، اسی کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ اس سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے۔

ترے نام ہی میں حلاوت ملے جو ذوق محبت کی لذت ملے
جو تیری رضا کی بشارت ملے تو دونوں جہانوں کی راحت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے تو سارے غموں سے فراغت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں آخری سفر حج کے موقع پر ایک غزل کہی تھی، کیفیت اور شعریت دونوں لحاظ سے وہ سید صاحب کی نمائندہ غزل کہی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ان دو نعتوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے سید صاحب کا کلام نہیں ملتا اس لئے یہ ان کی آخری غزل بھی ہے۔ بحر کی روانی، مناسب و مترنم الفاظ کا انتخاب اور عشق کی سرمستی کا احساس و اظہار شاعر کو مومن کے قصیدوں اور اقبال کے خصوصی مزاج سے جا ملاتا ہے۔ سید صاحب کی بیشتر غزلیں مسلسل ہی ہیں لیکن اس مسلسل غزل کا پایہ زیادہ بلند ہے۔ اس کے کینوس میں وسعت

---

[۱] ارمغان سلیمان ص ۳۳

اور فکر میں بلندی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی بلند جگہ سے کھڑے ہو کر عالمِ اسلام کی کیفیات کا جائزہ لے رہا ہے اور اپنا تاثر بیان کر رہا ہے۔ سلوک میں سفر و وطن کی اصطلاحوں کا یہاں زیادہ خوبصورت اظہار ہے اسی طرح بازگشت یعنی ذکر کرتے کرتے مناجات و دعا کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یہ غزل اس کی بھی مظہر ہے۔ اشعار ذیل سے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

دیدۂ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں
ان کے کرم کے ہم نثار اُن کی عطا کا کیا شمار
دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں
روز مرا نیا مقام صبح کہیں کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام راہِ خم و دراز میں
دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز و ساز
ہے یہ دعا بہ صد نیاز درگہِ بے نیاز میں
دل جو ملا سیاہ کار آنکھ عطا ہو اشکبار
دھوئے جو دل کو بار بار خلوت خاص ساز میں

اس دعا و مناجات کی ابتدائی شکل وہ مناجات ہے جو وابستگیٔ شیخ کے مستقبل قریب میں ہی کہی تھی اور ہند و پاک کے بہت سے اسلامی مکاتب کے بچوں کی "صبح کی دعا" بن گئی ہے۔

صدق احسان کی دولت مرے مولا دیدے غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دے دے

دوسرے عارف شعراء کی طرح سید صاحب نے بھی عقل و عشق کی معرکہ آرائی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عشق کی افضلیت واضح کی ہے اور عقل کو گمراہ کن یا محوِ تماشائے لبِ بام قرار دیا ہے۔ سالک کو عرفان حاصل ہونے کے بعد ہر وقت منزل بہ منزل سفر کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور خلوت در انجمن ہر لمحہ اس کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ یہی حال

نقش قدم یا نقش بر قدم کا ہے۔ تصوف کی دوسری اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے اُن اصطلاحوں اور اُن کی کیفیات پر بھی متعدد شعر کہے ہیں جس سے اس میدان میں بھی ان کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحب کے کلام میں جذبۂ عشق کی حرارت و تندی ہے۔ کتنے ہی عشقیہ اشعار ایسے ہیں جو اثر و کیف اور سوز و گداز کے ساتھ عشق حقیقی کی لطافت و پاکیزگی، نزہت و رفعت کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ کلام خس و خاشاک سے عموماً پاک ہے لیکن تکرار خیال سے پاک نہیں۔ زندگی میں قناعت تھی، شاعری بھی اس وصف کی آئینہ دار ہے، متانت مضمون بلند خیالی، سادگی و صفائی و شستگی، برجستگی و شگفتگی، تکرار الفاظ، بعض جگہ بے ترتیبیٔ الفاظ اور مترنم الفاظ سے بھی کلام میں حسن پیدا ہوا ہے۔ تغزل جس کا تعلق سطحیت سے نہیں، دل و دماغ کی آگہی سے ہے، سید صاحب کے کلام میں اکثر مل جاتا ہے زبان معیاری اور مانوس ہے۔ فارسی تراکیب اور اضافتوں کا استعمال بیشتر مقامات پر حسین ہے لیکن جہاں صرف کلام موزوں کر دیا گیا ہے وہاں یہ تعقید اور توالیٔ اضافت چغلی کھائے بغیر نہیں رہتے۔

"غزل الغزلات" (دوسرے دور کا کلام) کے تحت سید صاحب کا جتنا کلام موجود ہے وہ سلوک سے متعلق ہے۔ غالب حصّہ برجستہ طور پر وجود میں آیا ہے اور وہ سب ان کی شخصیت کا آئینہ اور ان کے نظریات کا ترجمان ہے۔ وہ نفیس و پاکیزہ طبیعت کے مالک تھے، ان کا یہ کلام بھی ان ہی خصوصیات کا حامل ہے اس دور کے کلام میں آمد ہو یا آورد، یہ بات یقینی ہے کہ کہ اس کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں! انھیں خود بھی اپنے اس کلام کی اہمیت کا احساس اعتراف ہے اور بعض جگہ انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے ؎

فیض ہے یہ کس ولیٔ وقت کا　　اب مرا جو شعر ہے الہام ہے
نغمۂ اللہ سے طبعِ حزیں موزوں ہوئی　　جو کبھی گائی نہ تھی وجد میں آنے لگی
جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں　　سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں
سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں　　مستی مری بادۂ انگور کی نہیں

لسانیات

زبان یا زبانوں کے سائنٹفک مطالعہ کو لسانیات کہتے ہیں۔ اس کی متعدد قسمیں ہیں مثلاً توضیحی لسانیات، تاریخی لسانیات، تقابلی لسانیات اور تخالفی لسانیات وغیرہ۔ آغاز زبان کے نظریوں کا تعلق بالعموم تاریخی لسانیات سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک ذیلی شاخ ایٹمالوجی کہلاتی ہے جس میں یہ مطالعہ کیا جاتا ہے کہ کسی لفظ کی شکل مختلف زمانوں میں کیا کیا رہی ہے۔ اس کے لئے الفاظ کی تحقیق کے ماہرین لفظ پر سینکڑوں سال سے جمے ہوئے زنگ کو کھرچ کر اس کی ناقابل شناخت اصلیت کو سامنے لے آتے ہیں۔

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں متعدد اور مختلف نظریات پیش کئے جاتے رہے ہیں ”اردو عہد اکبری میں پیدا ہو کر شاہ جہاں کے زمانہ میں ارتقاء پذیر ہوئی“ میر امن نے اپنا یہ خیال ظاہر کر کے آغاز اردو کے نظریات کا بنیادی پتھر رکھ دیا جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو انشاء اللہ خاں انشاء نے ہندو و مسلمانوں کے میل جول سے اردو کی تخلیق بیان کی۔ ہارنلے کلی طور پر اور گریرسن ابتداً میر امن کے اس نظریے سے متاثر ہوئے لیکن گریرسن ہندوستان کا لسانی جائزہ لینے کے بعد سنبھل گئے اور انھوں نے اپنے خیال میں تبدیلی کر کے میر امن کے نظریے کو باطل ٹھہرایا۔

”ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں میں خود

بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے، میر امن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میر امن کے بیانات کے مطابق اردو زبان مختلف لوگوں کی بولیوں کی معجون مرکب سے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہو گئے تھے، تیار ہوئی.... اس غلط فہمی کو اول اول سر چارلس لائل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی جائزے نے اب اس کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ بالائی دو آبے اور مغربی روہیلکھنڈ کی بول چال کی زبان ہے جن میں سے انگھڑ اور گنوارو الفاظ و محاورات نکال کر اسے ادبی نکھار اور سنگھار دے دیا گیا ہے۔"[1]

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی آب حیات کے ابتدائی حصہ میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں برج سے اردو کی پیدائش کا نظریہ عام ہو چکا تھا اور یہ کہ خود محمد حسین آزاد بھی اسی کے موئید ہیں:

> "اتنی بات ہر جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے .... اس کی تکمیل شاہ جہاں کے عہد میں لیکن ارتقا اس سے پیشتر ہوا۔"[2]

اس کے علاوہ ان کے یہاں موخر الذکر جملہ اور اس کی مزید تفصیلات کے بیان میں میر امن اور ہارنلے کے خیالات کی جھلکیاں بھی مل رہی ہیں۔

پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے اردو کو پنجابی کی بیٹی ثابت کیا اور نصیر الدین ہاشمی نے دکن کو اس کا مولد قرار دیا۔

اسی سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام بھی قابل ذکر رہا ہے انھوں نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ مسلمان ابتدا میں سندھ و ملتان آئے تھے اس لئے اردو کی پیدائش کا سراغ سندھ سے لگایا جا سکتا ہے۔ تاریخ زبان کا مطالعہ کرنے والے اور اردو کے ماہرین لسانیات کے نزدیک سید صاحب کا صرف یہی نظریہ لائق بحث رہا ہے

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا جائزہ جلد ۹ حصہ اول حاشیہ ص ۴۴

[2] آب حیات ص ۲

حقیقت یہ ہے کہ ان کی لسانی فکر کا بھی ارتقا ہوا اور اردو کے آغاز سے متعلق بعد میں جو سائنٹفک نظریات سامنے آئے سید صاحب کے یہاں اس کے واضح اشارے اور صریح وضاحتیں موجود ہیں، نیز ایٹمالوجسٹ کی حیثیت سے بھی موصوف کو ایک انفرادی وامتیازی مقام حاصل ہے "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" اور تمہید میں موصوف نے اردو کے چند منتخب الفاظ پر غور کر کے بعض نئے گوشوں کی نقاب کشائی کی اور کچھ اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔ بنابریں اس میدان میں سید صاحب کی خدمت ناقابلِ فراموش ہے اور ان کے لسانیاتی پہلو پر غور کرتے وقت ان دونوں امور کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

آغاز اردو سے متعلق سید صاحب کا "نظریہ" اپنا ایک طویل پس منظر رکھتا ہے موصوف کو زبان اور اس کے مسائل سے دلچسپی اور شغف تھا۔ الندوہ کے ابتدائی پانچ برسوں میں عربی زبان کے مسائل اور اس کی وسعت سے متعلق ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان کا پہلا تقرر بھی عربی زبان وادب کے معلم کی حیثیت سے ہی ندوہ میں ہوا۔ اسی عرصۂ ملازمت میں ۱۹۱۲ء میں انھوں نے "لغاتِ جدیدہ" کے نام سے ایک عربی اردو لغت تیار کر کے شائع کی جس میں تقریباً چار ہزار جدید عربی الفاظ کے معنی دیئے گئے تھے۔

اس لغت کے دیباچہ میں انھوں نے چند لسانیاتی مسائل پر بھی گفتگو کی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علم ("فیلالوجی") پر انھیں کافی دسترس حاصل تھی۔ وہ زبانوں کے اہم خاندانوں سے واقف تھے دیباچہ میں زبانوں کے خاندان اور ان کی شاخوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی کہ زبان کب اور کس کس طرح تبدیل ہوتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی اس کی زندگی کے لئے اشد ضروری ہے وغیرہ۔ پھر زبان کے مولد اور دخیل الفاظ سے بحث کی ہے، ان کی قسمیں بتائی ہیں اور سب کی مثالیں دی ہیں۔ چونکہ یہ لغت عربی سے متعلق ہے اس لئے ان تمام زبانوں کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جو عربی زبان میں اپنے الفاظ درآمد کرنے میں معاون ہوئی ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جن سے عربی میں کم الفاظ آئے ان میں جرمن، چینی، اولی، سواحل و جزائر ہند، حبشی، عبرانی، انگریزی

قبطی اور سنسکرت شامل ہیں۔ دوسری وہ زبانیں ہیں جن سے عربی نے نہایت کثرت سے الفاظ حاصل کئے ہیں یہ زبانیں ہیں سریانی، لاطینی، فرنچ، اٹالین، ترکی، یونانی، فارسی۔

چونکہ بول چال کی زبان کی رفتار تیز ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ عہد حاضر اس کی متذکرہ بالا حیثیت میں نمایاں فرق آگیا ہو لیکن لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس "جدید اردو لغت" کا دیباچہ ایک پس منظری اہمیت و وقعت ضرور رکھتا ہے۔

اس لغت کی اشاعت کے بعد سید صاحب نے سیرۃ النبی کے مقدمہ (جو بعد میں "ارض القرآن" کے نام سے شائع ہوا) کے لئے عربی، عبرانی اور انگریزی مآخذ وکتبات کا براہِ راست مطالعہ کیا جس نے عربی و عبرانی زبانوں کے لسانیاتی رموز و نکات ان کے سامنے جلی کر کے پیش کر دیئے تھے اور اس کتاب میں ان دونوں زبانوں کے تقابلی مطالعہ سے انھیں بڑی مدد ملی تھی۔

علم زبان سے ان کی اس واقفیت[1] سے قطع نظر اردو سے انھیں شروع سے لگاؤ تھا اور مدیر معارف ہونے کے بعد وہ اپنے شذرات میں اردو کے مسائل پر لکھتے رہتے تھے۔ تحریک ترک موالات کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے ساتھ ساتھ اردو سے نفرت و تعصب کے بڑے بڑے مناظر سامنے آئے اور معارف میں سید صاحب کا سنجیدہ قلم مستقل طریقہ پر اردو کا دفاع کرتا رہا، اس سلسلہ میں اردو زبان کے متعلق ان کے بعض تفصیلی مضامین بھی شائع ہوئے۔

ہندو مسلم اختلافات کے خاتمہ کے جذبہ سے انھوں نے "عرب و ہند کے تعلقات" لکھی جس میں یہ کوشش کی کہ انگریزوں نے جن اختلافات کی تخم ریزی کی تھی وہ تو کافی پھل دے چکے اب ماضی میں ہندو مسلم قوموں کی باہمی یگانگت و محبت کی چاشنی سے بھی انھیں لذت یاب کیا جائے اور محمود غزنوی کے تسلط سے پہلے کے ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا کو آئینہ کیا جائے کہ محمود سے کئی صدیوں پہلے منصورہ بھکر سندھ و ملتان پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں اور ہندو مسلمانوں کے درمیان

---

[1] اس علم کے اصولی مباحث سے متعلق چند مزید وضاحتیں آئندہ صفحات میں بھی شامل ہیں۔

بہت خوشگوار تعلقات تھے۔

سید صاحب کے خیر سگالی اور یک جہتی کے اس صالح جذبہ نے اُردو کے آغاز سے متعلق بھی متعدد مضامین میں ان سے اظہار خیال کرایا۔ ایک مضمون خاص طور سے ”اردو کیوں کر پیدا ہوئی“ کے عنوان سے لکھا تھا لیکن اس کی نوعیت بھی وہی تھی۔ ان سب مضامین کا مرکزی خیال یہ تھا کہ عرب ابتداءً سندھ و ملتان میں آکر رہے، وہاں کی زبان ان سے متاثر ہوئی یہاں تک کہ سندھ نے عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔ ان مسلمانوں اور ہندوستان کے لوگوں کے باہمی اختلاط سے ایک نئی مشترک زبان پیدا ہونے کے امکانات روشن ہو گئے اور اس کے ابتدائی خد و خال نمایاں ہو گئے۔ محمود غزنوی کے ساتھ یہ مشترک بولی پنجاب آئی، کچھ عرصے وہاں رہ کر غوری و ایبک کے ساتھ پنجاب سے دہلی چلی آئی۔ محمد بن تغلق کے ساتھ وہ دکن گئی جہاں اس کو تیزی سے فروغ ہوا اور شمال میں بھی بتدریج پھلتی پھولتی رہی۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہی اس کا نام ہندی، ہندوی اور ہندستانی تھا۔ فورٹ ولیم کالج قایم کر کے انگریزوں نے اپنی عیاری سے اس زبان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ہندی کے لئے پنڈت اور ہندوستانی کے لئے منشی اور مولوی ملازم رکھے۔ بعد میں بدنصیبی سے ہندوستانی کے لئے اردوئے معلیٰ کی زبان ”اردو“ نام کو رواج ہو گیا اور ہندی و اردو زبانیں باہم تصادم کا شکار ہو گئیں اور اپنی واحد اصلیت کو فراموش کر بیٹھیں ظاہر ہے ہندوستانی نام انگریزوں کا دیا ہوا نہیں بلکہ عالم گیر سے بھی پہلے اس کے لئے یہ مستعمل تھا۔ اس لئے اب (یعنی غیر منقسم) ہندوستان میں اردو کی ترقی کے لئے ضروری ہو گیا کہ اس کے اصل نام ہندوستانی کو پھر سے رواج دیا جائے جو پورے ہندوستان کی زبان کو بھی محیط ہے اور اردو نام جس کی عمر صرف ڈیڑھ سو برس ہے، اس کو منظم طریقہ پر ترک کیا جائے۔

اس سلسلے میں تفصیلات سے قطع نظر کر کے سید صاحب کی تصنیف نقوش سلیمانی سے صرف چند اقتباسات پیش ہیں:

> ”ہندوستان کے ہر شعبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں

> اس کا " ہیولیٰ " اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔" (صـ۲۱)
>
> " مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے اور سب سے عجیب یہ ہے کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے" (صـ۳۴)

آغاز اردو سے متعلق سید صاحب کے نظریۂ سندھ کی بحث سے ذرا ایک قدم اور آگے ..... بڑھیں تو موصوف کی لسانیاتی بنیادیں زیادہ مضبوط اور اردو کی پیدائش سے متعلق نظریہ زیادہ واضح اور جدید معلوم ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس جانب عمداً اغماض برتا گیا ہے، سید صاحب علم زبان کے اصولوں اور زبان کے ارتقائی مدارج سے بخوبی واقف تھے، ان کے یہاں واضح طور پر یہ نظریہ ملتا ہے کہ اردو دہلی اور اس کے نواح میں پیدا ہوئی، اپنی صرفی، نحوی اور دوسری لسانی خصوصیات کی بنا پر اس کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ہم پہلے یہاں چند تعمیمی بیانات پر نظر ڈالتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ سید صاحب تاریخی لسانیات کے اس دائرہ سے باہر قدم نکال رہے تھے جس کے تحت عربی و فارسی و ترکی وغیرہ کے مرکب سے اردو کی پیدائش کے خیالات ظاہر کئے جا سکتے تھے۔

> عرب عربی، ترک ترکی، مغل فارسی اور پٹھان پشتو بولتے ہوئے اس ملک میں آئے مگر آخر میں سب کو بھول کر ایک ایسی زبان بولنے لگے جو اس ملک کی پیداوار تھی جن میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اپنی زبانوں کے کچھ لفظ ملا دیئے اور اس سے چارہ نہ تھا۔
>
> (صـ۳۵۱)
>
> اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو

---

[1] حوالہ کے ان تمام صفحات سے مراد نقوش سلیمانی کے صفحات ہیں۔

کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے۔ اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی اور لغوی تحقیقات کا رخ ایران و خراسان و ترکستان سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا اور اس سے زبان کی اصولی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

(ص ۱۰۷)

اردو کے ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی اسی اصول کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”یہ غلط فہمی ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں“ کو جوڑ کر تیسری زبان وضع کی جا سکتی ہے زبان پاس پڑوس کی زبانوں سے غذا حاصل کر کے ان کی فضا میں سانس لے کر فربہ اور توانا تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ مل کر تیسری زبان کو جنم دینا اس کے بس کی بات نہیں۔“[1]

ڈاکٹر سبزواری ہی نے ایک اور لسانیاتی پروفیسر میکس مولر کے حوالے سے زبان کی تقسیم اور آغاز کے سلسلے میں ایک کلیہ بیان کیا ہے:

”پروفیسر میکس مولر کہتے ہیں کہ زبانوں کی تقسیم اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کی تعیین ان کی صرفی نحوی ساخت کے مطابق کی جاتی ہے، فرہنگ الفاظ کی اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں۔“[2]

صرف و نحو کو بنیاد بنا کر زبان کی پرکھ شوکت سبزواری اور میکس مولر کے بیان کردہ اصول کی ایک جھلک تو سید صاحب کے درج بالا دوسرے پیراگراف میں موجود ہے ہی، لیکن دوسری جگہ بھی متعدد بار بہت واضح طور پر موصوف نے ان اصولوں سے بحث کی ہے ان کا خیال ہے کہ فعل اور حرف جو صرف و نحو کی بنیاد ہیں، اردو کی شناخت کے سلسلے میں ان پر

---

[1] داستان زبان اردو ص ۱۲۷

[2] سائنس آف لنگویج۔ دوسرا لکچر ص ۶۸ بحوالہ داستان زبان اردو ص ۱۲۷

توجہ دینا ضروری ہے اور اردو کی صرفی و نحوی ساخت ہندوستانی اور دہلوی ہندی کی صرف و نحو پر مبنی ہے:

> "زبان کی ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے، اسم، فعل اور حرف۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جو زبان اختیار کی اس کے تمام فعل اور حرف ہندوستان ہی کی بولیوں کے اختیار کئے البتہ آدھے اسما جن میں بڑا حصہ نئی چیزوں اور نئے ناموں کا تھا وہ اپنی زبان سے لائے بقیہ اسما بھی ہندوستان ہی کے ہیں۔
>
> (ص۳۰)
>
> ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے، اسم، فعل اور حرف۔ اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ بھی ہندوی کے ہیں۔ البتہ اسم آدھے ہندی اور آدھے عربی فارسی اور ترکی لفظ ہیں اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ بھی مل گئے جن کے مسمی ان باہر ملکوں کے ہیں۔"
>
> (ص۲۵۵)

سید صاحب کے مطابق اردو دہلی اور اس کے قرب و جوار میں دہلوی ہندی سے پیدا ہوئی اور یہ دہلوی ہندی، ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اردو کا شجرہ بالآخر آریوں تک پہنچتا ہے:

> آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے معلوم نہیں وہ اس کو کب تک بولتے رہے۔ بہر حال اس میں میل ہوا اور اس سے آخر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ میں الگ الگ ہو گئی۔
>
> (ص۳۵۰)

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قدیم ہند آریائی کی ارتقائی شکل کا خاکہ بھی سید صاحب کے ذہن میں موجود ہے۔ دہلوی ہندی سے اردو کی پیدائش کا نظریہ باغ و بہار کے درج ذیل اقتباس پر تبصرے سے مزید واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے

”زبان اردو کی تاریخ سے متعلق میر امن، سر سید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے جو بیان سنایا تھا وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابیں (پنجاب میں اردو از محمود شیرانی، دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی) لکھی گئی ہیں جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گزار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے، ...... اب چہار درویش کے مصنف کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

”حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ انھیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا سلطان محمود آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر میں تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا .... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہوئے، آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی ......“

ان چند سطروں میں اردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ زمانہ اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سر تا پا حقیقت ہے یعنی یہ کہ موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان اور دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے۔“

(ص ۲۵۳)

> اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی اس لئے دہلوی ہندی میں سینکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ رل مل گئے خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔"

(ص ۲۵۷)

اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ بعض اہم بنیادوں پر سید سلیمان ندوی یہ رائے قایم کر چکے تھے سندھی کے مقابلے میں دہلوی ہندی سے اردو کے آغاز کا نظریہ راجح تر ہے، گویا ایک طرح سے اپنے مشہور نظریہ کی انھوں نے تردید کی اور اردو کی جنم بھومی دہلی کو بتاکر نئے علمائے لسانیات کی صف میں شامل ہوگئے اس حقیقت سے انکار کرنا اتنا ہی نامناسب ہے جتنا اب تک اس موضوع سے صرف نظر کرکے علم زبان کے محققین نے اپنا طرز عمل دکھایا ہے البتہ سید صاحب نے وسیع تحقیقی مطالعہ کے لئے اس طرح کے زیادہ دلائل پیش نہیں کئے جو جدید ماہرین لسانیات نے اساسی مطالعہ کے لئے پیش کئے ہیں خواہ نتائج غلط اخذ کئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سید صاحب کی ہمہ جہت علمی و عملی مصروفیات نے اس میدان میں آگے بڑھنے میں رغبت نہیں دکھائی ورنہ ان کے لسانیاتی مطالعہ کے نکات و غوامض خاصے وسیع دائرہ کے حامل ہیں، مثال کے لئے درج ذیل اقتباسات پیش پیش کئے جاتے ہیں۔

> کسی کا یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ زبان کوئی جامد چیز ہے جس کو پکڑ کر کوئی ایک جگہ جمائے یا پھر ٹھہرائے رہ سکتا ہے بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی چیز ہے جو آج کہیں تو کل کہیں ہے۔ چار سو برس پہلے کی انگریزی کو آج کی انگریزی سے ملاؤ تو معلوم ہوگا کہ دو قسم کی زبانیں ہیں[1] آج ایران میں حافظ اور سعدی کی

---

[1] "Language chanages constantly, a fact that becomes most noticeable when we read text a few centuries old. For instance, various kinds of change are apparent in almost any passage of Shakespear...."

Historical linguistics: An Introduction
by Winfred P. Lehmann
the University of Texas
1962, page 1.

زبان کہاں ہے۔"

(ص ۳۵۶)

"زبان وہ ہے جو چلن میں ہے، جو ہندوستان کی عام بولی کی حیثیت سے بولی اور لکھی جا رہی ہے اور جس کو ہندو مسلمان بول اور سمجھ رہے ہیں اور لفظوں کی جانچ کا طریقہ شبد ساگر اور قاموس نہیں، ہمارے گھر، بازار، راستے اور گلی کوچے ہیں[1]۔"

(ص ۳۵۷)

اٹیمالوجی[1] تاریخی لسانیات کی وہ شاخ ہے جو صوری اور صوتی اعتبار سے کسی لفظ کی پوری تاریخ کا پتہ لگانے اور اس کے ارتقا کی نشاندہی کا کام انجام دیتی ہے۔ اس میدان میں سید سلیمان ندوی نے نظریہ آغاز زبان کے مقابلے میں زیادہ تحقیق اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک خشک موضوع ہے لیکن سید صاحب نے یہاں اپنی لکھنؤ کی ادبی پرورش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رعایت لفظی اور دوسرے پیرایوں کے استعمال نیز اپنے اسلوب بیان کی شگفتگی سے اسے بہت دلچسپ اور ہر صاحب شوق کے پڑھنے کے لائق بنا دیا ہے۔

اس عنوان کے تحت جدید لسانیات میں مختلف ادوار میں الفاظ کے صرف ظاہری اور صوتی تغیر و تبدیلی سے بحث کی جاتی ہے لیکن سید صاحب نے بہت سے الفاظ کے معنیاتی پہلو کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" کے عنوان سے نقوش سلیمانی میں دو مضامین شامل ہیں پہلے مضمون میں تیرہ لفظ اور دوسرے میں ستائیس لفظ تحقیق و تاریخ کی رزم گاہ سے گذرے ہیں ان میں بعض صرف عنوان بالا کے تحت آتے ہیں؛

---

[1] ETYMOLOGY:

The branch of historical linguistics that deals with the origin and development of the words.

Lehmann

Historical linguistics - an Introduction Page 37

بعض کا شمار معنیات میں ہوتا ہے اور بعض دونوں پہلوؤں کو محیط ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض صرف برائے بیت بھی ہیں جنہیں اضافی کہا جا سکتا ہے۔ پہلے اور دوسرے مضمون میں بالترتیب حسب ذیل الفاظ ہیں۔

۱۔ دام۔ کیرانت۔ اشرفی۔ بیمہ۔ ڈاک۔ قمری۔ سوسی۔ فیرنی۔ بھات۔ رقم۔ ہندسہ۔ ریاضیات۔ سیاسیات۔

۲۔ ناشتہ۔ افطار۔ نہاری۔ سلفہ۔ قاب۔ رکابی۔ قلیہ۔ قورمہ۔ شوربہ۔ شراب۔ کباب۔ قالین۔ شاگرد پیشہ۔ راج۔ مستری۔ خراد۔ ساہول۔ الکونیا۔ جہیز و تجہیز۔ سرخی۔ مسل۔ نستعلیق۔ گفش۔ چلبلا۔ احدی۔ قلعی۔ تماشا۔

چونکہ بعض اہم الفاظ کے سلسلہ میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے، اور معنیات کا تعلق بھی لسانیات (لسانی تبدیلیوں) سے ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ نمونہ کے لئے چند مثالیں نقل کر دی جائیں۔

دام۔ ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے۔ ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے جو چھے اور دام دو لفظوں سے بنا ہے۔ آج سے دو ہزار برس پہلے ..... یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم تھا اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرا کر اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر دام ہو گیا۔ یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے۔ اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے۔ اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں ایک ہی شخصیت ہے صرف آب وہوا، لہجہ اور شکل وصورت کا فرق ہو گیا ہے۔

کیرانت۔ اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آنوں پر اور آنوں کی

پائیوں پر اور اس کے بعد کیرانت اور جو پر ہوتی ہے ...... یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے۔ ایک عربی دینار میں ۲۰ یا ۲۴ قیراط ہوتے تھے۔ عربی میں قیراط یونان سے آیا ہے۔ آج کل انگریزی میں یہی لفظ کیرٹ کی صورت میں مستعمل ہے اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیوروں اور چیزوں میں اتنے کیرٹ گولڈ کی اصطلاح عام ہے۔

رکابی۔ رکاب فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں اس سے رکابی بنی اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں اور اس سے ہندوستانی امرا کے لئے رکابدار پیدا ہوئے جو کھانے کا انتظام کرتے تھے یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے۔

عربی شرب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا۔ شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے۔ ایرانیوں نے جس کو شراب کہا اس سے متوالی شراب مراد لی اسی سے یورپی زبانوں میں سیرپ تیار ہوا جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا۔ لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت کا نام دیا۔ لفظ عربی ہے معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں۔

(ص ۳۱۷)

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے۔ لفظ تو عربی ہے لیکن معنی عجمی ہیں یہ مشی سے بنا ہے اس کے معنی چلنے کے ہیں اس کو باب تفاعل میں لے گئے تو تماشی ہوا اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے، عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدے سے تماشا بنا لیا جیسے تمنّی کو تمنا بنا دیا اور ہم اردو والوں کو بھی یہی تماشا پسند آیا۔ چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں اس لئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام پڑا۔[1]

سید صاحب نے اسی قبیل کا ایک مضمون "تمہید" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں عربی و فارسی الفاظ کو ہندی یا اردو کا جامہ پہنانے کے جواز پیش کئے ہیں نمونہ یہ ہے۔

---

[1] نقوش سلیمانی "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" ص ۳۲۸

"لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے اس کو چھوڑ کر مبادل یا متبادل بلوانے کی کوشش زبردستی ہے۔

محاذی کی عربی اصل محاذی اور ہندوستانی "ورے" (دلی میں بولا جاتا ہے) کی اصل عربی ورار ہے مگر اب محاذ اور ورے کو چھوڑ کر ان معنوں میں محاذی اور ورار نہیں بولا جائے گا۔ تبدیل کے مقابلہ میں تبدیلی غلط ہی ہو مگر وہ ہمارے یہاں صحیح ہے، خود صحیح کو سہی ہم نے کر دیا اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لئے ہیں۔ احوال عربی میں جمع ہی کیوں نہ ہو مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے۔ معنی کا لفظ عربی میں واحد ہے مگر اردو والے اس کو جمع بولتے ہیں۔ ماتحت عربی کے لحاظ سے بے معنی ہے مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح وفصیح اور بامعنی لفظ ہے۔ آشا ہندی کا چاہے کھرا لفظ ہو مگر ہماری زبان میں وہ آس بن کر آیا ہے اور وہی صحیح ہے ہندی میں وچار لفظ ہو مگر ہمارے یہاں بچار ہے۔"[1]

---

[1] نقوش سلیمانی۔ "تمہید"۔ ص ۳۳۱

مکتوب نگاری

اردو میں غالب نے جب سے ادب کے گرم۔ مجمر میں عود ہندی جلایا ہے۔ اردوئے معلّٰی کی محفل اس کی خوشبو سے بس گئی ہے۔ علماء اور صوفیہ کے خطوط اور مکتوبات تو اپنی روحانی برکتوں، علمی بحثوں اور مذہبی حقیقتوں کے سبب سے ہماری عقیدت مندیوں کا صحیفہ ہیں مگر غالب کے خطوط میں جو مزا ہے وہ صرف ادبی نکتہ پردازیوں کے چٹخارے سے ہے۔

اس کے بعد جو ادبی دور آیا اس میں ادب و شاعری کے نکتہ پردازوں اور ملک و ملت کے خدمت گذاروں کے بہت سے خطوط جن کو قدر دانوں نے تعویز بنا کر رکھا تھا، چھاپ کر اس تبرک کو وقف عام کیا سرسید کے خط، مولانا حالی کے نامے، نواب محسن الملک کے مکتوبات، مولانا نذیر احمد کے نصائح منشی امیر احمد مینائی کی تحریریں، اکبر مرحوم کے عنایت نامے اور مولانا شبلی کے مکاتیب چھپ کر ہماری زبان کے خزانہ کا سرمایہ بنے۔ اور اب مہدی افادی مرحوم کے خطوں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے....

سید سلیمان ندوی

(مقدمہ مکاتیب مہدی - ۱۲ر اپریل ۱۹۳۸ء)
مشمولہ نقوش سلیمانی ص ۳۸۸

مکاتیب مہدی پر مقدمہ لکھنے سے ۲۰ر سال پہلے سید صاحب مولانا شبلی کے خطوط مرتب کر کے دو جلدوں میں شائع کر چکے تھے۔ اس وقت فن مکتوب نگاری جن

مراحل تک پہنچ چکا تھا سید صاحب اس سے بخوبی واقف تھے اسی لئے مکاتیب شبلی اور مکاتیب مہدی کے مقدمات میں ان مکتوب نگاروں کے خطوط کی اہم خصوصیات بیان کی ہیں اور ضروری حواشی سے ان مجموعوں کو گرانمایہ بھی کیا ہے۔ "برید فرنگ" کے علاوہ خود ان کے ہر مجموعۂ مکاتیب میں وہی بے ساختگی، برجستگی، نشیب و فراز اور اظہار کی سادگی نظر آتی ہے جو اس فن کی جان ہے۔ سید صاحب کے خطوط کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ مکتوبات سلیمانی۔ دو جلد مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی
۲۔ مکاتیب سلیمانی مرتبہ مسعود عالم ندوی
۳۔ برید فرنگ مرتبہ سید سلیمان ندوی اور
۴۔ تذکرہ سلیمان حصہ دوم مرتبہ غلام محمد ایم اے

سہولت کے لئے ان مجموعوں کی درجہ بندی بھی کی جاسکتی ہے۔ "مکتوبات سلیمانی" مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے جن کا دائرہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۳ء یعنی تقریباً چالیس برس تک پھیلا ہوا ہے۔ مولانا موصوف سید صاحب کے بہت قریبی دوست اور رازدار تھے لہذا ان کے نام لکھے ہوئے خطوط میں چالیس سالہ زندگی کے اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور پیچ و خم کی پوری داستان ملتی ہے۔ وہ مدرس مضمون نگار، خطیب و مقرر، مناظر، ماہناموں اور ہفت روزہ کے ایڈیٹر، مصنف، شاعر، متاہل، (اہل و عیال والے) اور معاصرانہ رفیقوں و ہم چشموں سے نبرد آزما، ابتداً سلوک سے گریزاں اور پھر سلوک ہی کے دامن میں پناہ گزیں اور معرفت کی چاشنی سے لذت یاب غرض ان خطوط میں ان کی پوری شخصیت اپنے دھندلے اور گہرے نقوش کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی سید صاحب کے

> "غم و غصہ، صدمات، خانگی زندگی، شوخی و ظرافت، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت، ناگواری و طنز، سیاسی چاشنی سب ہی کی جھلکیاں اپنی اپنی جگہ ان اوراق میں محفوظ ہیں ان میں ان کی زندگی

کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کی پوری عکاسی مل جاتی ہے۔"[1]

مکاتیب سلیمان ایک شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے ان کا سلسلہ تقریباً سنہ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان میں وہ بے تکلفی اور لطف نہیں ہے جو ایک دوست کے خطوط میں ہوتی ہے اور پھر یوں بھی یہ عمر کے آخری بیس برس کے خطوط ہیں جن کا مقابلہ اول الذکر سے کسی طرح نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود فن مکتوب نگاری میں ان کی حیثیت مسلم ہے۔

سید صاحب ایک رکن کی حیثیت سے وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے تو ان کے ذمہ ایک کام یہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ وفد کی ہفتہ بھر کی روداد اور کارگذاری لکھ کر ہندوستان بھیجا کریں تاکہ یہاں کے لوگ وفد کے کاموں سے آگاہ رہیں چنانچہ سید صاحب نے جہاں یہ خطوط مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام لکھے وہیں اپنے چچا ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب اور اپنے احباب عبدالماجد دریابادی، مسعود علی ندوی وغیرہ کو بھی وہ تمام تفصیلات لکھتے رہے۔ یہ وفد تقریباً آٹھ ماہ برطانیہ اور فرانس میں رہا اس عرصہ کی پوری کارگذاری ان خطوط میں موجود ہے جس میں بنیادی اور مرکزی نقطہ سنہ ۱۹۲۰ء کی سیاست ہے۔ چونکہ سید صاحب کو یہ احساس تھا کہ ہندوستان میں ان خطوط کی تشہیر کی جائے گی۔ اخبارات میں بھی انھیں شائع کیا جا سکتا ہے لہذا یہ خطوط تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں اس پر مستزاد یہ ہے کہ خود مکتوب نگار ہی ان خطوط کا جامع و مرتب بھی ہے چنانچہ سید صاحب نے یہ مجموعہ "برید فرنگ" (یعنی یورپ کی ڈاک) کے عنوان سے سنہ ۱۹۵۲ء میں مکتبہ "الشرق" کراچی سے شائع کیا۔

"تذکرہ سلیمان" کا موضوع خالص متصوفانہ ہے۔ یہ سید صاحب کے ایک مسترشد غلام محمد سے سید صاحب کے آخر دس برس کی مکاتبت کا مجموعہ ہے اور بقول غلام محمد "یہ مربوط مراسلت فیض سلیمانی کا چشمۂ جاریہ بھی ہے اور ایک ایسا آئینہ بھی جس میں دور حاضر کے ایک سالک طریق کے آثار سفر یعنی تزکیۂ نفس کا عزم، اس کے نفس کی شرارتیں

---

[1] مکتوبات سلیمانی جلد اول ص ۲

اور باطن کے پیچ وخم اور پھر ان کی تادیب اور سلجھاؤ کی کوشش اور اس کے حسب صلاحیت طے منازل یا نتائج وثمرات کا عکس اتر آیا ہے جو اس جیسے ہزاروں تعلیم نو کے آفریدوں اور عقلیت کے ماروں کے لئے سرمایۂ ہدایت اور وجہ تقویت ایمان ہے[1]۔" اور درحقیقت یہ مجموعہ ہمیں اکابر صوفیہ کے مجموعہ مکاتیب کی یاد دلاتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی سید صاحب کے بعض منتشر و متفرق خطوط مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے اس سلسلہ میں خاص طور سے ماہنامہ نقوش کے مکاتیب نمبر اور ماہنامہ ریاض کراچی کا اپریل ۱۹۵۴ء کا شمارہ بھی قابل ذکر ہے جس میں "اِنَّہٗ من سلیمان" کے عنوان سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے سید صاحب کے مکتوب الیہ کی حیثیت سے ان کے تمام خطوط شائع کر دیئے۔

سید صاحب کے خطوط میں علمی ادبی، مذہبی، متصوفانہ اور سیاسی ہر نوعیت کا سرمایہ موجود ہے۔ غالب کے خطوط کے لئے جو رسمی باتیں کہی جاتی رہی ہیں کہ القاب و آداب کے لئے خط کی ٹکنیک میں انھوں نے جدت پیدا کی اُن کے خطوط ان کی سوانح کے لئے بے انتہا معاون ہیں، ان کے خطوط سے ان کے عہد کی خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ، جدت ٹکنیک کے علاوہ یہ باتیں سید صاحب کے خطوط پر بھی صادق آتی ہیں لیکن خطوط کے سلسلہ میں اہم تر بات یہ ہے کہ ان سے کاتب خط کی شخصیت کی مختلف جہتوں کا پتہ لگایا جائے، اس باب میں سید صاحب کے خطوط کافی روشنی عطا کرتے ہیں ان میں اس دور کے مختلف لوگوں سے تعلقات کی دھوپ چھاؤں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہے اسی طرح ان کے رفقا واحباب کی تلخی وشیرینی سے بھی واقف ہونے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی بعض دوسری شخصیات کے چہروں سے بھی پردہ اٹھتا ہے چنانچہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کے درمیان رنجش رہی ہے اس کا مستند اشارہ سید صاحب کے یہاں مل جاتا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی کو وہ لکھتے ہیں

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۱۲

"فریاد اکبری کے جواب میں "ترانۂ اقبال" آیا ہے اسے آئندہ ماہ چھاپتا ہوں۔"

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ "آج کل میر اکبر حسین اور ڈاکٹر اقبال کی پرائیویٹ چل رہی ہے دونوں کے خط یہاں آتے ہیں اور اپنے احوال سناتے ہیں۔" (۲۹ر مئی ۱۹۱۸ء)

الہلال کے زمانۂ ادارت میں جب سید صاحب مولانا ابوالکلام آزاد سے آزردہ خاطر ہوئے تو ۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتہ سے مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا کہ

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں، سونگھنے کے نہیں، مولانا آزاد وہی پھول ہیں، افسوس ہے کہ میں بھی دور سے دیکھ کر اس کو سونگھنے کے قابل سمجھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں علم، سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں۔ اختلافا لکم اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا لیکن میری حالت اسی شخص کی طرح ہوئی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے اعمالهم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمان مائً۔"

اس کے علاوہ تخئیل معارف کے روز اول سے تقسیم ہند تک اس رسالہ کی پوری داستان ان خطوط میں موجود ہے۔

ان چہل سالہ خطوط میں جہاں سید صاحب کی شخصیت کا ارتقا سامنے آتا ہے وہیں ان کے ایک مکتوب الیہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی پرپیچ و رنگارنگ شخصیت کے سفر کا بھی بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے ان کے دور الحاد میں کیا کیا رنگ طبیعت ابھرتا نکھرتا اور شوخ سے شوخ تر ہوتا رہا اور سید صاحب کی حکمت آمیز تدریجی کوششوں کا اس قلب ماہیت میں کیا حصہ ہے اس کے مرقعے بھی ان خطوط میں موجود ہیں۔ ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار مشکل ہے کہ مولانا دریابادی نے ان خطوط کو جمع و مرتب کرتے وقت اپنے ان حالات کو پردۂ راز میں رکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی اس سلسلہ میں ان کے حواشی بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ سید صاحب کس کس طرح عبدالماجد دریابادی کی دلدہی کرتے اور راہ راست پر لانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کرتے تھے اس کی ان خطوط سے

صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

> ”الناظر“ میں مل کی منطق (مضمون مصنفہ عبدالماجد دریابادی) پڑھی حیرت ہوئی کہ اسی کا اتنا شور ہے۔ ہمارے متاخرین کی منطق کے یہ پامال مباحث ہیں اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے درحقیقت منطق کو انتہائی حد تک ترقی دی ہے۔ عربی مواد سے کوئی سلجھا کر ایک کتاب لکھ دے تو لوگوں کو نظر آئے۔“
>
> ”نفسیات القرآن بشوق لکھئے لیکن داد دینے کے لئے، نہ کہ عیب جوئی کے لئے۔ قرآن میں نفسیات کا گر جو شاید وہی ہو جس کو آپ تحریک نفس انسانی بذریعہ خطابیات و دعوت مستلذات کہیں گے بہرحال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں تو خدارا جلد لکھئے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امت مرحومہ پر للہ رحم فرمائیے۔ جو خود ہی مر رہا ہوا ہے، الخ۔
>
> یوسف کا قصہ آپ قرآن سے لے کر کیوں (ڈرامہ) لکھیں توراۃ سے لکھئے کہ دو اور قومیں بھی آپ کی ممنون ہوں۔
>
> آپ نفسیات القرآن لکھئے، معارف نکلے تو وہ الہیات قرآن کا متحمل ہوگا۔“ (۲ر دسمبر ۱۹۱۵ء، مکتوب ۲۳)

اس کے علاوہ مولانا عبدالماجد کے نام مرتب کردہ خطوط میں ادبیت وعلمیت کی بھی بھرپور چاشنی موجود ہے۔ گذشتہ اوراق میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ تحقیق سے شغف کی وجہ سے سید صاحب علمی، ادبی، لسانی اور عروضی ہر اعتبار سے بلند پایہ کے حامل تھے۔ لسانی ولغوی مسئلہ ہو، عروضی یا اصلاح کلام کا معاملہ ہو یا حسن انشا کے جوہر دکھانے کا موقع ہو سید صاحب کی نظر دلنواز خطوط میں بھی اپنی استادی کا لوہا منوا کر رہتی ہے،

اسی طرح مولانا عبدالماجد فلسفہ پر مضامین اور کتابیں لکھتے اور ترجمہ کرتے وقت

اصطلاحات کے سلسلے میں ہمیشہ سید صاحب کی طرف رجوع کرتے اور سید صاحب اپنی روایتی تحقیقی شان کے ساتھ فوراً جواب دیتے تھے مثلاً

”لفظ روح الاجتماع خود مصر میں معترض علیہ ہے۔ میری اصلی رائے تو ہے تو ہے کہ ”نفسیات“ کی دو قسمیں قرار دی جائیں نفسیات ”فردیہ“ اور نفسیات ”جمیعتہ“ کے لئے۔ صحیح مفہوم کی تعبیر دوسرا لفظ کرتا ہے۔

”فلسفۂ اجتماع“ یا ”اسرار جماعات“ گو مقصود سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے تاہم فلسفۂ اجتماع۔ اسرار جماعات“ سے رواں تر ترکیب ہے بجائے ”اسرار“ اگر ”سر“ استعمال کیا جائے تو زیادہ روانی ہوگی مثلاً ”سراج الاجتماع“ سر الجماعات، سر الجمعیات۔“

”الفاظ مسئولہ کے لئے مصر میں ”تمثیل“ ہی کا لفظ ہے۔ ”فن تمثیل“ کے لئے نہایت کثرت سے مستعمل ہے اسی طرح ایکٹر کے لئے ممثل، اسٹیج کو مرسع اور منصہ کہتے ہیں۔ لفظ منصہ قدیم ادب میں بھی مستعمل ہے مثلاً منصۂ قدرت، منصۂ ظہور۔ اس لفظ کے حقیقی معنی وہ چبوترہ جس پر عروس رونما ہوتی ہے۔

”ٹریجڈی اور کامیڈی بہت اچھا ہے۔ بولئے مگر آج کل کی عربی میں ”روایہ خطیہ“ اور ”روایہ حزنیہ“ شاید دیکھا ہے۔“

یاد رہے کہ عبد الماجد دریابادی سید صاحب سے فلسفہ کی انگریزی کی متبادل عربی اصطلاحات کے سلسلہ میں یہ سوالات کیا کرتے تھے جن کے جواب کا نمونہ اوپر نقل ہوا ہے۔

مولانا دریابادی کے یہاں پہلی ولادت توام بچوں کی ہوئی اور ایک جاتا رہا اس پر سید صاحب نے انھیں لکھا کہ

”مبارک۔ باپ بننا مبارک آپ بڑی تیزی سے ایک کے بجائے دو خزانۂ غیب سے اٹھا کر چل دیئے۔ فرشتوں کو معلوم ہوا تو جرم غفلت سے بچنے کے لئے ایک واپس چھین کر لے گئے۔ عالم ملکوت کا ایک فلسفیہ

مستثنیات کا تجربہ ایک بلیغ حملہ ہے۔" (مکتوب)

ان خطوط میں بعض بڑی رازدارانہ باتیں بھی موجود ہیں۔ سید صاحب نکاح ثانی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن چونکہ عمر ابھی ۲۳۔۲۴ برس تھی اس لئے احباب و اعزہ کا اصرار تھا کہ نکاح کرلیں وہ بہت دن تک ٹالتے رہے لیکن مجبوراً گھر والوں کے اصرار پر بیماری میں ہی نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس معاملہ میں جو جو حالات و واقعات پیش آئے وہ ان کی پوری تفصیل مولانا کو لکھتے رہے

جب مولانا عبدالماجد دریابادی کا دور الحاد و تشکیک ختم ہوا اور ہندو تصوف (بھکتی) کے راستہ سے وہ اسلامی تصوف کے قریب آئے اور بالآخر مولانا تھانوی کے مرید ہوئے سید صاحب ندوی تھے وہ ان سلسلوں کے حامی نہیں تھے لیکن وہ بھی سایہ سلوک میں پناہ گزیں ہوئے ان کی عمر کے آخری پندرہ سال اسی شغل و شغف کی یادگار ہیں۔ اپنے عہد کی ان دو بلند پایہ شخصیتوں کے قلب و ذہن کی یہ غیر معمولی تبدیلی اور مدارج سلوک کے پورے سفر کی روداد بھی ان خطوط کی زینت ہے جو بڑی ہی دلچسپ، معلومات افزا اور حیرت آفریں ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ یہ خطوط ان دونوں حضرات کے نفسیاتی مطالعہ کے لئے انتہائی مفید اور کارآمد ہیں۔

فن مکتوب نگاری کے نقطۂ نظر سے "برید فرنگ" کی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس میں پہلی بات یہ ہے کہ خطوط کی تشہیر کا جذبہ اور امید کارفرما ہے جو اس فن کے لئے سم قاتل ہے۔ دوسرے، یہ ایک فرض کی ادائیگی اور ذمہ داری کی تکمیل کے طور پر لکھے گئے ہیں جن میں خطوط نگاری کا فطری پن مفقود ہے۔ تیسرے، صرف سیاسی نوعیت کے حامل ہونے کی وجہ سے یہ تنوع اور رنگارنگی سے محروم ہیں اور چوتھے یہ کہ ان کو خود مکتوب نگاری نے ہی ترتیب دیا ہے جو اس فن کی رہی سہی لذت بھی کھو دیتا ہے اس لئے ان خطوط میں بے تکلفی، بے ساختگی اور سید صاحب کی شخصیت کی تلاش کے بجائے اس عہد کی مخصوص سیاسی صورت حال اور اس میں سیاسی رہنماؤں کے فکر و عمل کی جھلکیاں یقیناً دیکھی جاسکتی ہیں۔

"برید فرنگ" میں بمبئی کی روانگی سے لے کر آٹھ ماہ بعد یورپ سے واپسی میں ہندوستانی جہاز پر بیٹھنے تک کے تمام واقعات اور تمام جزئیات درج ہیں اس لئے اس کو وفد خلافت کا سفرنامہ یورپ بھی کہا جا سکتا ہے اور یوں اس کا مسافر یورپ کے میدان جنگ میں وفد خلافت اور اہل یورپ کے درمیان سیاسی لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال بھی پیش کر دیتا ہے لیکن اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اس میں جہاں ایک جانب اپنی محکوم قوم پر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی قلعی کھلتی ہے وہیں دوسری طرف وہ روح بھی تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے جو اس وقت مشرق وسطی اور برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن تھی۔

یورپ کے دوران قیام وہ جب جب، جہاں جہاں اور جتنے عرصہ کے لئے گئے اس کی پوری پوری تفصیل ان خطوط میں موجود ہے یہاں تک کہ یورپ کے مختلف ممالک کے لفافوں پر جو تصاویر بنی ہوئی ہوتی تھیں یا جن عمارتوں کے نقشے ہوتے تھے ان کا خصوصی انتخاب کر کے سید صاحب اس کے متعلق تمام معلومات اپنے قارئین کو بھی بہم پہنچاتے تھے۔

اسی طرح ان خطوط میں ان تمام مقامات کی تفصیلات درج کی ہیں جن کو دیکھنے کا وفد کو موقع ملا اس سلسلہ میں انڈیا آفس لائبریری دیکھ کر وہاں کی مطبوعات و مخطوطات کی فہرستیں نقل کر کے ایک مضمون کی شکل میں معارف کے لئے بھیجیں۔ اڈنبرا یونیورسٹی اور کیمبرج کی سیر کی اور دوسرے ممتاز کتب خانوں کے نظارہ کے تاثرات لکھ کر بھیجتے رہے جن اکابرین اسلام اور دوسرے مفکرین و مستشرقین سے ملاقات ہوئی اس کا تذکرہ اور تبصرہ بھی ان خطوط میں موجود ہے۔ چونکہ وفد خلافت دنیائے اسلام کے لئے باعث کشش تھا اس لئے تمام عالم اسلام کے وفود اور نمائندوں سے اس وفد کی ملاقاتیں رہیں اور بہت کچھ سننے، سمجھنے اور کہنے کا موقع ملا دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات کا کافی علم ہوا مسلمانوں کے علاوہ جن دیگر اکابر سے ملاقات ہوئی ان مستشرقین میں پروفیسر براؤن کی شخصیت سید صاحب کو زیادہ جاذب توجہ نظر آئی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "پروفیسر براؤن نہایت شریف آدمی ہیں روز بروز ان کی شرافت کا سکہ ہم پر بیٹھتا جاتا ہے۔ ... انھوں نے ملاقات کے لئے باصرار بلایا ہے۔ مسلمانوں کی قسمت پر متاسف ہیں اور اپنے ملک کے ارباب

سیاست سے سخت آزردہ ہیں۔" ص ۲۶

ہندوستان کو آزادی کا واضح اور پہلا پیغام سید صاحب نے ہی یورپ سے بھیجا تھا۔ "حیات" کے ضمن میں اس پر گفتگو کی جا چکی ہے یہ پیغام بھیجتے ہوئے سید صاحب نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو ایک خط میں لکھا کہ

> "اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیئے۔ اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے ۔۔۔۔ اب ہمیں عزم کرنا ہے کہ ہم اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک خود اپنے ملک میں آزاد نہ ہوں گے۔" (ص ۱۷۸)

یہی بات مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی لکھی کہ "ہمارے اور آپ کے علت و معلول کے تعین میں جھگڑا ہے آپ کہتے ہیں کہ پہلے شیکسپیر چاہیئے، میں کہتا ہوں کہ پہلے آزاد ہندوستان۔"

مولانا مسعود عالم ندوی نے جو مجموعۂ مکاتیب ترتیب دیا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ سید صاحب نے ندوہ میں اپنی معتمدی کے دوران ندوہ سے اپنی نگرانی میں ایک عربی رسالہ "الضیاء" جاری کیا تھا اس کے مدیر مشہور عربی اہل قلم مولانا مسعود عالم ندوی مقرر کئے گئے۔ سید صاحب کا مستقلاً قیام اعظم گڑھ تھا اس لئے رسالہ کے سلسلہ میں ساری باتیں مراسلت کے ذریعہ ہی انجام پاتی تھیں۔ مولانا مسعود عالم ندوہ میں عربی ادب کے استاد اور جماعت اسلامی کے شدید حامی تھے سید صاحب کی معتمدی کے دوران دو مرتبہ ندوہ میں اسٹرائک بھی ہوئی تھی، پہلی بار ۱۹۲۷ء جس پر سید صاحب نے استعفیٰ بھی دے دیا تھا لیکن حالات اسی وقت ٹھیک ہوئے جب سید صاحب کو دوبارہ اپنے عہدہ پر واپس بلا لیا گیا۔ دوسری بار کی اسٹرائک میں انتظامیہ کے جذباتی اور زود رنج طبقہ کی ضد نے نمایاں حصہ لیا، سید صاحب نے اس میں بھی امتیازی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ ماہنامہ الضیاء جن صحافتی، علمی، اقتصادی اور سیاسی مشکلات و مسائل سے

دو چار ہو کر گرتا اور سنبھلتا رہا اس کو ایک بلند معیار عطا کرنے، بین الاقوامی شہرت و رسائی حاصل کرانے اور اس کے ذریعہ اعلیٰ درجے کے اہل قلم پیدا کرنے میں اس کے نگراں کے برسہا برس کے ادارتی تجربات اور نگرانی کو بڑا دخل ہے، ان تمام حالات کی پوری تفصیل خود سید صاحب کے قلم سے اس مجموعۂ مکاتیب کے حصہ میں آئی ہے، بلا تخصیص صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

> ”بحمد اللہ ندوہ کی مالی و تعلیمی و مذہبی وظاہری حالت قابلِ اطمینان ہو رہی ہے افسوس کہ مولوی...... صاحب مستقلاً قیام نہیں کرتے ان کی آمد و رفت سے خلل پڑتا ہے مگر وہ بھی ضروری کام کر رہے ہیں۔“

> ”میں بھی ایک دار التکمیل کے خاکہ پر غور کر رہا ہوں جو استاد مرحوم کا آخری خیال تھا، اپنا بھی آخری خیال یہی تصور ہے۔ سرمایہ کی طرف سے بحمد اللہ اطمینان ہے البتہ ایک کامل العلوم محدث وفقیہ کا جویا ہوں دیکھیے کون ملتا ہے۔“

”تذکرہ سلیمان“ میں سالک کی اصلاح حال سے متعلق مرشد سلیمان کے ۱۰۲ خطوط درج ہیں اور تقریباً اتنے ہی خطوط سالک کے تحریر کئے ہوئے ہیں جن کے جواب کے طور پر مرشد نے مذکورہ خطوط لکھے۔

خطوط کے جامع کو ترتیب مکاتیب میں اپنی پسندیدہ ٹکنیک اختیار کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے لہذا اس مجموعہ میں براہِ راست اور مسلسل خط ہونے کے بجائے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق سالک غلام محمد (جامع) نے ان خطوط کو ٹکڑوں میں تقسیم کرلیا پہلے اپنے خط کا ایک جزو ہے اس کے بعد شیخ نے اس کا جو جواب عنایت فرمایا اسے درج کردیا ہے اسی طرح گویا سوال و جواب والی کیفیت ملتی ہے مثلاً ایک خط کا آخری حصہ درج ذیل ہے۔

غ۔ (غلام محمد) ذکر سے اصل مقصود قلب کو مشغول رکھنا ہے یا محض زبان کو یا دونوں کو۔

س۔ (سید سلیمان) ذکر سے اصل مقصود تو مذکور یعنی "اللہ" استحضار ہے۔ یہ نہ ہو تو "ذکر" کا، یہ بھی نہ ہو تو ذاکر یعنی "قلب" کا۔ جہر میں یہ فائدہ ہے کہ اگر تینوں نہ ہوں تو بھی ذکر لسانی کے برکات تو حاصل ہوں گے۔

غ۔ بحمداللہ معمولات پر پابند اور دعا کا محتاج ہوں والسلام

س۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ مزید استقامت بخشیں۔ فقیر ہیچمداں

(سید سلیمان)

یہ طریقہ کار اختیار کرنے سے خط کی روانی اور تسلسل میں بڑا خلل واقع ہوا ہے۔ خط کے ٹکڑے کرنے کے بجائے اس کا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ سید صاحب کے ہر جوابی خط سے قبل غلام محمد صاحب اپنا خط درج کر دیتے پوری بات اس سے بھی واضح ہو جاتی، مقصد ترتیب بھی پورا ہو جاتا اور خط کی لذت اور بے ساختگی اور ربط و تسلسل میں بھی فرق نہ آتا۔ بہرحال حضرت تھانوی کے عطائے خلافت کے بعد فانی فی اللہ کی حیثیت سے سید صاحب کی جو شخصیت سامنے آچکی ہے وہ ان خطوط میں بھی موجزن ہے۔ یہاں بھی ان کی تواضع، صبر و توکل و تفویض، قناعت و یقین اور رضا و تسلیم اپنا پورا رنگ دکھا رہے ہیں اور حواشی و قوسین کی وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سالک پر انھیں صفات عالیہ کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے اور ایک مرشد کامل جدید تعلیم یافتہ سالک کے لئے تربیت کے وہ کون سے طریقے اختیار کرتا ہے کہ وہ فنا فی الشیخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک خط سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جس سے مرشد کامل کی فکری جہت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غلام محمد صاحب کا سوال تھا ذکر سری کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ محض اس مصلحت سے کہ ذکر جہری میں کم از کم زبان مشغول رہتی ہے، جہری ذکر کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔

جواب۔ ذکر جہری اور سری دونوں مشروع ہیں۔ اب جس کو جس سے مناسبت ہو۔ جہری کے معنی یہ ہیں کہ جس کی آواز اپنے کانوں کو سنائی دے جس کو قرآن پاک میں دون الجهر

مِنَ الْقَوْلِ کہا گیا ہے۔ اس کی تفسیر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ جہراً اور حضرت ابوبکرؓ سراً تہجد پڑھتے تھے تو حضرت عمرؓ کو فرمایا گیا کہ ذرا آہستہ پڑھو اور حضرت ابوبکرؓ کو کہا گیا کہ ذرا زور سے پڑھو" (ص ۴۰۲ تذکرہ سلیمانی)

اس راہ میں سید صاحب ہر ہر قدم پر اپنے شیخ تھانوی کے نقش قدم پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے لئے یہ وہ منزل تھی جہاں سے تمام حال اور مقامات سے گذر کر بالآخر فنائیت تک پہنچے، اس کا پورا عکس ان خطوط میں موجود و محفوظ ہے اس پر مزید گفتگو ضروری نہیں معلوم ہوتی۔

یہ مجموعۂ مکاتیب محض چند اوراد و وظائف اور متصوفانہ مسائل کی عقدہ کشائی کے تذکرہ تک محدود نہیں ہے بلکہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمان جس کشمکش کا شکار تھے حیران و ششدر اور حرمان نصیب بنے ہوئے تھے ایسے وقت میں غلام محمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں اپنا سیاسی مسلک واضح کر کے سالک کی رہبری و رہنمائی کی۔

> ''میں نے سیاسیات کے خارزار سے مدت ہوئی کہ اپنا دامن چھڑا لیا اب جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کی دینی و علمی و تعلیمی خدمات کی بجا آوری کا شوق ہے۔ ان کے علاوہ دیگر امور سے قطعاً عزلت نشیں اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی دعا دل سے کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں جذبات کے جوش میں بہنے سے کام نہ چلے گا۔
>
> میں ان تمام نزاعات (اختلافات لیگ و کانگریس وغیرہ) سے عملاً کنارہ کش ہوں اور دل میں مسلمانوں کی خیر و فلاح کے خیال کے سوا کچھ اور نہیں رکھتا اور اسی کا داعی ہوں اور اپنے اختیار کی حد تک اسی کا ساعی۔ مجھے سیاسیات کا رہبر نہ سمجھئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس مضمون سے سمجھئے جو مولانا عبدالباری صاحب کا معارف میں شائع ہوا ہے۔
>
> خدا کرے کہ آپ دین کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر موجودہ شورشوں

کی طرف آنچ نہ کریں جو ادھر سے تغافل ہو جائے۔ دین ثابت و قائم چیز ہے اور سیاست متبدل و متغیر۔ ہنگامی چیزوں کو اہمیت نہ دیں اور امور دوامی مصروف رہیں آپ کے لئے صدق دل سے دعا کرتا ہوں والسلام

ہیچ مدان سلیمان" (ص ۵۹۸)

یہی سیاسی بصیرت حسب موقع دوسرے خطوط میں بھی جلوہ گر ہے۔ تقسیم ملک کے بعد مسلمان مایوس ہو کر اور گھبرا کر پاکستان کو منتقل ہو رہے تھے سید صاحب عزم کے پختہ اور ثابت قدم رہنے کے عادی و داعی تھے۔ ریاست حیدرآباد ختم ہو جانے کے بعد غلام محمد صاحب (جو ریاست میں مستقل ملازم تھے اور اب ملازمت کی امید معدوم نظر آتی تھی) نے سید صاحب سے بار بار ترک وطن کا ارادہ مختلف پیرایوں میں ظاہر کیا اور اس کے لئے اجازت چاہی سید صاحب ملازمت چھوڑ کر ہجرت کرنے کی طرف سے مطمئن نہ تھے چنانچہ بار بار وہ ان کو تسلی استقامت اور سمجھداری کی تلقین کرتے رہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے وقت میں سید صاحب کی فکری نہج کس سمت جاری و ساری تھی ان خطوط کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"ایک بات آپ سمجھ لیں یلی ہوئی روزی بلا عذر شرعی کسی حال میں اس وقت تک چھوڑنا نہیں چاہئے جب تک دوسری صورت متعین نہ ہو جائے۔ ممکن ہے موجودہ اضطراب آپ کے گذشتہ نظریہ کی ناکامی کا باعث ہو۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔ ع سخت زمین ہے آسمان دور ہے۔ حرمین کی ہجرت بے شبہ موجب برکات ہے۔ اگر تکالیف سفر اور روزی کی تنگی اور توکل کی وجہ سے دل تنگی کا اندیشہ نہ ہو تو مبارک مگر وہاں کا ماحول بھی قلب کے اطمینان کا باعث نہ ہوگا۔ اگر قلب کا لگاؤ ماحول سے، خواہ وہ سیاسی ہو یا کسی اور نوع کا ہو قائم رہا ـــــ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

اب اپنے نفس کے حالات پر غور کیجئے۔"

"ہجرت وہ شخص کرے جو سفر کی ہر تکلیف کو بآسانی انگیز کر سکے اور اسی میں راحت سمجھے جو راضی بہ رضا ہو اور اپنی تجویز کو دخل نہ دے، وہ انشاء اللہ پریشان خاطر نہ ہوگا۔"

"میری رائے میں صبر و شکر کے ساتھ اپنے مقام پر قیام مفید ہے اور یہ دعا پڑھی جائے۔ ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔"

"جمعہ کے روز ۲۰ منٹ والی خالص دینی تقریر (اب بھی) جاری رکھئے، سیاسیات سے کامل پرہیز۔"

"دعا تو بے شبہ ہے۔ مگر لگی ہوئی روزی سے اعراض کے خیال سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہی کریں جس میں آپ کے لئے خیر ہو۔"

متفرقات

تحقیق، سوانح، صحافت، مکتوب نگاری، تبصرہ نگاری، شاعری اور لسانیات جیسے مستقل ادبی موضوعات کے علاوہ ہمارے نقطۂ نظر سے سید صاحب کی وہ دوسری کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں جو ان کی محنت و دلچسپی اور دقتِ نظر کے سبب ان کے سرمائے میں اضافہ کا باعث بنی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کے مقالات پر نظر جاتی ہے جن کی تعداد تقریباً تین سو ہے۔ ابتدائی چند مضامین سے قطع نظر سید صاحب کے تمام مقالات اپنے موضوع پر داد تحقیق و تحسین کے مستحق قرار پائے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق ان کا بیشتر سرمایہ نقوشِ سلیمانی کی زینت ہے۔ ۱۹۶۶ء سے دار المصنفین سے سید صاحب کے بقیہ مقالات کو بھی مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اسی سال سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے تاریخی مقالات کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں شاہ معین الدین احمد نے علمی و ادبی مقالات کے عنوان سے دوسرا مجموعہ اور مذہبی مقالات پر مشتمل ۱۹۷۱ء میں تیسرا مجموعہ شائع کیا اس کے بعد یہ سلسلہ اب تک تعطل کا شکار ہے۔ یہ مقالات بھی مستقل بحث کا موضوع ہیں لیکن فی الحال ہمارے دائرہ کار سے باہر۔ اس کے باوجود اس بات کا اعتراف ناگزیر ہے کہ ان ہمہ جہت موضوعات پر مقالات لکھ کر اردو زبان کے علمی سرمائے میں سید صاحب نے غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔

سید صاحب کی دوسری متفرق ادبی نشانیوں میں ان کا سفر نامۂ ”افغانستان“ بھی قابلِ ذکر ہے ”سیر افغانستان“ کے عنوان سے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ

نفیس اکاڈمی حیدرآباد دکن نے مئی ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ سید صاحب کے سفرِ افغانستان کا تفصیلی بیان مناسب موقع پر آچکا ہے اور سفرنامہ سے اقتباسات اور حوالے بھی پیش کئے جاچکے ہیں۔

یہ سفرنامہ سید صاحب کی مکمل شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ موصوف کو شروع سے آخر تک ندوہ سے محبت رہی، اس کا اصلاح شدہ نصاب وہ تمام عربی مدارس میں نافذ کرنے کے خواہاں رہے اور اس نفاذ سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کی ہر جگہ توصیف و تشہیر کرتے رہے تھے۔ چنانچہ افغانستان میں نادر شاہ اور ان کے وزیر تعلیم کے سامنے بھی موصوف نے یہ دونوں باتیں پیش کرکے شاہ کی مجوزہ یونیورسٹی کو ندوہ کے طرز پر بنانے کی سفارش بھی کی۔

اس سفرنامہ میں تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کے مشاہدات و تاثرات کا بیان بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تحقیقی ذہن، جزئیات پر نظر اور نکتہ رسی کی مثالیں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں۔ راستے میں کس کس طرح کن کن گاڑیوں سے سفر کرنے کا موقع ملا، وہاں کی عمارات کا حال اور پوری تحقیق و تفتیش کہ فلاں فلاں ممتاز عمارتیں یوروپین انجینروں کی نگرانی میں تیار ہوئی ہیں، بحری ڈاک، عجائب خانہ، مزارات، اہم شہروں کے مشاہدے اور اسکولوں کے معائنہ کے تاثرات، مہمان خانہ، اس کے قریب شاہی باغ، پل، جامع مسجد، نماز جمعہ، غرض سب کی تفصیلات پیش کی ہیں کن کن لوگوں سے کب کب ملاقاتیں رہیں، اس کا طریقہ کیا تھا اور کیا نتائج نکلے، ادبی و ثقافتی پروگراموں میں شرکت کی تفصیل، وہاں کے آداب معاشرت اور اس کے لوازمات کا پورا تذکرہ بھی اس سفرنامہ میں موجود ہے۔

سید صاحب کے دیگر رفقا، علامہ اقبال اور سر راس مسعود بھی سفرنامہ میں اتنے ہی سرگرم نظر آتے ہیں جتنے خود صاحب سفرنامہ، اور اس طرح یہ تنہا سید صاحب کا نہیں بلکہ تینوں حضرات کا مشترک سفرنامہ بن جاتا ہے۔

"ہم لوگ حکیم سنائی کے مزار پر گئے۔۔۔۔۔ حکیم سنائی کی جلالت شاعری

سے کون واقف نہیں، ہم سب اس سے متاثر تھے مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا وہ سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔"[1]

سیرۃ النبی کی تالیف کا منصوبہ علامہ شبلی نے بنایا تھا۔ اس کی اولین دو جلدوں میں دو تہائی سے زیادہ محنت اور علمی کام سید صاحب نے کیا ہے سیرت کے بنیادی مآخذ یعنی قرآن، حدیث، رجال وغیرہ سے مواد اکٹھے کر کے ترتیب دینے کے علاوہ شبلی کے اصرار پر سید صاحب نے اس پر نظر ثانی بھی خود ہی کی[2]۔ علامہ شبلی نے جلد اول کے بڑے حصے کو اپنی زبان اور اسلوب کا جامہ پہنایا۔ اس تالیف میں چار چاند لگائے۔ ابھی بہت کچھ کام باقی تھا کہ شبلی کی وفات ہو گئی۔ سید صاحب نے دار المصنفین کے قیام اور معارف پریس لگنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں اسے حسب منشا مکمل کر کے علامہ شبلی ہی کے نام سے شائع کیا اور سعادت مندی کا یہ حال تھا کہ اس وقت کے نئے اضافوں کو قوسین میں کر دیا تاکہ استاد کے نام و کلام میں خلط ملط کا امکان نہ رہے۔

دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں بھی یہ ہلالین بر قرار رہے لیکن چوتھے ایڈیشن میں کافی اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی وہ کتابیں جو شبلی کو دستیاب نہیں تھیں لیکن ان کی خواہش تھی کہ ان سے بھی استفادہ کیا جاتا۔ وہ اب طبع ہو کر عام ہو چکی تھیں۔ لہٰذا سید صاحب نے شبلی کی ان خواہشوں کی تکمیل کے طور پر اور اپنے وسعت علمی کا ثبوت دیتے ہوئے طبع چہارم میں وہ تمام اضافے کر دیئے اور اب ہلالین نکال دیئے گئے تاکہ عبارت کی روانی میں ناگزیر طور پر پڑنے والا خلل واقع نہ ہو سکے۔ اور دیباچہ میں ان تمام وجوہ کا تذکرہ کر دیا۔ کتاب کی اس نئی ترتیب کے لئے انھوں نے جن اصولوں کو اختیار کیا انھیں بھی مختصراً بیان کر دیا۔ تحقیق و تدوین کے نقطۂ نظر سے یہ بیان خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

---

[1] سیر افغانستان ص ۱۲۹۔ [2] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نومبر ۱۹۸۴ء مضمون "سیرۃ النبی کی اولین دو جلدوں کا مؤلف۔"

"اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا وہ یہ ہیں۔

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو از سرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیح بیان، دفع شبہ و رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیے گئے ہیں

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب و فصول کے حوالے بھی دے دیئے گئے ہیں تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھا جا سکے۔

۶۔ طبعِ اول کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں، ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا اور بعد کا اس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو اس کو بڑھایا گیا ہے۔

۸۔ غزوۂ بدر کی روایتوں میں تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمداں کے خطا کار قلم سے حضرت کعب بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا جس پر مجھے شرمندگی ہے اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برات کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ (طبع اول ص ۲۵۵ سطر ۹ تا ۱۲ اور طبع مابعد ص ۲۲۳ سطر ۴ تا ۱۷) سے ان سطور کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی[1]

اس اعتبار سے سیرۃ النبی جلد اول طبع چہارم (۱۳۶۴ھ اور اس کا یہ دیباچہ سید صاحب کی علمی و ادبی اور تحقیقی بصیرت کا بھرپور ترجمان ہے۔

سید صاحب نے ندوہ میں اپنی معلمی کے ابتدائی دور یعنی ۱۹۰۸ء میں عربی کے مبتدیوں کے لئے ایک آسان عربی کتاب "دروس الادب" تیار کر کے دو حصوں میں شائع کی تھی، یہ بہت مقبول ہوئی اور ندوہ کے علاوہ بہت سے دینی مدارس اور اسکولوں کے عربی نصاب میں داخل کی گئی۔

اس میں مشق کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، پہلے عربی الفاظ، پھر خفیف تراکیب اور بتدریج طویل و قواعدی تراکیب درج کی گئی ہیں اور ہر سبق کے آخر میں عربی ترجمہ کے لئے اردو ترجمے دے دیئے گئے ہیں۔ اس میں حکایتوں کے ذریعہ ترجمہ کا طریقہ، مشہور جملوں اور فقروں کے ترجمے، روزانہ کے معمولات کے فقرے، قرآن کی سورتوں اور قواعد کے اعتبار سے سہل آیتوں کی مشق اور آخر میں ۲۴ جدید عربی کے عام مستعمل الفاظ و معنی درج کئے گئے ہیں اور بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ استاد کی مدد کے بغیر تو نہیں لیکن اس کے معمولی اشاروں کے ساتھ عربی کے مبتدیوں کے لئے یہ کتاب آج بھی مفید اور اہم ہے۔

مستقل تصانیف اور مقالہ نگاری وغیرہ سے قطع نظر سید صاحب نے ایک اور ناقابلِ فراموش کام کیا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ "حیاتِ شبلی" لکھ کر اور ساڑھے تین ہزار صفحات کی سات جلدوں پر مشتمل سیرت مکمل کر کے استاد کی وصیت کی تکمیل کی بلکہ علامہ شبلی کے مقالات و خطبات اور تصانیف کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرہ کو اپنی محنت و کوشش سے مرتب و تیار کر کے کتابی صورت میں پیش کیا۔

---

[1] سیرۃ النبی جلد ا طبع چہارم ص ۸

اس سلسلہ میں اُن کا سب سے پہلا کام شعر العجم جلد پنجم کی ترتیب و اشاعت ہے جسے شبلی نے التوا میں ڈال دیا تھا اور سیرت میں مصروف ہو گئے تھے، ۱۹۱۸ء میں سید صاحب نے اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ مسودہ شبلی کی نظرِ ثانی کا محتاج تھا۔ لیکن وقت نے انھیں موقع اور اجل نے مہلت نہ دی اس لئے خام حالت میں پڑا رہا۔ سید صاحب نے اس کتاب کو بغیر کسی تغیر و تبدل کے اس کی اصلی حالت میں شائع کر دیا۔ دیباچہ میں دوسری باتوں کی وضاحت کے علاوہ چوتھے حصّے کے بعض اجزاء کا خلاصہ بھی پیش کر دیا کہ دونوں حصّے باہم مربوط ہو جائیں۔ شبلی کے پیش کردہ اصل متن کی اشاعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سید صاحب نے دیباچہ میں یہ بھی وضاحت کی کہ

> ان اوراق میں بعض جگہ تکرار اور بعض جگہ تشنگی محسوس ہوئی تاہم یہی مناسب سمجھا کہ ان موتیوں کی لڑی میں پوت نہ ملایا جائے۔ چنانچہ فصول و ابواب کے علاوہ اصل متن میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی ہے۔
>
> مولانا اپنی ہر تصنیف میں بار بار کی حک و اصلاح، تکرار الفاظ اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول دہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔[۱]

۱۹۱۶ء میں شبلی کے خطوط کو "مکاتیب شبلی" کے نام سے ضروری حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

اس کے علاوہ شبلی کے تمام منتشر مقالات کو یکجا مرتب کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن سید صاحب نے بڑی لگن کے ساتھ ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۰ء تک شبلی کے ایک ایک مقالہ کو موضوعی درجہ بندی کے ساتھ ترتیب دے کر نو جلدوں میں شائع کیا۔ ان مجموعوں کے مضامین و مقالات کی ترتیب بھی مرتب کی شائستگی و ذوق پر دال ہے۔ اس

---

[۱] شعر العجم جلد پنجم ص ۶

لئے حواشی کے طریقۂ ترتیب سے گریز کرتے ہوئے ان مقالات کو سادگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ البتہ جلد اول (مذہبی) دوم (ادبی)، پنجم (تاریخی) اور ہشتم (قومی و اخباری مضامین‘ ان جلدوں کے شروع میں سید صاحب نے دیباچے لکھے ہیں۔ موخرالذکر کا دیباچہ ذرا طویل ہے۔ باقی سب مختصر اور رسمی ہیں۔ ان سے مرتب کے ذوقِ ترتیب کے علاوہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان مضامین و مقالات کے حصول کے وقت سے اشاعت کی منزل تک مرتب کو اتنی محنت اور دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ اسے ایک سعادت مند شاگرد ہی ہنسی خوشی برداشت کر سکتا ہے۔ ان مقالات کے مجموعوں میں ایک خاص سلیقہ جھلکتا ہے۔ ہر جلد میں مقالات کی ترتیب میں ایک ارتقاً اور منطقی ربط پیدا کرنے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔

”انتخاباتِ شبلی“ کے عنوان سے بھی پروفیسر رشید احمد صدیقی کی فرمائش پر سید صاحب نے ایک کتاب تیار کی۔ تنقیدی اعتبار سے یہ کتاب سید صاحب کے حسنِ نظر کی مظہر ہے۔ اس میں شعر العجم (خصوصاً جلد چہارم) اور ”موازنۂ انیس و دبیر“ سے علامہ شبلی کے بیشتر تنقیدی خیالات اور اصولوں کا انتخاب کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ”شاعری کی حقیقت“ کے تحت شاعری کی تعریف، محاکات تخیل، تشبیہ، استعارہ، الفاظ اور حسن الفاظ، جملوں کے اجزا کی ترکیب، شعر کی تاثیر و عظمت وغیرہ کی تمام تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے علیحدہ علیحدہ عنوانات اور ان کے ذیلی مباحث، میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ کے تحت فصاحت، بندش کی سستی اور ناہمواری، تعقید، تشبیہات و استعارات مضمون بندی و خیال آفرینی اور بلاغت اور آخر میں ”میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے“ کا عنوان قائم کر کے بیس صفحات میں اس کے مباحث نقل کئے ہیں۔ غرض اس کتاب میں سید صاحب نے شبلی کے تنقید کے بہت سے بنیادی اصولوں اور کاوشوں کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس کتاب کی ”تقریب“ میں سید صاحب نے اپنے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس انتخاب میں ایک خاص پہلو یہ پیش نظر رہا ہے کہ کلام کے حسن و خوبی اور خاص طور سے شعر کی تنقید اور اس کے محاسن و معائب کے اصول کو اُن کی ان دو[۲] کتابوں سے لے کر اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ کسی کلام کے عام محاسن اور خاص طور سے شاعری کی حقیقت اور اس کے جانچنے کے اصول و معیار طلبہ کے ذہن نشین ہو جائیں۔

(انتخابات شبلی تقریب، ص ب)

کتابیات

آب حیات	محمد حسین آزاد	عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ	سنہ ۱۹۶۷ء
ابوالکلام آزاد۔ احوال و آثار	مرتبہ مسعود الحسن عثمانی	مولانا ابوالکلام آزاد میموریل اکیڈمی، لکھنؤ	سنہ ۱۹۷۷ء
ابوالکلام آزاد فکر و فن	ملک زادہ منظور احمد	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۹ء
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقار	الطاف فاطمہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی۔	سنہ ۱۹۷۴ء
اردو میں سوانح نگاری	سید شاہ علی	گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی	سنہ ۱۹۶۱ء
اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔	محمود الٰہی	مکتبۂ جامعہ دہلی	سنہ ۱۹۷۳ء
ارض القرآن جلد اوّل	سید سلیمان ندوی	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۵۵ء
ارض القرآن جلد دوم	سید سلیمان ندوی	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۵۶ء
ارمغان سلیمان	سید سلیمان ندوی مرتبہ غلام محمد ایم اے	ادارۂ مجلس علمی، کراچی	سنہ ۱۹۶۰ء
اقبال نامہ	مرتبہ شیخ عطاء اللہ	لاہور	
الغزالی	شبلی نعمانی	نامی پریس کانپور	سنہ ۱۹۰۱ء
الفاروق	شبلی نعمانی	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۵۶ء
انتخاباتِ شبلی	مرتبہ سید سلیمان ندوی	〃	سنہ ۱۹۴۰ء
برید فرنگ	سید سلیمان ندوی	مکتبۂ الشرق کراچی	سنہ ۱۹۵۲ء

پرانے چراغ حصہ اوّل	سید ابوالحسن علی ندوی	مکتبہ فردوس لکھنؤ	سنہ ۱۹۸۰ء
تاریخ ادب اردو جلد اوّل	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	سنہ ۱۹۷۷ء
تحقیق وتدوین	مرتبہ سید محمد ہاشم	مکتبۂ جامعہ دہلی	سنہ ۱۹۷۸ء
تذکرۂ سلیمان	غلام محمد	ادارہ مجلس علمی کراچی	سنہ ۱۹۵۹ء
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔	سنہ ۱۹۵۵ء
حقائق	گیان چند جین	نیشنل آرٹ پریس الہ آباد	سنہ ۱۹۷۸ء
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۷۳ء
حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	" "	سنہ ۱۹۷۹ء
حیات مالک	سید سلیمان ندوی	" "	سنہ ۱۹۱۷ء
خطبات مدارس	سید سلیمان ندوی	مکتبۃ الشرق کراچی	سنہ ۱۹۵۴ء
خطوط شبلی بنام زہرا بیگم فیضی، عطیہ بیگم فیضی۔	مرتبہ محمد امین زبیری	ظل السلطان بک ایجنسی، بھوپال	سنہ ۱۹۴۶ء
خلافتِ اسلامیہ اور دنیائے اسلام	سید سلیمان ندوی	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۲۳ء
خیام	سید سلیمان ندوی	" "	سنہ ۱۹۷۹ء
داستان زبان اردو	شوکت سبزواری	اردو مرکز اردو بازار دہلی	سنہ ۱۹۶۱ء
دروس الادب	السید سلیمان الندوی	مطبعۃ معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۷۷ء
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	اردو مرکز لاہور	سنہ ۱۹۵۲ء
دید وشنید	رئیس احمد جعفری	انجمن پریس لارنس روڈ، کراچی	سنہ ۱۹۴۸ء

دیوان درد	مرتبہ ظہیر احمد صدیقی	مکتبۂ شاہراہ، دہلی	؁۱۹۷۱ء
ذکر شبلی	محمد امین زبیری	کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ۔	؁۱۹۴۶ء
رحمت عالم	سید سلیمان ندوی	مکتبۂ الشرق، کراچی	؁۱۹۵۴ء
سات تحریریں	عبدالقوی دسنوی	اردو پبلشر تلک مارگ، لکھنؤ	؁۱۹۷۵ء
سفرنامۂ روم	شبلی نعمانی	محمڈن پریس علیگڑھ	
سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقار	سید عبداللہ	چمن بک ڈپو، دہلی	؁۱۹۶۰ء
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ	؁۱۹۷۰ء
سرسید تاریخی و سیاسی آئینے میں	شان محمد	انوار بک ڈپو، علیگڑھ	؁۱۹۶۷ء
سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی مترجمہ اصغر عباس	منسٹری آف براڈ کاسٹنگ پبلیکیشنز ڈویزن، دہلی	؁۱۹۷۱ء
سیر افغانستان	سید سلیمان ندوی	نفیس اکیڈمی، حیدرآباد	؁۱۹۴۵ء
سیرت عائشہ	سید سلیمان ندوی	مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ	؁۱۹۷۹ء
سیرۃ النبی جلد اول تا ہفتم	مرتبہ سید سلیمان ندوی	〃	
سیرۃ النبی جلد اول	مرتبہ سید سلیمان ندوی	〃	؁۱۳۶۴ھ
سیرۃ النعمان	شبلی نعمانی	مفید عام پریس آگرہ	؁۱۸۹۴ء
شبلی بحیثیت مورخ	اختر وقار عظیم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی۔	؁۱۹۷۹ء

شبلی کی حیات معاشقہ	وحید قریشی	مکتبۂ جدید لاہور	سنہ ۱۹۵۰ء
شبلی نامہ	محمد اکرام	لاہور	سنہ ۱۹۵۷ء
شعر العجم جلد اول تا چہارم	شبلی نعمانی	دار المصنفین اعظم گڑھ	
شعر العجم جلد پنجم	مرتبہ سید سلیمان ندوی	〃 〃	سنہ ۱۹۱۸ء
عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد	سنہ ۱۹۳۰ء
عربوں کی جہاز رانی	سید سلیمان ندوی	اسلامی ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی	سنہ ۱۹۶۶ء
علیگڑھ تحریک	نسیم قریشی	علیگڑھ مسلم یونیورسٹی	سنہ ۱۹۶۰ء
غبار خاطر	ابو الکلام آزاد	آزاد اکیڈمی دہلی	سنہ ۱۹۸۰ء
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	کتابی دنیا دہلی	سنہ ۱۹۴۷ء
لغات جدیدہ	مرتبہ سید سلیمان ندوی	دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	سنہ ۱۹۱۲ء
مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	محمد عمران خاں ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۴۶ء
مضامین سلیمان	مرتبہ ابو سلمیٰ شفیع احمد بہاری	مکتبۂ علم و حکمت بہار شریف	سنہ ۱۹۵۰ء
مقالات سلیمان حصہ اول	مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۶۶ء
مقالات سلیمان حصہ دوم	مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی	〃	سنہ ۱۹۶۸ء
مقالات سلیمان حصہ سوم	〃 〃	〃	سنہ ۱۹۷۱ء
مقالات شبلی جلد ۱ تا ۸	مرتبہ سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ	
مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خاں	سرسید بک ڈپو علیگڑھ	سنہ ۱۹۵۸ء

مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ وحید قریشی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ	سنہ ۱۹۷۷ء
مکاتیب سلیمان	مرتبہ مسعود عالم ندوی	مکتبۂ الشرق کراچی	سنہ ۱۹۵۴ء
مکاتیب شبلی جلد اوّل	مرتبہ سید سلیمان ندوی	دار المصنفین اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۱۶ء
مکاتیب شبلی جلد دوم	″	مطبع معارف اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۲۷ء
مکتوبات سلیمانی جلد اوّل	مرتبہ عبدالماجد دریابادی	صدق جدید ایجینسی لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۷ء
مکتوبات سلیمانی جلد دوم	″	″	سنہ ۱۹۶۸ء
موازنۂ انیس و دبیر	شبلی نعمانی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	سنہ ۱۹۶۲ء
موج کوثر	محمد اکرام	مکتبۂ اردو لاہور	سنہ ۱۹۵۴ء
مولانا ابوالکلام آزاد – الہلال کے آئینہ میں	ملک زادہ منظور احمد	مکتبۂ دین و ادب، لکھنؤ	سنہ ۱۹۷۲ء
نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۳۹ء
یاد رفتگان	سید سلیمان ندوی مرتبہ سید ابو عاصم	مکتبۂ الشرق کراچی	سنہ ۱۹۵۲ء

نوٹ: رسائل و اخبارات کی فہرست بہت طویل ہے، اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

ENGLISH

1. Bloomfied, Leonard "Language", London. Allen and Unwin 1935.
2. Utrecht, Spectrum "Linguistics Bibliography" P.I.C. OF LINGUISTICS 1952.
3. Grierson, G.A. "Linguistic Survey of India" V.IX Motilal, Delhi 1927.
4. Chatterji, Suniti Kumar - "Indo Aryan and Hindi Calcutta 1960.
5. Sapir, Edward "Langauge - An Introduction to the Study of Speech."
6. Lehmann, Winfred P. "Historical Linguistics: An Introduction." Oxford and IBH Publishing Co. Calcutta 1966.
7. Encyclopaedia Britennica V. III 1966 V. XIII 1966

صرف ٹائیٹل طباعت نیو کریسنٹ پرنٹرز ۳۳۳۰ حویلی اعظم خاں دہلی ۶